تصنیفِ لطیف

سیدّ الشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ

مِرآۃُ العارفین

(ترجمہ و شرح)

بحکم و اجازت

خادم سلطان الفقر سلطان محمد نجیب الرحمٰن مدظلہ الاقدس سروری قادری

مترجم و شارح

عنبرین مغیث سروری قادری

تصنیفِ لطیف

سیّد الشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ

مرآۃ العارفین
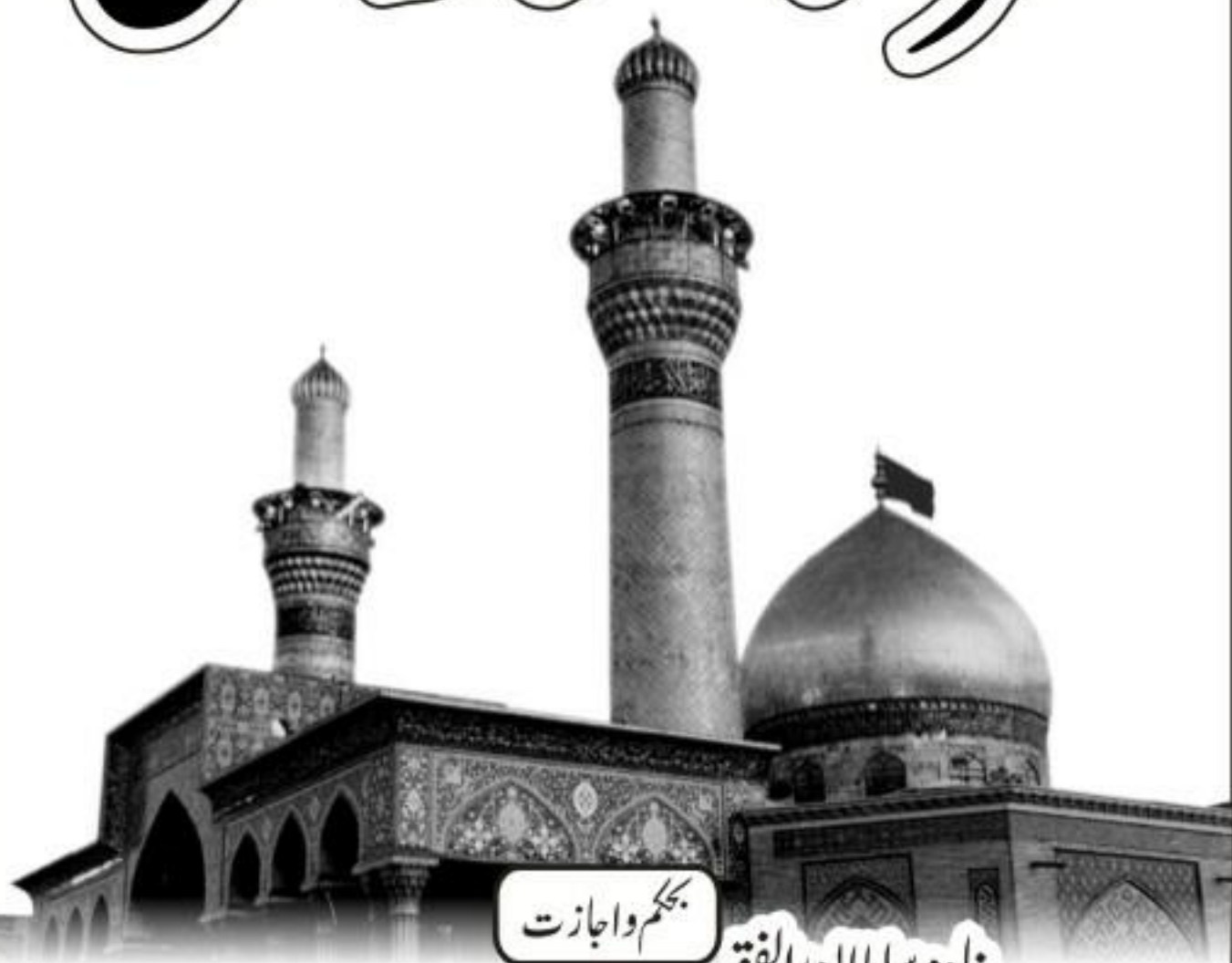
بحکم و اجازت

خادم سلطان الفقر

سلطان محمد نجیب الرحمٰن

سروری قادری مدظلہ الاقدس

مترجم و شارح: عنبرین مغیث سروری قادری

All Copy Rights reserved with
SULTAN-UL-FAQR PUBLICATIONS (Regd.)
Lahore-Pakistan

نام کتاب مرآۃ العارفین

تصنیفِ لطیف سیّد الشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ

مترجم و شارح عنبرین مغیث سروری قادری

ناشر محمد ناصر حمید سروری قادری

پرنٹر آر۔ٹی پرنٹرز لاہور

بارِ اوّل اگست 2012ء

تعداد 1000

ISBN: 978-969-9795-01-5

سُلطانُ الفقر پبلیکیشنز (رجسٹرڈ) لاہور

سُلطانُ الفقر ہاؤس

4/A-ایکسٹینشن ایجوکیشن ٹاؤن وحدت روڈ ڈاکخانہ منصورہ لاہور۔ پوسٹل کوڈ 54790

Ph: 042-35436600, 0322-4722766

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
انتساب
مرشد کامل اکمل جامع نور الہدیٰ
خادم سلطان الفقر
حضرت سخی
سلطان محمد نجیب الرحمٰن
سروری قادری مدظلہ الاقدس
کے نام
جن کی مہربانیوں کے بغیر اس عاجزہ
کی کوئی ظاہری و باطنی حیثیت نہیں ہے

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی تصنیف مرآۃ العارفین آپ رضی اللہ عنہ کے علم الکتاب کا اظہار ہے جس میں معرفتِ الٰہی کے ایسے ایسے اسرار و رموز بیان کیے گئے ہیں کہ جن کی تہہ تک پہنچنا طریقت و معرفت کے بڑے بڑے عالموں کے لیے بھی ممکن نہیں۔ صرف چند خواص ہی اس کے چند اسرار کو سمجھ پائے ہیں اور انہوں نے اسی کی بنیاد پر طریقت و تصوف کے موضوع پر قلم اٹھانے کی جرأت کی۔ علامہ ابنِ عربی رحمتہ اللہ علیہ کا نظریہ وحدت الوجود ہو یا سیّد ابراہیم الجیلی رحمتہ اللہ علیہ کا نظریہ انسانِ کامل سب ''مرآۃ العارفین'' سے ہی اخذ کیے گئے ہیں کیونکہ یہ تمام نظریات پہلی بار حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے ہی مرآۃ العارفین میں بیان کیے۔

مرآۃ العارفین، سورۃ فاتحہ جوام الکتاب اور تمام قرآن کریم کا خلاصہ ہے، کی جامع ترین تفسیر ہے جو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے حضرت امام زین العابدینؓ کے سورۃ فاتحہ کی شرح کے متعلق سوال کے جواب میں تحریر فرمائی۔

میرے مرشد کامل اکمل جامع نور الہدیٰ خادم سلطان الفقر سلطان محمد نجیب الرحمٰن مدظلہ الاقدس نے جب مجھے اس نایاب کتاب کی شرح کا حکم فرمایا تو اس کے لیے تین نسخہ جات عطا فرمائے۔ ایک نسخہ عربی متن اور اردو ترجمہ پر مشتمل ہے جس کو ملک چنن الدین خلف الرشید ملک فضل الدین تاجر قومی کتب نے اللہ والوں کی قومی دُکان (رجسٹرڈ) تعلیمی پریس لاہور سے شائع کیا۔ دوسرا نسخہ ''مرقاۃ السالکین''، عربی متن، اردو ترجمہ اور شیخ الحدیث محمد فیض احمد اویسیؒ کی کی گئی شرح پر مشتمل ہے اور تیسرا نسخہ ''کنز العارفین'' بھی عربی متن، اردو ترجمہ اور خادم حسین صوفی صاحب کی کی گئی شرح پر مشتمل ہے۔ ان تینوں نسخوں میں اصل عربی متن میں کہیں بھی کوئی تضاد نہیں بلکہ بالکل ایک جیسا

متن ہے البتہ ترجمہ اور شرح مترجم وشارح نے اپنی اپنی استعداد اور فہم وشعور کے مطابق کیا ہے۔

''مِرقاۃ السالکین'' کے مصنف کا اندازِ بیان انتہائی پیچیدہ اور عبارت بہت مشکل الفاظ پر مشتمل ہے جو عام قارئین کے لیے بالکل عام فہم نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تصوف کے حقائق عموماً عام لوگوں کے لیے عام فہم نہیں ہوتے اور اس کی اصطلاحات بھی پیچیدہ ہوتی ہیں۔ پھر بھی علمِ دین کو عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے مصنف کو حتیٰ الامکان کوشش کرنی چاہیے کہ آسان سے آسان زبان اور سادہ الفاظ میں بات کو بیان کرے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ فیض یاب ہوسکیں۔

دوسری شرح ''کنز العارفین'' میں مرآۃ العارفین کے کئی مقامات کی شرح یا تو کی ہی نہیں گئی یا ادھوری چھوڑ دی گئی ہے۔ اس کی زبان تو سادہ ہے لیکن بیان میں تشنگی سی محسوس ہوتی ہے اور قاری مرآۃ العارفین کی عبارت کا مطلب اور اس میں بیان کردہ حقیقت سمجھ نہیں پاتا۔

مرآۃ العارفین دینِ اسلام کی باطنی حقیقتوں کا خزانہ اور اسرارِ الٰہی سے نقاب کشائی کرنے والی تصنیف ہے۔ امتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا حق ہے کہ یہ خزانہ اس تک آسان سے آسان الفاظ میں پہنچایا جائے تاکہ دین کی حقیقت کی تلاش میں خلوصِ نیت سے سرگرداں لوگوں کی رہنمائی ہوسکے۔

مرشدِ کامل اکمل سلطان محمد نجیب الرحمٰن مدظلہ الاقدس کے حکم پر اس عاجزہ نے اس عظیم کتاب کی شرح وتفسیر کرنے کی جسارت کی اور ان ہی کی ظاہری وباطنی رہنمائی میں یہ اہم فریضہ سر انجام دیا۔ اس دوران اس بات کی حتیٰ الامکان کوشش کی کہ تصوف کی اصطلاحات پیچیدہ ہونے کے باوجود زبان آسان سے آسان استعمال کی جائے اور اندازِ بیان سادہ سے سادہ رکھا جائے اور ساتھ ہی اس بات کا خیال بھی رکھا جائے کہ اللہ کے ایسے راز جن کو عام لوگوں پر ظاہر کرنا روا نہیں، کیونکہ نہ وہ انہیں سمجھ سکتے ہیں نہ ہی ان کے متحمل ہوسکتے ہیں، کو ایسے انداز میں بیان کیا جائے کہ سمجھنے والے سمجھ بھی جائیں اور نہ سمجھنے والے پریشان بھی نہ ہوں اور الجھیں بھی نہ۔ اس کوشش میں کئی جگہ مجبوراً مشکل الفاظ کا سہارا لیا گیا ہے کہ ایسا کرنے میں ہی عام قلب وذہن رکھنے والے

قارئین کی بھلائی ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت کر دینا بھی ازحد ضروری ہے کہ یہ کتاب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے اعلیٰ ترین مقامِ ھاھویت اور اپنی عالیشان عقل وشعور کے مطابق لکھی ہے اور لکھی بھی صرف عارفین کے لیے ہے جو اس عالمِ ناسوت سے نکل کر عالمِ امر تک پہنچ کر دیدارِ الٰہی حاصل کر لیتے ہیں، جیسا کہ اس کے نام مرآۃ العارفین (عارفین کے لیے آئینہ) سے بھی ظاہر ہے۔ چنانچہ عالمِ ناسوت یعنی اس دنیا میں قید لوگ جنہوں نے اب تک قرب و دیدارِ الٰہی حاصل نہیں کیا، ان کے لیے اس کتاب کے ان مقامات کو سمجھنا تقریباً ناممکن ہے جہاں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ عالمِ امر کے حقائق یا وہاں عمل پذیر ہونے والے عوامل کی تفصیل بیان کر رہے ہیں کیونکہ جو مقام ان کے وہم و گمان سے بھی بالاتر ہے اس کی تفصیل کو وہ کیسے سمجھ سکتے ہیں خواہ اس کے بیان اور شرح کے لیے کتنی بھی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ اس عاجزہ نے ایسے ہی مقامات کو سمجھانے کے لیے جگہ جگہ مثالوں کا استعمال بھی کیا ہے اور ایک ہی بات کو بار بار دہرایا بھی ہے تاکہ کسی حد تک تو بات ذہن نشین کرائی جا سکے۔ لیکن یہ بات بھی انتہائی اہم ہے کہ تصوف اور طریقت کی کسی بھی کتاب حتیٰ کہ ایک جملے کو بھی مرشدِ کامل اکمل کی رہنمائی کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ جب تک مرشد کامل اپنی نگاہ سے قلب و دماغ میں بھرے فتور کو نکال کر باصفا نہیں بناتا حق کی کوئی بھی بات سمجھی نہیں جا سکتی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں مرشد کامل کو تلاش کر کے اس کی رہنمائی میں حق اور حقیقت کو سمجھنے کی توفیق دے اور اس عاجزہ کی اس کوشش کو قبول و منظور فرما کر امتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صراطِ مستقیم پر رہنمائی کا ذریعہ بنا دے۔ آمین

عنبرین مغیث سروری قادری

ایم۔اے۔ابلاغیات

(پنجاب یونیورسٹی)

''مرقاۃ السالکین'' کے آغاز میں ''مرآۃ العارفین'' پر حضرت علامہ محمد طارق محمود انچارج شعبہ اردو ماہنامہ ''دی اسلامک ٹائم'' مانچسٹر انگلینڈ کی ایک علمی تحقیق بھی پیش کی گئی ہے جس میں انہوں نے ''مرآۃ العارفین'' کے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی ہی تصنیفِ لطیف ہونے پر تحقیق و بحث کی ہے۔اس تحقیق کے لیے آپ نے مرآۃ العارفین کے جن نسخوں کو پیشِ نظر رکھا ان کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

1) 1012ھ بمطابق 1603ء میں لکھا گیا مکمل قلمی نسخہ حیدر آباد دکن کے قلمی سٹیٹ ارکائینوز سے حاصل کیا گیا۔

2) 1131ھ بمطابق 1718ء میں لکھا گیا مکمل قلمی نسخہ حیدر آباد کی سالار جنگ اورینٹل لائبریری سے حاصل کیا گیا۔

3) نصف بارھویں صدی کا نامکمل قلمی نسخہ حیدر آباد کی سالار جنگ لائبریری سے دستیاب ہوا۔

4) 1187ھ بمطابق 1773ء میں لکھا گیا مکمل قلمی نسخہ سالار جنگ لائبریری سے ہی دستیاب ہوا۔

5) سالار جنگ لائبریری حیدر آباد سے ہی اوائل تیرھویں صدی میں لکھا گیا ایک نسخہ اور آخیر بارھویں صدی میں لکھے گئے ایک نسخہ کا اقتباس مع فارسی ترجمہ موصول ہوا۔

6) 1305ھ بمطابق 1887ء میں لکھا گیا نسخہ مع اردو ترجمہ بھی سالار جنگ لائبریری حیدر آباد سے حاصل کیا گیا۔

7) 1983ء میں انگلینڈ سے مرآۃ العارفین کا انگریزی ترجمہ بمعہ متن پہلی بار شائع کیا گیا جس کے لیے بنیاد جرمنی کے مشہور مستشرق بروکلمان کا ترجمہ بنایا گیا جو اس نے 1807ء میں اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے لکھا۔

مخطوطہ نمبر 7 کے علاوہ مندرجہ بالا تمام نسخے مخطوطات کی شکل میں ہیں جن میں زیادہ تر پر مصنف کا نام درج نہیں ہے البتہ مخطوطہ نمبر 2 پر صدرالدین قونوی رحمتہ اللہ علیہ کا نام بطورِ مصنف درج ہے جو یقیناً غلط ہے کیونکہ مرآۃ العارفین کی کئی عبارات خود اس بات کی گواہ ہیں کہ یہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب حضرت امام زین العابدینؓ کے سوال کے جواب میں لکھی گئی لہٰذا حضرت امام حسینؓ کئی مقامات پر انہیں ان کے نام سے مخاطب فرما کر عبارت تحریر کرتے ہیں۔
اسی طرح ایک عبارت کی ابتدا یوں کرتے ہیں:
''قال ابی امیر المومنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ'' اور پھر آگے ان کے اشعار درج کرتے ہیں۔ ظاہر ہے حضرت علی رضی اللہ عنہٗ کے وہ بیٹے جن کے فرزند حضرت امام زین العابدینؓ ہیں، حضرت امام حسینؓ ہی ہیں اور یقیناً صدرالدین قونویؒ اپنے لیے ایسے الفاظ استعمال کرنے کی جسارت نہیں کر سکتے۔

مندرجہ بالا مخطوطات کی فہرست میں سے مخطوطہ نمبر 5 کے فارسی تبصرہ نگار جن کا اپنا نام مخطوطہ پر درج نہیں، مخطوطہ کے آخر میں لکھتے ہیں کہ ''بزرگانِ صاحبِ یقین کی فرمائش پر میں نے عربی رسالہ ''مرآۃ العارفین'' کی تشریح و تفصیل کرنے کی کوشش کی ہے جو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ کی تصنیف ہے''۔
اسی طرح مخطوطہ نمبر 6 کے اردو مترجم نے بھی اسے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ کی تصنیف قرار دیا ہے۔

انگریزی مترجم نے اسے مخطوطہ نمبر 2 کی پیروی میں صدرالدین قونویؒ کی تحریر قرار دیا ہے کیونکہ یقیناً اسے یہی نسخہ دستیاب ہوا ہوگا اور اس نے بغیر تحقیق کے اسے ان سے منسوب کر دیا۔
ان مخطوطوں کے علاوہ بھی بزرگانِ دین کی کتب میں ایسے اقوال موجود ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ

''مرآۃ العارفین'' حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی ہی تصنیف ہے۔ تفسیر ''برزخِ جامع'' کے مصنف اعلیٰ حضرت عطا محمد صاحب مرآۃ العارفین کو امام پاکؓ کی تصنیف مانتے ہوئے اسی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''سید الشہداء امام المفسرین، سید العارفین، سبطِ رسولِ رب العالمین حضرت امام عالی مقام جناب حسین رضی اللہ عنہ اپنے رسالہ متبرکہ مرآۃ العارفین میں حضرت انسانِ کامل صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حق اور خلق کے درمیان برزخِ جامع ثابت کرتے ہیں''۔

(تفسیر ''برزخِ جامع'' صفحہ 18)

''اسرار المقطعات'' کے مصنف اپنی تالیف میں جگہ جگہ مرآۃ العارفین کے حوالہ جات استعمال کرتے ہیں اور اسے ہر جگہ ان الفاظ میں حضرت امام حسینؓ سے منسوب کرتے ہیں ''مرآۃ العارفین جو حضرت امام حسینؓ کی تصنیف ہے''۔

اسی طرح قلندر پانی پتیؒ کے ملفوظات ''مرآۃ الوحدت'' میں بھی ''مرآۃ العارفین'' کے حوالے استعمال کئے گئے ہیں اور اسے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی تصنیف تسلیم کیا گیا ہے۔

☆☆☆☆☆☆
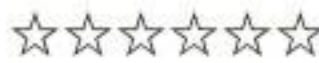
علامہ محمد طارق محمود کی ''مرآۃ العارفین'' کے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی ہی تصنیف ہونے پر طویل تحقیق اور بحث میں سے چند اہم نکات پیش کردیئے گئے ہیں اور طوالت کے خوف سے مکمل مقالہ دینے سے گریز کیا گیا ہے۔

مرآۃ العارفین کا انتہائی اعلیٰ اندازِ بیان اور ایک ایک لفظ میں معرفت کے سمندر سے بھی گہرے حقائق کا پوشیدہ ہونا خود اس بات کا گواہ ہے کہ یہ کسی انتہائی اعلیٰ ذہن وشعور اور قربِ حق کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز روحانی ہستی کی ہی تصنیف ہوسکتی ہے۔ کسی عام بلکہ خاص ذہن کی بھی ایسے اسرار تک رسائی ممکن نہیں۔ یہ تو خاصانِ خاصان کا کلام ہے اسے کسی دوسرے سے منسوب کرنا بالکل نامناسب ہے۔

تمام علمائے حق اور عارفین اس بات پر آغاز سے ہی متفق ہیں کہ یہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی

ہی تصنیف ہے اور اکثر اپنی کتب میں اس کے حوالے بھی استعمال فرماتے ہیں۔ البتہ حق سے دور بہت سے لوگ جن کا کام محض معرفت وطریقت سے متعلق ہر بات پر اعتراض کرنا ہے، بغیر کسی دلیل وثبوت کے اس کتاب پر اور اس کتاب کے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ کی تصنیف ہونے پر اعتراض کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو دلیل سے قائل کرنا بھی مشکل ہے کیونکہ وہ طے کر چکے ہوتے ہیں کہ جو وہ کہہ رہے ہیں وہی درست ہے اور دوسروں کی کسی بات کا اثر لینا یا اس کو ماننا ان کی انا کے خلاف ہے، اس لیے ایسے لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر اللہ سے ہی ان کی ہدایت کی دعا کی جا سکتی ہے۔

حق کے طالب اس کتاب کو اگر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ کی تصنیف مان کر پڑھیں گے تو ہی اس میں بیان کردہ حقائق پر یقین کر پائیں گے کہ انہوں نے جو لکھا وہ غلط ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ انہوں نے علمِ حق کے منبع نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے براہِ راست اکتسابِ فیض کیا۔ اللہ اس کتاب کے ذریعے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ کا پیغام حق کے طالبوں تک پہنچائے۔ (آمین)

عنبرین مغیث سروری قادری

ایم۔اے۔ابلاغیات

(پنجاب یونیورسٹی)

دینِ اسلام حقیقتِ الٰہیہ کا اظہار ہے۔ علمِ معرفتِ الٰہی اس حقیقت کی ظاہری صورت ہے۔ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام اس صورت کی ابتداء سے انتہا تک تکمیل کرنے والے اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ اس صورت کو حُسن بخشنے والے ہیں۔ ''علم'' اللہ کے نور کا اولین اظہار ہے جیسا کہ حضور غوث الاعظم رضی اللہ عنہٗ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے 'قلم' کو پیدا فرمایا'' کیونکہ قلم علم کو منتقل کرنے کا ذریعہ ہے اور قلم سے مراد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ذریعے علمِ الٰہی دنیا میں منتقل ہوا۔ جس طرح تمام علم ''قلم'' میں پنہاں ہوتا ہے اس طرح تمام علمِ الٰہی سینہ رُسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں پنہاں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا سینہ اس علم سے جگمگا رہا ہے اور ظاہری حیات میں بارہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے علمُ الغیب کی کرنیں اس مبارک سینہ سے چھن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مبارک زبان سے ظاہر ہوتی رہیں۔ باطنی حیات میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ذاتِ الٰہی یعنی 'فقر' کو بصورت علمِ الٰہی ہی اپنے خلفاء کو منتقل کرتے ہیں۔ کس خلیفہ کے قلب و باطن میں ذاتِ الٰہی کس حد تک ظاہر ہے اس کا اندازہ اس کے علم معرفتِ الٰہی سے ہی ہوتا ہے۔ جس پر علمِ معرفتِ الٰہی کی تکمیل ہوجائے وہی ذاتِ الٰہی کا اس دنیا میں مظہر اور فقر کا وارث ہے۔ چنانچہ فقر کے اولین وارث حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے علم کے متعلق فرمایا کہ ''میں علم کا شہر اور علی (کرم اللہ وجہہ) اس شہرِ علم کا دروازہ ہیں۔'' اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ ''مجھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حروف مقطعات حٰمٓ عٓسٓقٓ کی تفسیر میں، جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے، سب تعلیم کر دیا ہے۔'' علمِ معرفتِ الٰہی پر کامل عبور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی وجہِ عظمت بنا۔ جس پر علمِ الٰہی کی تکمیل ہوجائے اس سے دنیا بھر

کی کسی شے کا علم مخفی نہیں رہتا۔

علمِ الٰہی کی کوئی انتہا نہیں۔ اللہ قرآن کریم میں فرماتا ہے

عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ

ہمارے پاس (علمِ) غیب کے خزانے ہیں۔

يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ

جانتا ہے اللہ جو کچھ خشکی میں ہے اور جو تری (سمندروں، دریاؤں) میں ہے

وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا

(درخت سے) جب پتہ بھی ٹوٹ کر گرتا ہے اللہ اس کو بھی جانتا ہے۔

وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ

اور زمین کی تاریکیوں میں جو دانا چھپا ہوا ہے خدا اس کو بھی جانتا ہے۔

وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ

اور جتنا خشک و تر میں نے بنایا ہے یہ سب میں نے اپنی کتاب کے اندر رکھ دیا ہے۔

یعنی اللہ کا تمام علم ایک کتاب میں محفوظ ہے۔ یہ کتاب یقیناً سینۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کیونکہ اللہ خود فرماتا ہے کہ اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "کتاب" کا عالم نہیں بلکہ کتاب کا معلم بنا کر بھیجا۔ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ ترجمہ: "وہ دوسروں کو کتاب کا علم دیتا ہے۔" کتاب کا تمام علم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینہ مبارک میں محفوظ ہے تبھی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کتاب کے معلم بنے اور دوسروں کو اس کا علم عطا فرماتے ہیں۔ چنانچہ زمین و آسمان کی ہر شے کا علم، جس کے متعلق اللہ نے فرمایا کہ "ایک کتاب میں محفوظ ہے" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس موجود ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہی علمِ کتاب اپنے خلفاء کو منتقل فرماتے ہیں۔ اللہ کا زمین و آسمان کے ہر خشک و تر کا علم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے فقر کے وارثین کو منتقل ہوا۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم و فقر کے دو گواہ ہوئے۔ ایک خود اللہ تعالیٰ جس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ علم عطا فرمایا اور دوسرا وہ جس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ علم حاصل کیا۔ اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے:

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًاۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ (الرعد۔43)

ترجمہ: ''کہہ دیجیے اللہ کافی ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا گواہ ہمارے اورتمہارے درمیان اور وہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔'' یعنی اللہ اوراس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سوا بھی کوئی ہے جس کے پاس کتاب کا یعنی زمین وآسمان کے تمام خشک وتر کا علم موجود ہے۔ اگرچہ علمِ الٰہی لامحدود ہے اور کتاب علم کی ایک محدود صورت ہے۔ علمِ الٰہی کو ''کتاب'' کا نام دینے کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ جس کو یہ کتاب منتقل ہوتی ہے اس کو کامل علمِ الٰہی منتقل ہوتا ہے۔ علم الکتاب رکھنے والا کتاب کا آدھا یا چوتھائی یا تین چوتھائی علم نہیں رکھتا بلکہ پوری کتاب کا علم رکھتا ہے۔ اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ 'اگر میرے لیے مسند بچھائی جائے اور میں اس پر بیٹھوں تو اہلِ توریت کے لیے توریت سے' اہل انجیل کے لیے انجیل سے اور اہلِ زبور کے لیے ان کی زبور سے اور اہلِ قرآن کے لیے ان کے قرآن سے حکم کروں۔''

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے معنی ''تعریف کیا گیا'' ہیں۔ علمِ الٰہی جب محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں ظاہر ہوا تو اس کی تعریف یعنی defination اور بنیاد مکمل ہوئی۔ ''علی'' (کرم اللہ وجہہ الکریم) اللہ کے نام ''اعلیٰ'' سے ہے جس کے معنی بلندی کی طرف مائل ہونے والا کے ہیں۔ علمِ الٰہی جب حضرت علی رضی اللہ عنہ میں منتقل ہوا تو بلندی کی طرف بڑھا اور عروج حاصل کیا۔ حسین ''حسنیٰ'' سے مشتق ہے جس کے معنی بہترین اور خوبصورت ترین کے ہیں۔ علمِ الٰہی جب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ تک پہنچا تو اسے حسن و نکھار اور بہترین صورت عطا ہوئی۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ عِنْدِنَا عِلْمُ الْكِتَابِ ہمارے سینے میں علم الکتاب یعنی زمین وآسمان کے کل خشک وتر اور اللہ تعالیٰ کا علم محفوظ ہے۔ یہ علم قلمِ الٰہی یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے توسط سے پیدائش کے وقت سے ہی آپ رضی اللہ عنہ کو منتقل ہونا شروع ہوگیا۔ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آپ رضی اللہ عنہ کو گود مبارک میں لے کر آپ رضی اللہ عنہ کے دہن میں اپنی زبان

مبارک ڈالی اور آپ رضی اللہ عنہ نے اسے خوب چوسا اسی وقت اس بات کا فیصلہ ہوگیا کہ آپ رضی اللہ عنہ زندگی بھر جو بھی فرمائیں گے اس میں اسی مبارک زبان کا اثر پایا جائے گا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے علم الکتاب کا اظہار ایک روایت سے ہوتا ہے کہ ایک بار دورانِ وعظ حاضرین کے سامنے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ بتاؤ اس مہینے کے کتنے دن گزر چکے ہیں؟ آپ رضی اللہ عنہ نے اس کا جواب بتا دیا۔ پھر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اس مہینے کے کتنے دن باقی رہ گئے ہیں؟ آپ رضی اللہ عنہ نے بآسانی اس کا جواب بتا دیا۔ اس بات کا جواب دینا کہ مہینے کے کتنے دن گزر چکے ہیں تو آسان ہے کیونکہ یہ بات ظاہر ہو چکی ہے لیکن کتنے دن رہ گئے یہ بتانا مشکل ہے۔ اگر اس مہینے 28 کا چاند ہو تو باقی بچے دنوں کی تعداد کم ہوگی اور 29 کا چاند ہوگا تو باقی بچے دنوں کی تعداد ایک زیادہ ہوگی۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے اس سوال کا صحیح جواب دینے سے ثابت ہوگیا کہ آپ رضی اللہ عنہ نہ صرف وہ جانتے تھے جو ہو چکا ہے بلکہ وہ بھی جانتے تھے جو ہونے والا ہے اور یہی عظمت ہے صاحبِ کتاب کی۔

کتاب کا جو علم آپ رضی اللہ عنہ کو آقا پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام، حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے ساتھ ساتھ مادرِ عظیم سلطان الفقر حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وساطت سے پنگھوڑے میں ہی حاصل ہونا شروع ہوگیا تھا، عالمِ شباب میں اپنے عروج کو پہنچا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اسے باطنی طور پر طالبانِ مولیٰ کو منتقل کرنے کے ساتھ ساتھ ظاہری طور پر وعظ و نصیحت کے ذریعے بھی امت کو منتقل کرنا شروع کیا۔ بڑے بڑے عالم و فاضل آپ رضی اللہ عنہ کی محافل سے فیض یاب ہوتے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ہی علمِ معرفتِ الٰہی کو پہلی بار تحریر کی شکل دی اور اپنی اس تصنیف ''مرآۃ العارفین'' کے ذریعے علمِ معرفت اور اسرارِ الٰہیہ کو قیامت تک محفوظ بنا دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی تصنیف ''مرآۃ العارفین'' طالبانِ حقیقت پر ایک عظیم احسان ہے جو راہِ حق پر ان کی رہنما ہے۔

عنبرین مغیث سروری قادری

ایم۔اے۔ ابلاغیات (پنجاب)

شرح مرآۃ العارفین

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَخْرَجَ مِنَ النُّوْنِ مَآ اَدْرَجَ فِی الْقَلَمِ وَ اَبْرَزَ اِلَی الْوُجُوْدِ بِالْجُوْدِ مَآ اَکْنَزَ فِی الْعَدَمِ وَفَتَقَ مَا رَتَقَ وَاَظْهَرَ مَا کَتَمَ۔

ترجمہ: سب حمد واسطے اللہ کے ہے جس نے ظاہر کیا دوات سے اُس چیز کو جس کو درج کیا تھا قلم میں اور ظاہر کیا وجود کی طرف ساتھ جود وسخا کے اس چیز کو جس کو پوشیدہ کیا تھا عدم میں۔ اور پھاڑ ڈالا اس چیز کو جس کو جوڑا تھا اور ظاہر کیا اس چیز کو جس کو پوشیدہ کیا تھا۔

شرح: یہ عبارت نظریہ وحدت الوجود کی ابتداء ہے۔ الحمدللہ "سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے"۔ ہر شے کا وجود اللہ سے ہے اور اللہ ہی کی بدولت ہے اس لیے ہر شے کی تعریف اللہ ہی کی تعریف ہے۔ اگر تمام کائنات کے وجود کو ایک کتاب کی صورت سمجھا جائے اور ہر عالم کی ہر شے کو اس کتاب کا ایک ایک حرف تو ان حروف کا وجود ایک ہی دوات (سیاہی) سے ہے لیکن سیاہی سے یہ تمام حروف بغیر قلم کے نہ لکھے جاسکتے تھے۔ یہاں دوات سے مراد ذاتِ حق تعالیٰ اور قلم سے مراد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مبارکہ ہیں۔ تمام مخلوق ذاتِ حق تعالیٰ میں اسی طرح پوشیدہ تھی جس طرح کتاب کے تمام الفاظ دوات میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ قلم ہی ان پوشیدہ الفاظ کو ظاہر کرنے کا سبب بنتا ہے۔ جس طرح الفاظ دوات کی سیاہی میں پوشیدہ ہیں اسی طرح جب سیاہی قلم میں منتقل ہوئی تو یہی الفاظ قلم میں پوشیدہ ہو گئے، اس لیے کہا "ظاہر کیا دوات سے اس چیز کو جس کو درج کیا تھا قلم میں۔" قلم کے الفاظ دوات کی بدولت ظاہر ہوئے اور دوات کے الفاظ قلم کی بدولت یعنی وجود کی کتاب قلم و دوات دونوں کے بغیر لکھی جانی ناممکن تھی۔ یہاں حضور علیہ الصلوٰۃ

والسلام کی اس حدیث کی تشریح بھی ہو جاتی ہے کہ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ قَلَمَ ترجمہ: ''اللہ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا۔'' یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پیدا فرمایا تاکہ دوات میں پنہاں حروف کو اس کے ذریعے ظاہر کیا جا سکے اور اس حدیث کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ اَنَا مِنْ نُوْرِ اللّٰہِ تَعَالٰی وَ کُلُّ خَلَائِقِ مِنْ نُوْرِیْ ترجمہ: ''میں اللہ کے نور سے ہوں اور تمام مخلوق میرے نور سے ہے۔'' یہاں ایک سوال ذہنوں میں اٹھتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ ہی کے نور ہیں تو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے دونوں کو ایک ہی حقیقت رکھنے کے باوجود علیحدہ علیحدہ القاب سے کیوں پکارا۔ اس میں یہ رمز پوشیدہ نظر آتی ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ دونوں کی علیحدہ علیحدہ اپنی اپنی مُسلّم اہمیت کو ظاہر کرنا چاہتے تھے حالانکہ دونوں کا وجود ایک ہی ہے۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نہ ہوں تو اللہ اپنا ہونا ظاہر نہ کرے جیسا کہ اس نے فرمایا ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اگر آپ نہ ہوتے تو میں اپنا رب ہونا ظاہر نہ کرتا'' اور اگر اللہ نہ ہوتا تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نہ ہوتے یعنی اگر یہ دونوں نہ ہوں تو کچھ بھی نہ ہو۔ وجود ایک ہی ہونے کے باوجود دونوں کی علیحدہ اہمیت اجاگر کرنے کے لیے دونوں کو علیحدہ ناموں سے موسوم کیا۔

''عدم'' سے مراد کسی شے کے وجود کا نہ ہونا ہے۔ تمام مخلوق اپنا وجود حاصل کرنے سے پہلے ''عدم'' میں پوشیدہ تھی۔ عدم وہ مقام ہے جہاں ذاتِ حق تعالیٰ کے سوا کچھ موجود نہ تھا۔ اس مقام میں مخلوق کے پوشیدہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس وقت مخلوق ذاتِ حق تعالیٰ میں اس طرح موجود تھی جس طرح کسی عمارت کا نقشہ کسی انجینئر کے ذہن میں اس عمارت کے وجود میں آنے سے پہلے موجود ہوتا ہے۔ کوئی بھی شے جسے انسان بنانا چاہتا ہے، اپنا ظاہری وجود حاصل کرنے سے پہلے خیالی صورت میں انسانی ذہن میں ابھرتی ہے اور پھر وہ خیالی صورت ہی وجود پا کر ظاہر ہو جاتی ہے۔ حضرت امام حسینؓ فرماتے ہیں ''اور ظاہر کیا وجود کی طرف ساتھ ''جود'' کے اس چیز کو جس کو پوشیدہ کیا تھا عدم میں۔'' ''جود'' اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کہ وہ ''جواد'' ہے۔ جواد وہ ہے جو بن مانگے عطا کرے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ''جود'' سے اشیاء کو ''وجود'' عطا فرمایا۔ اشیاء کو وجود عطا فرما کر

اللہ نے ان پر احسان فرمایا کہ انہیں اس دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع عطا فرمایا۔ اور اپنے محبوب ﷺ کو تخلیق کرکے اس کی صورت میں خود ظاہر ہو کر تمام مخلوق کے لیے رحمت و بخشش کا سبب بنایا۔ وجودِ اشیاء و مخلوقاتِ عالم پر اس کا ''جود'' اس کی رحمت کی صورت میں اور رحمت کے سبب سے ظاہر ہوا اور رحمتِ عالم خود آقا پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مبارکہ ہے۔ چنانچہ یہ کہنا کہ ''ظاہر کیا وجود کی طرف ساتھ اپنے ''جود'' کے اس چیز کو پوشیدہ کیا تھا جس کو عدم میں'' دوبارہ یہی معنی دیتا ہے کہ اللہ نے اپنے جود یعنی اپنی رحمت یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سبب سے عدم میں پوشیدہ مخلوق کو وجود بخشا۔

''اور پھاڑ ڈالا اس چیز کو جس کو جوڑا تھا اور ظاہر کیا اس چیز کو جس کو پوشیدہ کیا تھا۔'' عمارت کا نقشہ اور پورا وجود جب انجینئر کے ذہن میں ہوتا ہے تو مکمل اور جامع صورت میں ہوتا ہے لیکن جب ظاہر ہونے لگتا ہے تو ایک ایک اینٹ کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح دوات میں تو حروف ایک ہی جامع صورت میں جڑے ہوئے موجود ہوتے ہیں لیکن جب کتاب پر بکھرتے ہیں تو ایک ایک حرف کی صورت ظاہر ہوتے ہیں۔ یعنی یوں کہا جا سکتا ہے کہ سیاہی میں جڑی ہوئی صورت میں موجود حروف کو کتاب پر منتقل ہونے کے لیے علیحدہ ہونا پڑا، پھٹنا پڑا۔ چنانچہ مخلوق کا وجود جسے اللہ تعالیٰ نے عدم میں اپنے اندر جوڑا تھا' تیار کیا تھا اسے دنیا میں پھاڑ کر علیحدہ علیحدہ ظاہر کردیا۔ سورۃ یونس کی آیت بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (یونس۔19)

ترجمہ: اور تمام لوگ ایک ہی قوم (وحدت) تھے پھر مختلف (علیحدہ) ہوئے'' یعنی تمام مخلوق پہلے وحدت (one unit) کی صورت تھی اور پھر علیحدہ علیحدہ ظاہر ہوئی۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اسی عبارت میں دوبارہ فرماتے ہیں کہ ''ظاہر کیا اس چیز کو جس کو پوشیدہ کیا تھا'' یہاں اس پوشیدہ چیز سے مراد خزانہ حق ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق فرمایا کہ كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا فَاَرَدْتُّ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ ''میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے

چاہا کہ میں پہچانا جاؤں پس میں نے مخلوق کو تخلیق کیا۔‘‘ ذاتِ باری تعالیٰ جو خزانے کی صورت پوشیدہ تھی مخلوق کی صورت ظاہر ہوئی۔ اللہ نے اپنی رحمت اور اپنے ’’جود‘‘ کے سبب اپنے نور کے خزانے کو مخلوق کی صورت ڈھال دیا اور اس طرح بھی ایک جامع، مکمل شے (خزانے) کو پھاڑ کر علیحدہ علیحدہ مختلف صورتوں میں ظاہر کیا۔ جڑی ہوئی چیز کو پھاڑ ڈالنے سے مراد ذاتِ حق تعالیٰ کا وحدت سے کثرت کی طرف آنا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

وَ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ الْمُلَقَّبِ بِاُمِّ الْكِتَابِ وَاللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ الْمُسَمّٰى بِالْكِتَابِ الْمُبِيْنَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۔ وَفَصَّلَ وَقَدَّرَ فِي النَّفْسِ مَا فِي الْعَقْلِ اَجْمَلِ وَقَضٰى وَ حَكَمَ وَاَخْرَجَ اللَّوْحَ بِيَمِيْنِهٖ مِنْ يَّسَارِهٖ كَمَا اَخْرَجَ حَوَّا عليها السلام مِنْ جَنْبِ اٰدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ ۔

ترجمہ: اور سکھلایا تھا قلم کو جس کا لقب اُم الکتاب ہے اور لوحِ محفوظ کہ جس کا نام کتابِ مبین ہے وہ چیز کہ قلم نہ جانتا تھا اور تفصیل اور اندازہ کیا نفس میں اُس چیز کا جس کا عقل میں اجمال اور فیصلہ اور حکم کیا تھا اور نکالا لوح کو ساتھ اپنے دائیں ہاتھ کے بائیں میں سے جیسا کہ نکالا حوا کو آدم علیہ السلام کی پسلی سے۔

شرح: جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف اپنی پہلی وحی سورۃ العلق میں فرمایا کہ اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ O عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ O (سورۃ العلق۔ 4،5) ترجمہ: ’’(اللہ نے) قلم کے ذریعے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا‘‘ یہاں بھی قلم سے مراد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مبارک ذات ہے جس کے ذریعے تمام انسانوں کو علمِ الٰہی، علمِ دین اور علمِ کائنات عطا کیا گیا۔ یہ علم پہلے اللہ نے قلم یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مبارک ذات کو سکھایا اور پھر اس ’قلم‘ نے تمام عالم کو سکھایا۔ اس لیے یہ ’قلم‘ یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اُم

الکتاب ہے جس کے بطن میں تمام علم جمع ہے اور جہاں سے تمام عالم کو منتقل ہوتا ہے جیسا کہ ''اُم'' یعنی ماں بچے کو اپنے بطن میں رکھتی ہے اور پھر اسے عالمِ ارواح سے عالمِ دنیا میں منتقل کرتی ہے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم 'قلم' یا ام الکتاب ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی روحِ قدسی یا مبارک سینہ یا قلب کتابِ مبین یعنی روشن اور کھلی ہوئی کتاب یا لوحِ محفوظ ہے جس پر تمام علمِ الٰہی اور علمِ دین اور علمِ کائنات تفصیل سے درج ہے۔ جس طرح قلم سے علم کو لوح یعنی تختی پر منتقل کیا جاتا ہے اسی طرح یہ علم آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نورانی وجود یعنی 'قلم' سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قلب مبارک پر درج کیا گیا۔ قلم میں یہ ''اجمال'' کی حالت میں تھا۔ ''اجمال'' سے مراد کسی شے کی مختصر ترین لیکن جامع اور مکمل صورت ہے جیسا کہ بیج درخت کی مختصر لیکن جامع صورت ہے۔ قلم میں جو علم ''اجمال'' کی حالت میں تھا روحِ قدسی میں تفصیل کی صورت میں منتقل ہوا۔ روحِ قدسی سے پھر یہ قلب اور پھر ''نفس'' پر منتقل ہوا جہاں اسے مزید تفصیل حاصل ہوئی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے وجود سے ہی حضرت حوّا کو وجود عطا کیا اسی طرح ''قلم'' کے وجود سے ہی ''لوح'' کو وجود عطا کیا یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نور سے ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی روحِ قدسی اور قلب مبارک کو وجود عطا کیا اور پھر اسی قلب سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نفس کو وجود عطا کیا اور یہی ترکیب تمام انسانوں کے وجود کے لیے ہے کہ اللہ نے اپنے نور سے نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تخلیق کیا، اسی سے روحِ قدسی کو، اس سے قلب کو، قلب سے روحِ انسانی کو، روحِ انسانی سے نفس کو، اور پھر انسانی جسم میں ان کو پوشیدہ کر کے انسان کی تخلیق مکمل کی۔

☆☆☆☆☆☆

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَ تَقَدَّسَ اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّهِىَ الْعَقْلُ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَهِىَ النَّفْسُ وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا

كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَّهِيَ الْعُقُوْلُ وَالنُّفُوْسُ.

ترجمہ: جیسا کہ فرمایا اللہ بلند اور پاک نے کہ اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا تم کو ایک نفس سے اور وہ عقل ہے اور پیدا کیا اُس سے اُس کی بیوی کو اور وہ نفس ہے اور پھیلایا ان دونوں سے مردوں بہتوں کو اور عورتوں کو اور وہ عقول اور نفوس ہیں۔

شرح: جس طرح انسان کے ظاہری جسم کے مختلف اعضاء ہیں اسی طرح انسان کا باطنی وجود بھی نور، روحِ قدسی، قلب، روحِ انسانی اور نفس پر مشتمل ہے۔ انسانی باطن میں قلب اللہ کا گھر ہے یعنی اللہ سے جڑا ہے جیسا کہ حدیثِ قدسی میں بھی بیان کیا گیا کہ ''قلب المومن عرش اللّٰہ تعالٰی'' مومن کا قلب اللہ کا عرش ہے اور نفس دنیا سے جڑا ہے۔ روحِ انسانی جو ان دونوں کے درمیان ہے، اگر پاک و نیک ہے تو اللہ کی طرف مائل ہے، اگر بد ہے تو نفس و دنیا کی طرف مائل ہے۔ ان تینوں کی اصل تو نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی ہے کیونکہ یہ اسی سے تخلیق ہوئے لیکن نفس دنیا اور خواہشاتِ دنیا میں الجھ کر جب گناہوں سے آلودہ ہو جاتا ہے تو اس کی نورانیت ماند پڑ جاتی ہے اور اس پر سیاہی چھانے لگتی ہے جس کا اثر روحِ انسانی اور قلب پر بھی پڑتا ہے۔ اسی نفس کی سیاہی کی وجہ سے انسان اپنے باطن میں موجود ذاتِ حق تعالیٰ اور نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بالکل بے خبر ہو جاتا ہے البتہ صدقِ دل سے اللہ کے قرب کی تمنا کرنے والوں اور اس تمنا کی خاطر نیک اعمال کرنے والوں کا نفس گناہوں سے گریز کرنے اور توبہ کے آنسو بہانے کے باعث صاف اور شفاف ہونے لگتا ہے حتیٰ کہ اپنی نورانیت یعنی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو واپس حاصل کر لیتا ہے۔

نفسِ انسانی کی نورانیت اور پاکیزگی کے حساب سے چار حالتیں ہیں امارہ، لوامہ، ملہمہ اور مطمئنہ۔ نفسِ امارہ گناہ کا حکم دیتا ہے، نفسِ لوامہ گناہ پر انسان کو ملامت کرتا ہے، نفسِ ملہمہ گناہ کے ارتکاب سے پہلے اہلِ نفس کو بذریعہ الہام خوفِ خدا یاد کرا کے گناہ سے روک دیتا ہے اور نفس

مطمئنہ سب سے اعلیٰ وارفع مقام ہے جہاں انسان گناہ کی طرف مائل ہی نہیں ہوتا اور ہمیشہ اپنے ربّ کی بارگاہ میں حاضر اور اس کی رضا میں راضی رہتا ہے۔ نفس اور عقل کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ نفس کی پاکیزگی میں ترقی کے ساتھ ساتھ عقل بھی پاکیزہ ہوتی اور ترقی کرتی ہے اور نفس کی تنزلی کے ساتھ عقل بھی پستی کی جانب مائل ہوتی ہے۔ کائنات کا سب سے بہترین نفس اور عقل آقا پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہے اور ہر انسان کو عقل و نفس کا جو بھی حصہ ملا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملا کیونکہ کائنات کی ہر شے کا وجود آپ ﷺ کی ذات سے ہی ہے۔ مندرجہ بالا عبارت میں ''نفس'' کا تذکرہ دوبار آیا ہے۔ پہلے فرمایا ''اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا تم کو ایک نفس سے اور وہ عقل ہے'' یہاں نفس اور عقل دونوں سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نفس اور ان کی عقل مراد ہے کیونکہ ان کا نفس تمام نورِ الٰہی ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ اتنا ہی پاک، اتنا ہی خالص، اتنا ہی قوت والا اور اسی سے تمام مخلوق کو وجود ملا اور ان کی عقل، عقلِ کُل ہے جس سے تمام مخلوق کو اس کی عقل کا حصہ عطا ہوا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نفس ہی ان کی عقل اور ان کی عقل ہی ان کا نفس ہے کیونکہ ان کا مقام وحدت، واحدانیت بلکہ اس سے بھی آگے ہے جہاں ابھی نفس اور عقل علیحدہ نہیں ہوئے بلکہ ایک ہی نورانی حالت میں ہیں۔ نفس اور عقل علیحدہ تب سمجھے جاتے ہیں جب عقل کچھ اور کہے اور نفس کچھ اور جیسا کہ عام انسانوں میں ہوتا ہے جبکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نفس اور عقل ''کُل'' کی صورت میں اکٹھے ہیں۔ اس لیے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''پیدا کیا تم کو ایک نفس سے اور وہ عقل ہے'' یعنی اس مقام پر نفس ہی عقل ہے اور یہ مقامِ وحدت کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔

اور دوسری بار فرمایا ''اور پیدا کیا اس سے اُس کی بیوی کو اور وہ نفس ہے۔'' یہاں عام لوگوں کا نفس مراد ہے جو امارہ، لوامہ یا ملہمہ ہو سکتا ہے یعنی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مخلوق کی طرف نزول کی بات کی گئی ہے۔ جو نفس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام میں مطمئنہ تھا وہ مخلوق میں نزول کے بعد ملہمہ سے لوامہ اور پھر لوامہ سے امارہ ہو گیا۔ یہی نفس اگر واپس ترقی کر کے امارہ سے لوامہ،

لوامہ سے ملہمہ اور ملہمہ سے مطمئنہ ہو جائے تو یہی عروجِ آدم اور اس کی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک یعنی اپنی ابتداء اور اپنی حقیقت اور اصل وجود تک رسائی ہے۔

عبارت کے پہلے حصے میں نفس کو ہی عقل قرار دینا وحدت یعنی نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے حصے میں نفس اور عقل کو ایک دوسرے سے جدا قرار دینا وحدت کا کثرت یعنی مخلوق کی طرف نزول ہے۔

اس عبارت میں عقل کو مرد اور نفس کو عورت سے تشبیہ دی ہے کیونکہ عقل عموماً نفس سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے لیکن نفس زیادہ چالباز ہے اور مکر وفریب سے عقل کو اپنے دام میں الجھا لیتا ہے' اس کی بہترین مثال ہمیں حضرت آدمؑ وحواؑ کے واقعہ سے ملتی ہے۔ حضرت حواؑ حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے نکلی تھیں جیسا کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ فرما رہے ہیں کہ ''اور وہ عقل ہے اور اس سے پیدا کیا اس کی بیوی کو جو نفس ہے۔'' حضرت حواؑ نے ''نفس'' کا کردار ادا کرتے ہوئے حضرت آدم علیہ السلام کو دانۂ گندم کھانے پر اکسایا جس سے اللہ تعالیٰ نے انہیں سختی سے منع فرمایا تھا۔ چنانچہ جو بات اللہ عقل میں ڈالتا ہے اگرچہ وہ مرد کی طرح زیادہ طاقتور ہوتی ہے لیکن نفس اپنی چالبازی سے انسان کو ہمیشہ اس کے خلاف کرنے پر مائل کر ہی لیتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی عقل سے ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اللہ نے کس چیز سے منع کیا اور کس چیز کا حکم دیا لیکن اپنے نفس کے حیلوں کے آگے ہماری عقل بھی مجبور ہو جاتی ہے اور جانتے بوجھتے گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ نفس کو ''بیوی'' سے تشبیہ دینے میں ایک اور حکمت یہ پوشیدہ ہے کہ بیوی اگر نیک، عقلمند اور پاکباز ہے تو مرد کی ترقی کا باعث ہے اور اگر بدکردار یا بے وقوف ہے تو مرد کی تباہی کا باعث ہے۔ اسی طرح نفس اگر امارہ ہے تو عقل کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے اور انسان ایسے غلط فیصلے کرتا ہے جو اسے اور اس سے جڑے تمام لوگوں کو بربادی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اور اگر نفس ملہمہ یا مطمئنہ ہے تو عقل کو شیشے کی طرح چمکا دیتا ہے حتیٰ کہ کائنات کی ہر حقیقت اس میں واضح دکھائی دیتی ہے جیسا کہ حدیث پاک میں کہا گیا کہ ''مومن کی ''فراست'' سے ڈرو وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔'' یہاں فراست تو

عقل ہے اور اللہ کا نور اس کا نفسِ مطمئنہ ہے کیونکہ مطمئنہ کے مقام پر نفس مکمل نورانی صورت اختیار کر لیتا ہے جو اس کی فراست کو اور قوت عطا کرتا ہے۔

بشر خیر اور شر کی مباشرت[1] سے پیدا ہوا۔ مندرجہ بالا عبارت کے دوسرے حصے میں خیر کا نمونہ (Symbol) عقل ہے جس کو بُرے بھلے کی تمیز ہے اور شر کا نمونہ (Symbol) نفس ہے جو گناہ کے ارتکاب میں لذت پاتا ہے۔ انہی دونوں کی مباشرت سے انسان تخلیق ہوا جیسا کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''ان دونوں سے پھیلایا مردوں بہتوں کو اور عورتوں کو اور وہ عقول اور نفوس ہیں۔'' یعنی دنیا میں جو بھی کثرت اور رنگا رنگی نظر آتی ہے وہ عقلوں اور نفسوں کی بدولت ہے۔ اگر جسموں کے عارضی لباسوں سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو عقل اور نفس ہی ایک انسان کو دوسرے انسان سے ممتاز کرتے ہیں اور یہی دونوں اجزاء ان کی دنیا اور آخرت میں ترقی یا تنزلی کا باعث اور ان کے دنیا و آخرت میں مقام کا تعین کرنے والے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

فَفَتَحَ بِالْهَبَآءِ الْمَوْسُوْمِ بِالْهَيُوْلٰى وَالْعَنْقَا صُوْرَةَ الْعَالَمِ وَفَتَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنَ الرَّتْقِ الْمُكَنّٰى بِالْعُنْصَرِ الْاَعْظَمِ۔

ترجمہ: پس کھولا غبار سے، کہ جس کا نام ہیولےٰ ہے اور وہ عنقا (غائب) ہے، صورتِ عالم کو اور پھاڑا آسمانوں اور زمین کو جڑی ہوئی چیز سے جس کی کنیت عنصرِ اعظم ہے۔

شرح: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ مخلوقات کی تخلیق میں انسانی قلب، روح، نفس اور عقل کی تخلیق کے مختصراً ذکر کے بعد زمینوں اور آسمانوں کی تخلیق کا تذکرہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جس طرح انسانی ارواح ایک ہی جوہر یعنی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تخلیق ہوئیں اسی طرح تمام عالم زمین و آسمان بھی ایک ہی وحدت سے پھٹ کر یا علیحدہ علیحدہ ہو کر کثرت کی صورت ظاہر ہوئے اور ان کا عنصر

---

[1] ملاپ

بھی وہی عظیم عنصر یعنی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے۔ قرآن کی آیات بھی اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ زمین وآسمان پہلے ملے ہوئے تھے پھر اللہ نے انہیں جدا کیا:

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا ط (الانبیآء۔30)

ترجمہ: کیا کفر وانکار کرنے والوں نے کبھی غور نہیں کیا کہ زمین وآسمان آپس میں ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انہیں الگ الگ کر دیا۔

اور یہ زمین وآسمان اپنی تخلیق سے پہلے دُھویں کی صورت میں ملے ہوئے تھے جیسا کہ اللہ فرماتا ہے:

ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ وَھِیَ دُخَانٌ (سورہ حم سجدہ:11)

ترجمہ: پھر اس (اللہ) نے آسمانوں کو قائم کیا جو (پہلے) دھواں تھا۔

''دخان'' سے مراد دھواں ہے۔ حضرت امام حسین اسی دھویں کو ھَبَـــآءِ یعنی ''غبار'' کا نام دے رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ اس کا نام ہیولٰے[1] ہے اور وہ عنقا[2] ہے۔ ہیولٰے اصل وجود نہیں بلکہ وجود کے سائے کو کہتے ہیں۔ مراد یہ کہ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم صرف 'انسان' کے وجود میں اپنی اصل اور کامل صورت میں موجود ہے جس کی بنا پر وہ تمام مخلوقات سے اشرف ہے جبکہ باقی تمام تخلیقات کو وجود تو نورِ محمدی کی ہی بدولت ملا لیکن وہ اصل نورِ محمدی کی بجائے اس کے ہیولٰے سے تخلیق ہوئیں۔ عنقا کے معنی غائب ہونے کے ہیں۔ جب نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے زمین وآسمان تخلیق ہوئے تو یہ ہیولٰے عنقا یعنی ان مخلوقات میں گم یا غائب ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ ظاہری حیات میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سایہ یا ہیولٰے نہ تھا۔ مخلوقات کے مادی وجود جب ظاہر ہوئے تو یہ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان ظاہری وجودوں کے پردوں میں چھپ گیا یا غائب ہوگیا۔ جسم کی ظاہری آنکھوں سے اسے پوشیدہ کر دیا گیا البتہ باطنی یعنی روح کی آنکھوں سے دیکھنے والے کائنات کے ذرے ذرے کے اندر اس نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دیکھتے ہیں۔ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تمام مومنین میں پوشیدہ ہے اور تمام عالم نورِ

---

[1] سایہ [2] غائب

محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ہیولےٰ ہے۔ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نہ ہوتو اس کا ہیولےٰ یعنی یہ عالم بھی نہ ہو۔

آج سائنس نے بھی یہ بات ثابت کر دی ہے کہ تمام عالم وجود میں آنے سے پہلے ایک نیبولا یعنی گیس اور غبار کی شکل میں تھا جس کا درجۂ حرارت انتہائی بلند تھا اور جو بے انتہا توانائی پر مشتمل روشنی کے پیکٹ فوٹون (Photons) تھے۔ یہی گیسیں اور فوٹون (Photons) کئی ارب سال گزرنے کے دوران ٹھنڈے ہوتے ہوتے جمے اور قریب آ کر جڑنے لگے اور پھر انہی سے زمین، سورج، چاند، ستارے اور دوسرے اجرامِ فلکی تخلیق ہوئے۔ چنانچہ زمین و آسمان (مادے) کی تخلیق بھی دراصل وحدت سے کثرت کی طرف سفر ہے۔

☆☆☆☆☆☆

فَسُبْحَانَ مَنْ عَیَّنَ الْاَعْیَانَ بِالْفَیْضِ الْاَقْدَسِ الْاَقْدَمِ وَ کَوَّنَ الْاَکْوَانَ بِالْفَیْضِ الْمُقَدَّسِ الْمُقَدَّمِ۔ وَ اَظْھَرَ الْقِدَمَ بِالْحُدُوْثِ وَ الْحُدُوْثَ بِالْقِدَمِ وَ نَشَرَ الرِّقَّ الْمَنْشُوْرِ وَ کَتَبَ الْکِتَابَ الْمَسْطُوْرِ بِمِدَادِ الْوُجُوْدِ الْمُبْرِزِ مَا مَکَنَ فِیْ الْبَاطِنِ الْمُتَکَلِّمِ مِنَ الْحُرُوْفِ وَالْکَلِمَاتِ التَّامَّاتِ وَ اَتَمَّ وَ اَثْبَتَھُمَا فِیْہِ وَرَقَّمَ وَ رَتَّبَھُمَا وَ نَظَمَ وَ کَمَّلَھَا وَ تَمَّمَ۔

ترجمہ: پس پاک ہے وہ ذات جس نے مقرر کیا ہر نفس کو ساتھ فیض کے جو پاک اور قدیم ہے اور پیدا کیا موجودہ چیزوں کو ساتھ فیضِ مقدس اور مقدم کے اور ظاہر کیا قِدم کو بسبب حدوث کے اور حدوث کو بسبب قِدم کے۔ اور منتشر کیا رِقِّ منشور[1] کو اور لکھا کتابِ مسطور میں ظاہر ہونے والے وجود کی سیاہی سے اس چیز کو جو متکلم کے باطن میں حروف اور کلمات کی صورت میں چھپی ہوئی تھی اور پورا کیا اور ثابت کیا ان دونوں کو اس میں اور لکھا اور مرتب کیا ان دونوں کو اور جوڑا اور کامل کیا

[1] کتاب کا کھلا ہوا صفحہ

ان کو اور مکمل کیا۔

شرح: قدیم وہ ذات ہے جو ہمیشہ سے ہے یعنی ''نور''، جو پہلے نورِ الٰہی کی صورت میں پوشیدہ یا مخفی حالت میں تھا اور پھر نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صورت میں اس کا اظہار ہوا۔ اور حادث وہ چیز ہے جو پہلے موجود نہ تھی پھر اسے پیدا کیا گیا یعنی ارواح واجسامِ مخلوقات۔ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ کا پاک اور قدیم فیض ہے جس کے سبب سے حدوث (حادث کی جمع یعنی مخلوقات) کو وجود عطا ہوا۔ نفس بھی مخلوق ہے اور اسے بھی فیضِ قدیم یعنی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے تخلیق کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے قدیم اور پوشیدہ وجود کو حادث یعنی مخلوقات کے وجود کے ذریعے ظاہر کیا۔ اگر مخلوق نہ ہوتی تو اللہ کو پہچاننے والا اور اس کی عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ پس قدیم یعنی اللہ حادث یعنی مخلوق کے ذریعے ظاہر ہوا جبکہ دوسری طرف اس حادث مخلوق کو وجود بھی قدیم یعنی ذاتِ حق تعالیٰ سے حاصل ہوا۔ اللہ نہ ہوتا تو کوئی شے نہ ہوتی۔ یعنی حادث مخلوق، قدیم اللہ کے سبب سے ظاہر ہوئی۔ اسی لیے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ فرما رہے ہیں کہ ''ظاہر کیا قدیم (اللہ) کو بسبب حادث (مخلوق) کے اور حدوث کو بسبب قِدم کے''۔ یعنی قدیم اور حادث ایک دوسرے کے اظہار کا سبب ہیں۔

انسان کا باطن یعنی اس کا نفس، روح اور قلب اس کا اصل وجود ہے۔ جب یہ انسانی جسم سے علیحدہ ہو جاتے ہیں تو انسانی جسم پر موت واقع ہو جاتی ہے اور وہ بے کار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انسان کے اندر اصل بولنے والا متکلم اس کا باطن ہے۔ ہر انسان کے جسم میں پوشیدہ اس کا باطن ہی وہ وجود ہے جس نے اللہ کے وجود سے اپنا وجود پایا نہ کہ اس کے جسم نے۔ پس یہ انسانی باطن ہی وہ حروف اور الفاظ ہیں جو دوات یعنی ذاتِ حق تعالیٰ اور قلم یعنی نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں پوشیدہ تھے اور اسی سے لکھے گئے یا ظاہر ہوئے۔ چنانچہ یہ باطن بھی قدیم ہے کہ یہ حق تعالیٰ سے ہے۔ اس باطن کو دنیا میں ظاہر کرنے کے لیے اللہ نے مادی اجسام تخلیق کئے اور ان ظاہری جسموں کے ذریعے انسانی باطن کا اظہار کیا۔ انسان کے جسم سے وہی حرکات سرزد ہوتی ہیں جو اس کا باطنی وجود چاہتا

ہے۔ پس ظاہری اعمال درحقیقت باطنی اعمال کا اظہار ہیں اور ان باطنی اعمال کے اظہار کے لیے جسم کی ضرورت ہے ورنہ انسان اگر خالی روح کی صورت میں ہوتا تو نہ اپنے جذبات کا اظہار کر سکتا ہے نہ افعال کا۔ پس اللہ نے انسان کے باطنی وجود اور جسمانی وجود کو ایک دوسرے کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ باطن قدیم ہے اور جسم حادث۔ اللہ نے ان دونوں کو جوڑ کر انسان کو مکمل کیا۔ باطن (قدیم) کے اظہار کا سبب جسم (حادث) ہے اور جسم (حادث) باطن (قدیم) کے بغیر بے کار ہے۔ انسان نہ خالی جسم ہے نہ خالی باطن بلکہ دونوں کا مرکب ہے۔ باطن چھپی ہوئی سیاہی ہے اور ظاہری جسم کے افعال اس سیاہی سے نکلنے والے حروف۔ اور رقِ منشور سے مراد یہ کائنات کی کھلی ہوئی کتاب ہے جس کا ایک ایک دن ایک ایک صفحہ ہے جس پر انسان اپنے اعمال و افعال کو اپنے باطن کی سیاہی سے لکھتا ہے۔ یہ کائنات کی کتاب بھی انسان کی خاطر ہی کھولی گئی۔ انسان کے وجود کی تخلیق سے قبل یہ کتاب بند تھی اور اس کے تمام ایام بھی کُل کی صورت میں علمِ الٰہی میں موجود تھے۔ انسان کی خاطر اس کا ایک ایک صفحہ یعنی ایک ایک دن علیحدہ علیحدہ کر کے کھولا گیا۔

☆☆☆☆☆☆

وَفِي الْفَاتِحَةِ مَا فَصَّلَ فِي الْكِتٰبِ اَدْرَجَ وَاَدْغَمَ وَمَا الْفَاتِحَةِ فِي الْبِسْمِلَةِ وَمَا فِيهَا سَتَرَ فِي الْبَآءِ وَمَا فِيهَا اَبْطَنَ فِي النُّقْطَةِ وَاَضْمَرَ وَاَبْهَمَ۔

ترجمہ: جو کچھ تمام کتاب (قرآن) میں تفصیلاً بیان کیا ہے اس کو سورہ فاتحہ میں جمع (پوشیدہ) کیا اور جو فاتحہ میں تفصیلاً ہے وہ بسم اللہ میں پوشیدہ ہے اور جو بسم اللہ میں تفصیلاً ہے وہ اس کی باء میں اور جو کچھ باء میں ہے اسے باء کے نقطہ میں پوشیدہ اور مبہم کیا۔

شرح: سورۃ فاتحہ قرآن کی اہم ترین سورۃ ہے۔ اس کی اہمیت دو باتوں کی وجہ سے زیادہ ہے، ایک یہ کہ یہ قرآن کی ابتدا اور قرآن کو کھولنے والی ہے اور دوم یہ کہ یہ تمام قرآن کا خلاصہ بھی ہے اور

مرکزی خیال بھی۔

مندرجہ بالا عبارت کے ظاہری معنی تو واضح ہیں کہ تمام قرآن اللہ کی تعریف کی تفصیل ہے اور اس تفصیل کو جمع کر دیا گیا سورۃ فاتحہ میں کہ ''سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا، رحمٰن، رحیم اور قیامت کے دن کا مالک ہے۔'' اللہ کی یہ تعریف جامع اور کامل ترین ہے۔ اسی طرح تمام قرآن انسان کو اللہ کی طرف بلاتا اور بندے کا اللہ سے تعلق جوڑتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی تمام قرآن میں تفصیل سے بندے اور اللہ کا تعلق قائم کرنے والی آیات کو ایاک نعبد وایاک نستعین میں سمیٹ دیا گیا کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔ اللہ اور بندے کے تعلق کا اس سے زیادہ جامع بیان ممکن نہیں۔ اسی طرح تمام قرآن صراطِ مستقیم کو تفصیلاً بیان کرتا ہے کہ اس دنیا اور آخرت میں وہ کونسا راستہ ہے جس پر چل کر اللہ کے احکامات کی تعمیل ہو سکتی ہے اور اس کی منع کی ہوئی باتوں سے بچا جا سکتا ہے۔ تمام قرآن میں اللہ تعالیٰ اپنے اوامر و نواہی کو تفصیل کے ساتھ ایک ایک کر کے بیان کرتا ہے کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو لیکن سورہ فاتحہ میں بڑی آسانی سے ایک جملے میں بتا دیتا ہے کہ صراطِ مستقیم وہ ہے جو میرے نیک اور انعام یافتہ لوگوں کا راستہ ہے۔ ان لوگوں کی زندگیاں میرے احکام کی اطاعت کا عملی نمونہ ہیں پس انہیں دیکھو، ان سے سیکھو اور ان کے عمل کے مطابق عمل کرو، صراطِ مستقیم پا لو گے۔ تمام قرآن کی ایک ایک آیت میں سے اوامر و نواہی کو تلاش کرنے کی بجائے صرف میرے محبوبین کی پیروی کر لو میری رحمت کے حقدار بن جاؤ گے۔ اسی طرح دنیا میں ان لوگوں کا حشر بھی دیکھ لو جنہوں نے میری نافرمانی کی اور غضب کے حقدار ہوئے ان کے راستے پر مت چلنا ورنہ تمہارے مقدر میں بھی میرا غضب ہی ہوگا۔ پس قرآن کریم کا لُبِ لباب اور روح سورہ فاتحہ میں پوشیدہ ہے۔

پھر فرمایا کہ جو کچھ سورۃ فاتحہ میں تفصیلاً ہے وہ بسم اللہ میں پوشیدہ ہے۔ بسم اللہ یعنی ''اللہ کے اسم سے''۔ اسم اَللّٰہُ میں تو زمین و آسمان و کائنات تمام کی تمام پوشیدہ ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اللہ ہی زمینوں اور آسمانوں کا نور ہے۔ اسم اَللّٰہُ میں پورا قرآن پوشیدہ

ہے یعنی جو مقصد پورے قرآن کی تلاوت سے حاصل ہوگا وہ صرف اسم اَللّٰہُ کے ذکر سے حاصل ہو جائے گا۔ پورا قرآن خود بھی صرف ذکرِ اَللّٰہُ ہی تو ہے۔ اگر قرآن اور سورۃ فاتحہ اللہ کی تعریف بیان کرتے ہیں تو اسمِ اَللّٰہُ کا ذکر سب سے بہترین تعریف ہے اللہ کی' کیونکہ اسم اَللّٰہُ' اللہ کا اپنے ناموں میں سے پسندیدہ ترین نام ہے۔ دنیا کی ہر شے اسم اَللّٰہُ ہی کے ذکر سے اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے۔ اللہ نے خود بھی قرآن میں انسان کو حکم دیا کہ میری تعریف میری تسبیح میرے اسمِ اَللّٰہُ سے کرو:

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (حاقتہ 52' واقعہ 74'96)

ترجمہ: پس اپنے ربّ عظیم کے نام (اسمِ اَللّٰہُ) کی تسبیح بیان کرو۔

ذکر اسمِ اَللّٰہُ ہی بندے اور اللہ کا تعلق جوڑتا ہے جو تمام قرآن اور سورہ فاتحہ کا مقصد ہے۔ بندہ اللہ کو اس کے اسم اَللّٰہُ سے ہی پہچانتا اور جانتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ذکرِ اسمِ اَللّٰہُ کو قلوب اور نفوس کو صاف اور شفاف کرنے والی صیقل قرار دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا لِکُلِّ شَیْءٍ مُصْقِلَۃٌ وَمُصْقِلَۃُ الْقَلْبِ ذِکْرُ اللّٰہِ تَعَالٰی ترجمہ: ''ہر چیز کے لیے صیقل (صفائی کرنے والی چیز) ہے اور قلب کی صیقل اسمِ اَللّٰہُ کا ذکر ہے''۔ اسمِ اَللّٰہُ کا ذکر نفس، قلب اور روح کو اس کی نورانیت واپس عطا کر دیتا ہے جس کی روشنی میں انسان کو اللہ تک جانے والا صراطِ مستقیم صاف دکھائی دینے لگتا ہے۔ پس ذکر اسمِ اَللّٰہُ ہی صراطِ مستقیم دکھا کر ان لوگوں کے راستے پر چلاتا ہے جن سے اللہ راضی ہوا۔ یہ تمام لوگ بھی حکمِ الٰہی ''پھر جب تم نماز ادا کر چکو تو کھڑے بیٹھے اور کروٹوں کے بل لیٹے ذکرِ اَللّٰہُ کرو'' (النساء۔103) کے مطابق دن رات سوتے جاگتے اسمِ اَللّٰہُ کا ذکر کر کے اللہ سے اپنا تعلق مضبوط بناتے تھے کیونکہ اس نے کہا کہ فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ (البقرہ۔152) ترجمہ: ''تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا''۔ تو جو ذکرِ اَللّٰہُ کر کے اللہ کو یاد کرتے ہیں اللہ ان کو یاد کرتا ہے اور یوں ذکر اَللّٰہُ ہی بندے اور اللہ کے درمیان تعلق کی مضبوطی کا ذریعہ اور صراطِ مستقیم پر چلانے والی قوت ہے۔

عبارت کا اگلا حصہ باطنی معنی رکھتا ہے۔ یہ تو واضح ہو گیا کہ تمام قرآن سورہ فاتحہ میں پنہاں

ہے اور تمام سورہ فاتحہ بسم اللہ میں پوشیدہ ہے۔ اب بسم اللہ کا باء میں پنہاں ہونے سے مراد یہ ہے کہ اسمِ اَللّٰہُ ''باء'' میں پوشیدہ ہے۔ یہاں باء سے مراد حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے۔ جیسا کہ ''الف'' عربی حروفِ تہجی کا پہلا حرف ہے، اللہ ''الف'' سے ہے یعنی سب سے اوّلین موجود، ہر اوّل سے اوّل۔ اور باء حروفِ تہجی کا دوسرا حرف ہے۔ یعنی الف کے بعد باء ظاہر ہوا۔ الف اللہ کے بعد ظاہر ہونے والا وجود نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے چنانچہ باء سے مراد نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے جو نورِ الٰہی کا اظہار ہے یا جس میں نورِ اسمِ اَللّٰہُ پوشیدہ ہے۔ باء سے مراد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بشریت بھی لیا جا سکتا ہے کہ اسی بشری وجود میں نورِ اَللّٰہُ پوشیدہ ہے۔ اب اس بات کو عبارت کے گزشتہ حصہ سے جوڑا جائے تو بات واضح ہو جائے گی۔ باء یعنی ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں ہی اسمِ اَللّٰہُ کا تمام نور پنہاں ہے، اسی میں ساری سورہ فاتحہ کے حقیقی معنی پنہاں ہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی سب سے بڑھ کر اللہ کی تعریف کرنے والے حامد ہیں، آپ ہی انسانوں کی مدد کرنے والے، انہیں صراطِ مستقیم دکھانے والے اور ہدایت دینے والے رہنما ہیں۔ آپ ہی کے ذریعے ہم نے اللہ کو پہچانا اور اس کو عبادت کے لائق مانا۔ آپ ہی کے ذریعے ہمیں قرآن ملا۔ تمام قرآن ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں پنہاں تھا جو اپنے وقت پر آہستہ آہستہ ظاہر ہوتا رہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ہر عمل قرآن ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ''آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا خُلق قرآن ہے۔'' پس تمام قرآن، سورۃ فاتحہ اور نورِ اسمِ اَللّٰہُ ''حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم'' میں جمع ہے۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ آگے فرماتے ہیں کہ جو کچھ باء میں ہے وہ اس کے نقطہ میں پوشیدہ ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اَنَا نُقْطَۃُ بَاءِ بِسْمِ اللّٰہِ یعنی ''میں بسم اللہ کی باء کا نقطہ ہوں۔'' اس بات میں انتہائی باریک لیکن حسین نکتہ ہے۔ باء سے مراد حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے جو تمام عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہر شے کی حقیقت اور باطن نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے۔ تمام کائنات نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا پھیلاؤ ہے لیکن یہ تمام نور جس نقطہ پر سمٹ کر جمع اور مرکوز (converge) ہوتا ہے وہ ذاتِ علی کرم اللہ وجہہ الکریم ہے، مراد وہ کامل انسان ہے جس کے قلب میں آ کر تمام نورِ الٰہی بواسطہ نورِ

محمدی ﷺ مجتمع ہو جائے۔ جس کی ذات تمام اسرارِ الٰہی' حقائقِ قرآن وحدیث کا مجموعہ ہو۔ جو تمام وجود کے دائرے کا مرکز ہو۔ پس تمام قرآن' سورۃ فاتحہ' نورِ اسمِ اَللّٰہُ، نورِ محمدی ﷺ مجتمع ہیں کامل انسان میں جو تمام کائنات کا مرکزی نقطہ ہے۔ اگر باء کے نیچے یہ نقطہ نہ ہو تو باء بے معنی ہو جائے یعنی اگر حقیقتِ محمدیہ ﷺ ہر زمانے میں اس زمانے کے انسانِ کامل' جسے باء کا نقطہ کہا گیا ہے، کی صورت میں ظاہر نہ ہو اور انسانِ کامل کو صرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ظاہری 63 سالہ زندگی تک محدود کر دیا جائے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ''رحمتِ عالم'' ہونا یعنی ہر زمانے کے لیے رحمت اور ہدایت کا باعث ہونا کیسے ممکن ہو۔ پس باء کا نقطہ یعنی انسانِ کامل کا ظاہری، بشری و باطنی وجود ہر دور میں ہمیشہ موجود ہے، اسی نقطہ میں اسمِ اَللّٰہُ کا تمام نور جمع ہے، وہی وہ انعام یافتہ ہے جس کا راستہ صراطِ مستقیم ہے اور جس کی پیروی کرنے والے ہدایت پا جاتے ہیں۔ تمام حقائقِ الٰہیہ اسی کی ذات میں جمع ہیں۔

اس نقطہ کے 'مبہم' ہونے سے مراد یہ ہے کہ یہ انسانِ کامل ہر دور میں موجود تو ضرور ہوتا ہے لیکن عام لوگوں کی نظر سے پوشیدہ ہوتا ہے۔ صرف خاص الخاص لوگ جنہیں حق تعالیٰ کے قرب کی سچی لگن ہوتی ہے اسے جان اور اس کی حقیقت یعنی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اس کے ظاہری جسمانی وجود میں دیکھ اور پہچان سکتے ہیں۔ جس طرح اللہ خزانوں کو پوشیدہ رکھتا ہے اسی طرح اللہ اپنے نور کے خزانے اور اپنے مظہر انسانِ کامل کو بھی پوشیدہ اور مبہم رکھتا ہے۔ اس تک پہنچنے کا ذریعہ اللہ اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا سچا اور بے لوث عشق اور مکمل اطاعت و پیروی ہے۔

☆☆☆☆☆☆

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَی الْاِسْمِ الْاَعْظَمِ وَالرِّدْءِ الْمُعَلِّمِ وَالْمُمِدِّ لِلْھِمَمِ بِالْقَوْلِ اِلَّا قَوْمِ مُحَمَّدٍ ﷺ فَتَحَ بِہِ الْکِتَابَ وَخَتَمَ وَمَیَّزَ الْبَاطِلَ مِنَ الْحَقِّ وَالنُّوْرَ مِنَ الظُّلَمِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ۔

ترجمہ: اور رحمت ہو اللہ کی اوپر اسمِ اعظم اور یار (دوست، ساتھی) سکھانے والے پر کہ وہ مدد کرنے والا ہے اِن (مومنین) کی ہمتوں کی اپنے مضبوط قول سے۔ محمد ﷺ سے شروع کیا کتاب کو اور ختم کیا (آپ ﷺ پر)، علیحدہ کیا باطل کو حق سے اور نور کو اندھیرے سے۔ ہزاروں ہزار درود و سلام ہو آپ ﷺ کی آل اور اصحاب پر۔

شرح: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ربّ تعالیٰ اپنے سب سے قوت والے اسمِ اَللّٰہُ' جو اس کے تمام اسماء کا جامع ہے اور جس میں اس کی تمام صفات موجود ہیں' کی رحمت کی تجلیات محمد ﷺ پر نازل کرے کہ وہ تمام امت کے دوست اور رہنما ہیں۔ حقیقتِ محمدیہ ﷺ ہر زمانے میں اس زمانے کے اکمل انسان کی صورت میں ظاہر ہو کر اس زمانے کے مومنوں کی راہِ خدا پر رہنمائی کرتی ہے۔ یہ اکمل انسان اسمِ اعظم ''اَللّٰہُ'' کی ظاہری صورت ہے کیونکہ وہ اللہ کی تمام صفات سے متصف اور حضرت محمد ﷺ کا خلیفہ یعنی حقیقتِ محمدیہ ﷺ کا اس زمانے میں اظہار ہے۔ حضرت شیخ موید الدین جندی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ''اسمِ اعظم جس کا ذکر مشہور ہو چکا ہے اور جس کی خبر چار سو پھیل چکی ہے وہ حقیقتاً و معناً عالمِ حقائق و معنی سے ہے اور سورۃً ولفظاً عالمِ صورت و الفاظ سے ہے۔ جمیع حقائقِ کمالیہ سب کی سب احادیث کا نام حقیقت ہے اور اس کے معنی وہ انسانِ کامل ہے جو ہر زمانہ میں ہوتا ہے یعنی وہ قطب الاقطاب اور امانتِ الٰہیہ کا حامل اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہوتا ہے اور ''اسمِ اعظم'' کی صورت اس ولی کامل کی ظاہری صورت کا نام ہے'' (تفسیر روح البیان[1])۔ اس انسانِ کامل پر اللہ کی رحمت ہو کہ وہ مومنوں کی ہمتوں کو بڑھاتا اور انہیں راہِ معرفتِ الٰہی پر لے کر آگے بڑھتا ہے۔ کامل انسان صرف حضرت محمد ﷺ ہیں خواہ وہ کسی بھی زمانے میں کسی بھی ظاہری روپ میں جلوہ گر ہوں۔ محمد ﷺ کی اس حقیقت کو سوائے خدا کے کوئی نہیں سمجھ سکتا' کوئی نہیں جانتا۔

---

[1] صفحہ نمبر 41۔ جلد نمبر 1۔ ترجمہ: مولانا محمد فیض اویسی۔ ناشر مکتبہ اویسیہ رضویہ بہاولپور

؎ خدا و مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رمز سے ادراک عاجز ہے
خدا کو مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جانے، محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خدا جانے

حدیث شریف میں ہے:

يَا اَبَا بَكرٍ لَمْ يَعْرِفْنِي حَقِيْقَةً غَيْرَ رَبِّي

ترجمہ: اے ابوبکر! حقیقتاً مجھے میرے ربّ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

ہر زمانے میں بشری روپ میں ظاہر ہونے والی حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ظاہری آنکھوں سے پہچاننا ناممکن ہے جیسا کہ اللہ فرماتا ہے۔

وَتَرٰاهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (الاعراف۔ 198)

ترجمہ: اور (اے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) یہ لوگ صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چہرے (بشریت) کو دیکھتے ہیں اور (حقیقت کو) نہیں دیکھ سکتے۔

حضرت ملا علی قاری رحمتہ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں ''صوفیہ نے فرمایا کہ اکثر خواص کو اللہ تعالیٰ کا عرفان نصیب ہوتا ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو نہیں جانتے کیونکہ حجابِ بشریہ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا ہے''۔

اپنے زمانے کے کامل انسان میں پوشیدہ حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پہچاننا عوام کے لیے تو ناممکن ہے خواص بھی اس سے مکمل طور پر آشنا نہیں ہو سکتے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی الرِّدْءِ الْمُعَلَّمِ ''یار سکھلانے والے'' ہیں۔ تمام عالم کے معلم، تمام علوم کے مخزن ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات سے تمام علوم کے چشمے پھوٹتے ہیں اور عالم ان سے فیض یاب ہوتا ہے۔

''مضبوط قول'' سے مراد احادیث مبارکہ بھی ہیں اور عارف بقا باللہ کامل انسان کے اقوال بھی ہیں جس کی زبان کُن کا حکم رکھتی ہے جیسا کہ رسالۃ الغوثیہ میں حضرت غوث الاعظمؓ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''میرے نزدیک فقیر وہ ہے جو کسی چیز کو کن کہے تو وہ ہو جائے۔'' چنانچہ انسانِ

کامل کی زبانِ کُن کے الفاظ مومنین کی ہمت بھی بڑھاتے ہیں، انہیں راہ بھی دکھاتے ہیں اور ان کی راہ کی مشکلات کو دور بھی کرتے ہیں۔

حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اظہار کے لیے ہی اللہ تعالیٰ نے وجود کی کتاب کا آغاز کیا اور اسی پر انتہا ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی اللہ کی تخلیق کا نقطۂ آغاز ہیں' آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی نقطۂ عروج اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی نقطۂ انتہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تخلیق میں اوّل اور ظہور میں آخر ہیں۔ اللہ نے آپ کی خاطر تمام کائنات تخلیق کی:

لَوْلَاکَ لَمَا اَظْھَرْتُ رَبُوْبِیَّۃَ

ترجمہ: اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نہ ہوتے تو میں اپنا ربّ ہونا ظاہر نہ کرتا۔

قرآن میں اللہ فرماتا ہے کہ ''اللہ ہی مومنوں کا دوست ہے جو انہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے۔'' (البقرہ۔257) کامل انسان جس میں نورِ الٰہی جلوہ گر ہے' جو اللہ کی تمام صفات سے متصف زمین پر اللہ کا نائب ہے اور جس میں حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بھی ظاہر ہے، اللہ کی نیابت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خلافت کا حق ادا کرتے ہوئے مومنوں کو نفسانی حجابوں کے اندھیروں سے نکال کر قربِ الٰہی کے روشن نور میں لے آتا ہے۔ جب نورِ الٰہی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صورت میں ان مومنوں میں جلوہ گر ہوتا ہے تو اس نور کی روشنی میں وہ حق اور باطل' سچ اور جھوٹ' کھرے اور کھوٹے کی پہچان کر لیتے ہیں چنانچہ حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی ہر زمانے میں حق اور باطل میں تمیز کرنے کی باعث ہے۔ اسی کے ذریعے معرفتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے اور جہالت کے اندھیرے چھٹ جاتے ہیں۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آل اور اصحاب پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ آل سے مراد حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دیگر اولادوں سے ان پاک ہستیوں کو متمیز[1] کر کے خصوصاً

---

[1] علیحدہ، ممتاز

صرف انہی کو ''آل'' کے زمرے میں شامل کرنے کی وجہ ورثۂ فقر یا حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے توسط سے ان ہستیوں میں ظاہر ہوئی۔ چنانچہ یہ چاروں مقدس ہستیاں تو حقیقی، بدنی، ظاہری و باطنی آل کے درجے پر فائز ہیں اور درود و سلام کی حقدار ہیں لیکن روحانی آل کے زمرے میں وہ تمام کاملینِ امت بھی شامل ہیں جن میں اپنے اپنے زمانے میں حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ظاہر ہوتی رہی۔ ایک بار حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں عرض کیا گیا:

من اٰل محمدنِ الذی اَمرنا لِبَتَبْعِھِمْ واکرامھم والبرھم فقال اھل الصفا والوفامَن اٰمن بِیْ وخَلص فقیل لہٗ وَمَا علامتھم فقال ایثار محبتی علیٰ کل محبوب و اشتغال الباطن بذکری بعد ذکر اللّٰہ

ترجمہ: ''کون ہیں وہ آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جن کی محبت اور تعظیم اور جن سے نیکی کرنے پر ہم مامور ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا وہ لوگ اہلِ صفا اور وفا ہیں جو مجھ پر باخلاص ایمان لائے۔ تب عرض کیا گیا کہ ان کی علامت کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہر شے کی محبت سے مجھے زیادہ محبوب جانتے ہیں اور اَللّٰہُ کے ذکر کے بعد اپنے باطن میں میرا (اسمِ مُحَمَّد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا) ذکر کرتے ہیں۔''

اصحاب جمع ہے صاحب کی، مراد ساتھی۔ جن لوگوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی ظاہری آنکھوں سے حالتِ ایمان میں دیکھا وہ صحابی ہیں۔ ان میں اعلیٰ رتبہ ان کا ہے جنہوں نے باطنی آنکھوں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حقیقت کو بھی پہچانا۔ جن لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ظاہری حیات میں آپ کو دیکھا اور آپ پر ایمان لائے اُن اصحاب کے درجے تک بعد میں آنے والوں میں سے کوئی نہیں پہنچ سکتا لیکن حقیقتِ محمدیہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ظاہری حیات کے بعد بھی ہر زمانے میں اس زمانے کے کامل انسان میں ظاہر ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے اپنی باطنی بصیرت سے کامل انسان میں پوشیدہ حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پہچان کر اس انسانِ کامل کا ساتھ دیا، وہ لوگ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے باطنی اصحاب میں شامل ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّیْ اَجَبْتُ سُؤَالَكَ اَیُّهَا الْوَلَدُ الصَّالِحُ لَمَّا سَاَلْتَنِیْ اَنْ اُثْبِتَ وَاَرْقُمَ لَكَ فِیْ هٰذَا الْمُخْتَصَرِ شَیْئًا مِّمَّا قَدَّرَ اللّٰهُ لِیْ فِیْ تَحْقِیْقِ فَاتِحَةِ الْكِتَابِ الَّتِیْ هِیَ اُمُّ الْكِتَابِ بِلِسَانِ اَهْلِ اللّٰهِ وَخَاصَّتِهٖ وَسَمَّیْتُهٗ بِمِرْاٰةِ الْعَارِفِیْنَ فِیْ مُلْتَمَسِ زَیْنِ الْعَابِدِیْنَ وَاَسْئَلُ الْعَوْنَ مِنْ مُّوْجِدِ الْكَوْنِ فَاِنَّهُ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَیْهِ التُّكْلَانُ۔

ترجمہ: بعد حمد وصلوٰۃ کے پس میں نے قبول کیا سوال تیرے کو۔ اے میرے صالح بیٹے جبکہ سوال کیا تو نے مجھ کو کہ یہ بات ثابت کروں اور لکھوں میں تیرے واسطے مختصر علم سے جو قدرتِ الٰہی سے مجھ کو ملا فاتحہ الکتاب کی تحقیق وتفسیر جو اُم الکتاب ہے، ساتھ زبان اہلِ اللہ اور اس کے خواص کے۔ اور نام رکھا میں نے اس کا ''مرآۃ العارفین فی ملتمس زین العابدین'' اور سوال کرتا ہوں میں مدد کا جہان کے پیدا کرنے والے سے، اس لیے کہ وہی مدد کرنے والا ہے اور اسی پر ہے توکل۔

اِعْلَمْ اَیُّهَا الْوَلَدُ الْمُؤَیَّدُ اَنَّ الْعَالَمَ عَالَمَانِ عَالَمُ الْاَمْرِ وَعَالَمُ الْخَلْقِ وَكُلٌّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا كِتَابٌ مِّنْ كُتُبِ اللّٰهِ وَلِكُلٍّ فَاتِحَةٌ وَجَمِیْعُ مَا فِی الْكِتَابِ مُفَصَّلٌ فِی الْفَاتِحَةِ مُجْمَلٌ۔

ترجمہ: جان لو اے میرے تائید کیے گئے بیٹے کہ تمام عالم درحقیقت دو عالم ہیں۔ ایک عالمِ امر اور ایک عالمِ خلق اور ان دونوں عالموں میں سے ہر ایک اللہ کی کتاب ہے اور ہر ایک کے لیے فاتحہ ہے اور وہ تمام اشیاء جو کتاب میں مفصل[1] ہیں بیچ فاتحہ کے مجمل[2] ہیں۔

شرح: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اپنے فرزند حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ 'تائیدِ ایزدی جن کے شاملِ حال ہے' کو مخاطب کر کے دونوں عالموں کی تفصیل بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ اللہ کے تخلیق

---

[1] تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی [2] مختصر لیکن مکمل اور جامع حالت

کردہ عالموں کی کوئی انتہا نہیں لیکن بنیادی طور پر تمام عالموں کو دو قسموں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ عالمِ امر اور عالمِ خلق۔ عالمِ خلق سے مراد ظاہری عالم ہے جہاں اشیاء کو دیکھا' چھوا' سونگھا یا ٹکڑے ٹکڑے کیا جا سکتا ہے جبکہ عالمِ امر وہ عالم ہے جہاں اشیائے عالم ظاہری وجود پانے سے پہلے ارادے' خیال یا باطن میں موجود ہوتی ہیں جنہیں ظاہری آنکھوں سے دیکھا یا چھوا یا ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا جا سکتا۔ عالمِ امر اجسام سے عاری ہے۔ وہ ارواح' نفوس' ارادوں' خیالات وتصورات کا عالم ہے جو مکمل وجود رکھتا ہے لیکن دیکھا اور چھوا نہیں جا سکتا۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا: ''قل الروح من امر ربی'' ترجمہ: ''کہہ دیجیے کہ روح امرِ ربی ہے۔'' اس آیت میں روح سے مراد روحِ قدسی ہے جس کا تعلق عالمِ اَمر سے ہے نہ کہ روحِ انسانی جس کی تخلیق نچلے درجے پر عالمِ جبروت میں کی گئی۔ جب کفار نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے روح کے متعلق سوال پوچھا کہ روح کیا ہے تو اللہ نے اس آیت ''قل الروح من امر ربی'' کے ذریعے انہیں جواب دیا کہ روح کا تعلق تو عالمِ امر سے ہے جبکہ تم عالمِ خلق کے باسی ہو جہاں ہر چیز کو دیکھ کر یا چھو کر جانا پہچانا جاتا ہے لیکن روح ایسا وجود نہیں رکھتی کہ دیکھی اور چھوئی جا سکے لہٰذا عالمِ خَلق یا عالمِ ناسوت میں قید عام لوگ روح کی حقیقت کو سمجھ ہی نہیں سکتے کیونکہ اس کا تعلق کسی اور ہی جہان سے ہے۔ عالمِ امر وہ عالم ہے جہاں اللہ کا ارادہ دنیا میں ظاہر ہونے سے پہلے موجود ہوتا ہے۔

اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ o (سورہ یٰسین ۔ 82)

ترجمہ: ''جب وہ (عالمِ امر میں) کسی بات کا ارادہ کر لیتا ہے تو اسے کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔''

یہ عالم نہایت لطیف' وقت اور مکان کی قید سے آزاد ہے۔ چونکہ روحِ قدسی اس عالمِ امر کی رہائشی ہے اس لیے روح کی حقیقت یا انسانی باطنی حقیقی وجود کو جاننے، پہچاننے اور عرفانِ نفس حاصل کرنے کے لیے انسان کو عالمِ خلق سے نکل کر عالمِ امر تک سفر کرنا ہوگا۔ عالمِ خَلق انسان کے اردگرد اور عالمِ امر انسان کے اندر موجود ہے۔

یہ دونوں عالم اپنے وجود کے اعتبار سے اللہ کے لیے ایک کتاب کی مانند ہیں جنہیں دوات یعنی نورِ الٰہی اور قلم یعنی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ذریعے لکھا گیا ہے جیسا کہ شرح کے آغاز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کتابِ عالم میں مختلف ابواب' مضامین' کلمات' حروف وغیرہ پھیلے ہوئے ہیں، جس طرح قرآنِ پاک کے مختلف پارے' سورتیں کلمات اور حروف ہیں۔ عالمِ خلق میں حروف سے مراد افراد' سورتوں سے مراد ان افراد کی قومیں اور پاروں سے مراد مختلف زمانے اور ادوار ہیں۔ جبکہ عالمِ امر میں حروف سے مراد ارواح اور نفوس ہیں اور پاروں اور سورتوں سے مراد دنیا میں ان کے نزول یعنی ظاہر ہونے تک کے مختلف مقامات ہیں۔ عالمِ امر اور عالمِ خلق ایک کتاب کی مانند ہیں اور جس طرح قرآن کی ابتدا سورۃ فاتحہ ہے جس میں تمام قرآن جمع ہے اسی طرح عالمِ امر کی ابتدا اور تمام عالمِ امر کا جامع نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے جن سے تمام ارواح کا نور ظاہر ہوا یعنی تمام ارواح' اسماء اور صفاتِ الٰہی کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی جامع ہیں اسی لیے عالمِ امر کی کتاب کی 'فاتحہ' حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک نام الفاتح بھی ہے جس کے معنی ''کھولنے والا'' یا ''ابتدا کرنے والا'' ہیں۔

عالمِ خلق کے ظہور کی ابتدا بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اگر آپ کو پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو میں یہ جہان بھی پیدا نہ کرتا۔'' یعنی یہ عالمِ خلق بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بدولت ہی تخلیق ہوا۔ چنانچہ عالمِ خلق کی ابتدا بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں بواسطہ اپنے اسم 'اوّل' کے۔

اس دنیا میں ظہور کے حساب سے حضرت آدم علیہ السلام اوّل بھی ہیں اور انہی کی پشت میں تمام عالمِ انسانی مجتمع بھی ہے۔ اس لحاظ سے عالمِ خلق کی کتاب کے لیے فاتحہ کا درجہ حضرت آدم علیہ السلام کو گنا جا سکتا ہے لیکن واضح ہو کہ عالمِ خلق صرف انسانوں پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں عالمِ خلق کی ہر شے سورج' چاند' ستارے' ہوا' دریا' سمندر' درخت وغیرہ بھی شامل ہیں۔ جبکہ حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں صرف نسلِ انسانی جمع تھی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ ''میں اس وقت بھی نبی تھا جب حضرت آدم علیہ السلام

ابھی مٹی اور پانی کے درمیان تھے" یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا وجود حضرت آدم علیہ السلام کے وجود سے پہلے تخلیق کیا جا چکا تھا۔ چنانچہ عالمِ خلق کی ابتدا بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی اس عالم کی روحِ رواں ہیں۔ معراج کی رات جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم عالمِ خلق سے سفر کر کے عالمِ لاھُوت لامکاں میں قرب و وِصالِ الٰہی سے لطف اندوز ہوئے تو یہ عالمِ خلق اپنی روح کے نکل جانے کی وجہ سے یک دم رک گیا اور کائنات کی کوئی شے حرکت نہ کر پائی اور جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس عالمِ خلق میں واپس تشریف لائے تو یہ کائنات پھر حرکت کرنے لگی۔ جس طرح روحِ قدسی انسانی وجود کی ابتدا اور اس کی اصل ہے، تمام انسانی وجود اس روحِ قدسی پر ہی مرکوز اور اس روحِ قدسی میں ہی جمع ہے اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی اس عالمِ خلق کے وجود کا آغاز، اس کی اصل، اس کا مبداء ہیں، اس کی روح اور عالمِ خلق کی اس کتاب کی فاتحہ ہیں۔

عالمِ خلق میں جو کچھ تفصیلاً موجود ہے وہ انسان میں اجمالاً موجود ہے۔ حضرت علامہ ابنِ عربی رحمۃ اللہ علیہ شجرۃ الکون میں فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ نے تمام عالمِ کون[1] کو آدم (انسان) کی صورت واسم پر پیدا فرمایا۔ عالم کی دو اقسام ہیں، عالمِ ملک (یعنی عالمِ خلق) اور عالمِ ملکوت (یعنی عالمِ امر)۔ عالمِ ملک جسمانیتِ آدم کی مانند ہے اور عالمِ ملکوت مثلِ روحانیتِ آدم ہے۔ کثافتِ[2] عالمِ سفلی[3] اس کی جسمانیت کی کثافت کی مانند اور لطافتِ[4] عالمِ علوی[5] اس کی روحانیت کی لطافت کی مثل ہے۔ ایستادہ پہاڑوں کو زمین کے لیے میخیں بنایا گیا۔ وہ انسان کے جسم میں ہڈیوں کی مانند ہیں جو جسم میں میخوں کا کام دیتی ہیں اور چلتے پھرتے ہوئے پانی سے بھرے ہوئے دریا اور رُکے ہوئے کھارے اور میٹھے سمندر کی مثال جسم میں اس خون کی مانند ہے جو رگوں میں جاری اور اعضاء میں رکا ہوا ہے۔ دریاؤں کے پانی کے ذائقے میں اختلاف کی مثال انسانی جسم میں یوں

1۔ کن سے پیدا کیے گئے تمام عالم 2۔ گاڑھا پن، گھنا پن، موٹائی، پکڑے یا چھوئے جانے کی صلاحیت 3۔ دنیا یا عالمِ ناسوت 4۔ لطیف ہونا۔ لطیف ایسا وجود ہے جو موجود تو ہے لیکن دیکھا پکڑا یا چھوا نہیں جا سکتا جیسے روح یا نور

5۔ عالمِ بالا یعنی عالمِ ارواح، عالمِ ملائکہ یا عالمِ لاھوت لامکان وغیرہ

ہے کہ شیریں پانی لعابِ دہن کی مانند ہے کیونکہ اس میں کھانے پینے کی چیزیں ملتی رہتی ہیں، آنکھ کا پانی نمکین ہوتا ہے تاکہ اس سے آنکھ کی چربی سالم رہے اور کان کا پانی کڑوا ہوتا ہے تاکہ اگر کوئی کیڑا مکوڑا اس میں داخل ہوجائے تو وہ مرجائے اور بعینہٖ بعض زمینیں عمدہ ہوتی ہیں جن میں کھیتی اگنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور بعض سنگلاخ ہوتی ہیں جن میں کھیتی نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح انسان کے جسم کی بھی یہی کیفیت ہے جیسا کہ زمین میں بڑے بڑے دریا ہیں اور ان سے چھوٹی چھوٹی نہریں نکلتی ہیں اور لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح انسان کے جسم میں بڑی سخت رگیں مثلِ شاہ رگ موجود ہیں جس سے تمام رگوں میں خون پھیلتا ہے۔ پھر آسمان میں اللہ تعالیٰ نے سورج کو اہلِ زمین کے لیے روشن چراغ کی مانند بنایا۔ بعینہٖ انسانی جسم میں روح نے ضیاء بخشی۔ بوقت موت جب جسم سے روح غائب ہوجاتی ہے تو جسم اسی طرح تاریک ہوجاتا ہے جس طرح سورج کے غائب ہوجانے سے زمین تاریک ہوجاتی ہے۔ اور پھر عقلِ انسانی کو مانندِ قمر بنایا، جس طرح چاند کبھی گھٹتا اور کبھی بڑھ جاتا ہے اور ابتداء میں وہ ہلال یعنی چھوٹا ہوتا ہے اسی طرح چھوٹے بچے کی عقل شروع میں چھوٹی ہوتی ہے، جس طرح چاند بڑا ہوتا جاتا ہے اسی طرح بچہ کی عقل حسبِ عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے اور جیسے چاند چودھویں رات کے بعد گھٹنا شروع ہوجاتا ہے عین اسی طرح عقلِ انسانی بھی چالیس سال کے بعد گھٹنا شروع ہوجاتی ہے۔ اور جس طرح آسمان پر پانچ سیارے جنہیں ''خمسہ متحیرہ'' کہتے ہیں یعنی زحل، مشتری، عطارد، مریخ اور زہرہ ہیں اسی طرح انسان میں بھی حواسِ خمسہ یعنی سننے، دیکھنے، چکھنے، محسوس کرنے اور سونگھنے کے حواس موجود ہیں۔

جس طرح عالمِ علوی میں عرش وکرسی بنائے گئے اسی طرح جسمِ انسانی میں دِل بمنزلۂ عرش اور سینے کو بمنزلۂ کرسی پیدا کیا گیا۔ عرش مجید کو خدائے قدوس نے پیدا کر کے اپنے بندوں کے قلوب اس کی طرف مائل کیے اور التجاء وزاری کے وقت ہاتھوں کو اپنی طرف بلند کرنے کے لیے اس کو محل قرار دیا اور یہ نہیں کہ عرش کو اس نے اپنی ذات کے لیے محل اور اپنی صفات کا مجالس بنایا کیونکہ اس کا نام رحمٰن ہے اور استواء اس کی نعت وصفت ہے جو اس کی ذات سے متصل ہے۔ عرش اسکی مخلوقات میں سے ہے،

نہ وہ (اللہ) اس کے ساتھ متصل ہے اور نہ ہی اس سے اس کی ملابست[1] ہے اور نہ ہی وہ اس پر محمول[2] ہے اور نہ اسے اس کا احتیاج ہے۔ کرسی اس کے اسرار (رازوں) کا ظرف[3] اور انوار کا ترکش[4] ہے۔ جو کچھ دائرہ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اس کی کرسی آسمانوں اور زمین پر حاوی ہے) میں ہے وہ اس کی امانت گاہ ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انسان کے سینے کو بمنزلہ کرسی کے بنایا کیونکہ اس سے علومِ صادرہ کی تحصیل ہوتی ہے جو بمنزلہ ایک ایسے میدان کے ہے جو قلب و نفس کے دروازے پر ہے اور یہاں سے دو دروازے قلب و نفس کی طرف نکلتے ہیں۔ قلب سے جو بھلائی یا نفس سے جو برائی صادر ہوتی ہے اس کا محصّل[5] صدر (سینہ) ہے اور اس سے جوارح[6] مستفید ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اس قول کا یہی مطلب ہے وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ (اور سینوں میں جو کچھ ہے وہ حاصل کیا جائیگا)۔

اور اللہ تعالیٰ نے دِل کو بمنزلہ عرش کے بنایا۔ عرش مجید آسمانوں پر مصروف اور زمین پر مسکون ہے کیونکہ دلوں کا عرش آسمانی عرش سے افضل ہے اور نہ ہی آسمانی عرش میں خدا تعالیٰ سما سکتا ہے اور نہ ہی عرش مجید اسے اُٹھا سکتا ہے۔ اور وہ اس کا ادراک بھی نہیں کرسکتا۔ اور یہ زمین کا عرش (یعنی قلبِ مومن) ہر وقت خدا تعالیٰ کی رویت میں منہمک رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر اپنا ظہور بخشتا ہے اور آسمانِ کرم سے اس پر نزول فرماتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

مَا وَسِعَنِي سَمٰوٰتِي وَلَا اَرْضِي وَوَسِعَنِي قَلْبُ عَبْدِيَ الْمُؤْمِنُ

ترجمہ: ''اور نہ ہی میرا آسمان مجھے اپنے میں سما سکتا ہے اور نہ ہی میری زمین' البتہ قلبِ مومن مجھے

---

[1] مشابہت۔ تعلق [2] جس میں کسی شے کا حمل ہو۔ لادا گیا، اُٹھایا گیا۔ محمول کے ایک اور معنی ''جس پر قیاس کیا جائے'' کے بھی ہیں۔ جیسا کہ عام مسلمانوں کا قیاس ہے کہ عرش پر اللہ تعالیٰ موجود ہے یا یہ کہ عرش نے اللہ کو اٹھایا ہوا ہے جو کہ سراسر غلط ہے کیونکہ عرش مخلوق ہے اس لیے محدود ہے لہٰذا لامحدود اللہ کو نہ اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے، نہ ہی وہ اللہ کو خود پر اٹھا سکتا ہے۔ [3] برتن [4] تیر رکھنے کا خول۔ تیردان [5] وصول کرنے والا۔ حاصل کرنے والا [6] جسمانی اعضاء ہاتھ پاؤں وغیرہ

اپنے میں سما سکتا ہے''۔

اور پھر عالمِ آخرت میں جنت اور دوزخ کو بنایا گیا اور جنت کو خیر کا' اور دوزخ کو شر کا خزانہ بنایا گیا۔ اسی طرح قلبِ انسانی میں ''سویدا[1] '' صرف بھلائی کا مکان ہے جو بندۂ مومن کے لیے جنت کی مانند ہے کیونکہ وہ محل مشاہدہ وتجلّی[2] ومناجات ومنازل اور منبعٔ انوار ہے اور نفس کو بمنزلہ دوزخ کے بنایا جو منبعِ شر، محلِ وسواس، منزلِ شیاطین اور بیت الظلمت ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے لوح وقلم کو کِتَابُ الْکَوْنِ وَالتَّکْوِیْنِ وَمَا کَانَ وَمَا یَکُوْنُ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ کا نسخہ بنایا اور فرشتوں کو اس نسخہ کے محو واثبات، موت وحیات اور کمی وبیشی کے تحریر کرنے پر مامور فرمایا۔ بعینہٖ زبان بمنزلہ قلم اور سینہ کو بمنزلہ لوح بنایا۔ جو بھی زبان سے نکلتا ہے ذہن اس کو لوحِ صدر پر تحریر کردیتا ہے۔'' (شجرۃ الکون)

غرض یہ کہ انسانی وجود تمام عالمِ خلق کا خلاصہ ہے۔ ہر شے جو عالم میں تفصیلاً موجود ہے انسانی وجود میں اجمالاً موجود ہے، اسی لیے انسان کو عالمِ صغیر کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے عالمِ خلق کی کتاب کی فاتحہ انسان ٹھہرا جس میں تمام عالموں کی تفصیل کو اجمالاً سمو دیا گیا ہے اور انسانوں میں سب سے کامل وجود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہے۔ اس لیے عالمِ امر اور عالمِ خلق دونوں کتابوں میں ''فاتحہ'' کا مقام آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ہے۔ ہر شے جو کسی بھی عالم میں موجود ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی وجود کی کتاب کا مرکز وخلاصہ ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

وَجَمِیْعُ مَا فِی الْکِتَابِ مُفَصَّلٌ فِی الْفَاتِحَۃِ مُجْمَلٌ فَبِاعْتِبَارِ اِجْمَالِ مَا فُصِّلَ فِی الْکِتَابِ فِیْهَا سُمِّیَتْ بِاُمِّ الْکِتَابِ۔

ترجمہ: تمام حقائق جو کتاب میں تفصیلاً بیان کیے وہ فاتحہ میں اجمالاً بیان کیے گئے ہیں۔ پس جو کچھ

---

[1] قلب میں موجود ایک نقطہ [2] جس پر تجلیات کا نزول ہو

کتاب میں تفصیلاً ہے اسے فاتحہ میں اجمالاً بیان کرنے کے اعتبار سے فاتحہ کا نام ''اُم الکتاب'' رکھا گیا۔

شرح: سورۃ فاتحہ قرآن کریم کا خلاصہ ہے لہٰذا جو کچھ تمام قرآن میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے وہ تمام سورۃ فاتحہ میں اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمام قرآن سورۃ فاتحہ کی تفسیر وتشریح ہے اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ تمام قرآن فاتحہ میں پوشیدہ ہے، اس لحاظ سے فاتحہ ''اُم الکتاب'' ہوئی۔

اگر کتاب سے مراد ''قرآنِ کریم'' کی بجائے وجودِ عالم کی کتاب لی جائے تو فاتحہ سے مراد آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات ہے جو تمام عالم کی ابتداء بھی ہیں اور جن میں تمام عالم پوشیدہ بھی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ کی اوّلین تخلیق اور اللہ کے نور کا اوّلین اظہار ہیں۔ آپ ہی کے نور سے تمام عالمِ امر اور تمام عالمِ خلق تخلیق ہوا' اس لحاظ سے تمام عالم آپ ﷺ کی ذات میں اس طرح پوشیدہ ہوا جس طرح تمام درخت ایک بیج میں موجود اور پوشیدہ ہوتا ہے۔ شاخیں' تنے' پتے' جڑیں' پھل پھول' نئے بیج سب ایک بیج سے ہی ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی طرح تمام عالم میں جو کچھ تفصیل کے ساتھ ظاہر ہوا وہ آپ ﷺ کی ذات میں اختصار کے ساتھ لیکن جامع صورت میں اسی طرح موجود ہے جس طرح موجودہ زمانے میں ایک چھوٹی سی ڈسک (disc) یا چپ (chip) میں انتہائی لمبی تفصیلات مکمل لیکن جامع حالت میں موجود ہوتی ہیں۔ فاتحہ کا نام ''اُم الکتاب'' رکھا گیا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جو کتابِ وجود کی فاتحہ ہیں' کا نام اللہ نے 'رحمت اللعالمین' رکھا۔ دونوں ناموں میں کامل مناسبت اور مشابہت پائی جاتی ہے۔ تمام مخلوق نے اللہ کی ''رحمت'' یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سبب سے وجود پایا جس طرح اولاد اپنی ماں کے وجود کے سبب سے وجود پاتی ہے۔ جس طرح ماں اولاد کی غلطیوں کو کھلے دل سے درگزر کرتی اور ان کی پردہ پوشی اور شفاعت کرتی ہے، رحمتِ عالم ﷺ بھی مخلوق کی پردہ پوشی اور شفاعت کرتے ہیں۔

چنانچہ 'اُم' سے مراد ''رحمت'' اور کتاب سے مراد تمام عالم یعنی عالمین ہے اور اُم الکتاب سے مراد

رحمت اللعالمین ہوئے۔اس طرح تمام عالموں کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فاتحہ'اُم الکتاب اور رحمت اللعالمین ہیں اور یہاں اُم الکتاب کے وہی معنی ہیں جو رحمت اللعالمین کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے تمام الہامی کتب میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ''اُم الکتاب'' ہونے کا اشارہ دیا۔ انجیل کا آغاز ان الفاظ سے ہوا ''اَب واُم واِبن''۔ حضرت ابراہیم جیلی رحمتہ اللہ علیہ اپنی تصنیف انسانِ کامل میں فرماتے ہیں: ''انجیل کی ابتداء اسم ''اَب واُم واِبن'' سے ہے جیسا کہ قرآن کی ابتداء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہے۔ان (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی قوم نے اس کلام کو ظاہر پر محمول کیا اور گمان کیا کہ 'اَب' سے مراد روح، ''اُم'' سے مراد مریم اور ''ابن'' سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور کہہ دیا کہ اللہ ان تین میں تیسرا ہے۔ یہ نہ جانا کہ ''اب'' سے مراد ''اسمِ اَللّٰہُ'' ہے اور ''اُم'' سے مراد ''کنہہ ذات'' جو ماہیتِ حقائق کا معبر[1] ہے اور ''ابن'' سے 'کتاب' مراد ہے جو وجودِ مطلق ہے۔'' (انسانِ کامل)

پس انجیل کے آغاز میں بھی اللہ نے وجود کی تخلیق کے مراتب اور ترتیب اسی طرح بیان کی جس طرح قرآن میں۔ جس طرح قرآن کے آغاز میں بسم اللہ ہے اسی طرح انجیل کے آغاز میں ''اب'' ہے۔ ''اب'' میں 'ا' سے اللہ اور ''ب'' سے حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہے کیونکہ ''ب'' حروفِ تہجی کا دوسرا حرف ہے اور ''ب'' کے ہی متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ''بسم اللہ'' کی تفسیر میں فرمایا کہ ''تمام قرآن فاتحہ میں پوشیدہ ہے، تمام فاتحہ ''بسم اللہ'' میں، تمام بسم اللہ ''ب'' میں اور ''ب'' کے نیچے کا نقطہ میں ہوں'' یعنی ب کا نقطہ انسانِ کامل ہے۔ چنانچہ ''ا'' اللہ سے ''ب'' حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظاہر ہوئی جو ''اُم'' یعنی وہ وجود ہے جس میں تمام عالم پوشیدہ ہے جس سے ''ابن'' بمعنی بیٹا یعنی تمام عالم کی کتاب کا وجود پیدا ہوا۔ یوں وجود کی کتاب کا آغاز ''اَب واُم واِبن'' سے ہوا۔ اور ''اُم'' سے یہاں بھی وہی وجود مراد ہے جو 'اُم الکتاب' میں

---

[1] گھاٹ، پُل، دو جگہوں کو جوڑنے والا۔ جیسے ''ماں'' پُل ہے ایک وجود کو عالمِ ارواح سے عالمِ ناسوت تک لانے والا

''اُم'' سے ہے یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وجود۔

☆☆☆☆☆☆

وَبِاعۡتِبَارِ تَفۡصِيۡلِ مَآ اُجۡمِلَ فِيۡهَا فِيۡمَا يَلِيۡ مَرۡتَبَتَهُمَا سُمِّيَتۡ مَرۡتَبَةُ التَّفۡصِيۡلِ بِالۡكِتَابِ الۡمُبِيۡنِ۔

ترجمہ: اور جب اجمال (مختصر لیکن جامع اور مکمل حالت) کی تفصیل (عالموں میں) ظاہر ہوئی تو (حقیقتِ محمدیہ کے) اس تفصیلاً اظہار کے اعتبار سے (اسی حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نام) مرتبہ تفصیل بالکتاب المبین رکھا گیا۔

شرح: مبین کا لغوی معنی روشن' کھلا اور بیان کرنے والا کے ہیں۔ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب نورِ الٰہی سے جدا ہوا تو بیج کی مانند تھا جس میں تمام عالموں کا شجر پوشیدہ تھا۔ اس وقت اس میں تمام عالموں کی تفصیل جامع' مختصر لیکن مکمل حالت میں موجود تھی جس طرح بیج میں تمام درخت مختصر لیکن مکمل حالت میں چھپا ہوتا ہے۔ اس وقت اس کا نام 'اُم الکتاب' تھا یعنی ایسا وجود جس کے بطن میں تمام عالم کی کتاب چھپی ہوئی حالت میں موجود ہے لیکن جب اسی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بدولت مخلوق ظاہر ہونے لگی یعنی اسی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بیج سے شجرِ عالم پھوٹنے لگا تو یہ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس شجرِ عالم کے ہر رگ و ریشے سے تفصیلاً ظاہر ہونے لگا۔ جس طرح درخت کچھ نہیں سوائے بیج کے تفصیلی اظہار کے، اسی طرح تمام عالم کچھ نہیں سوائے نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تفصیلی اظہار کے۔ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس عالم میں تفصیلاً اظہار کے اعتبار سے اسی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نام اب مرتبہ تفصیل میں کتابِ مبین رکھا گیا۔ جب تمام عالم اس میں اجمالاً پوشیدہ تھا تو یہ اُم الکتاب تھا۔ اب تمام عالم اسی کی بدولت ظاہر ہوا تو اس کا نام کتابِ مبین رکھا گیا یعنی کھلی ہوئی روشن کتاب جس میں ہر اجمال اور پوشیدہ شے کو کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔

سورۃ یٰسین میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: '' وَكُلَّ شَيۡءٍ اَحۡصَيۡنٰهُ فِيۡۤ اِمَامٍ مُّبِيۡنٍ ''

ترجمہ: اور ہم نے ہر شے (عالمِ امر اور عالمِ خلق کی) کو جمع کر رکھا ہے امام مبین میں۔(یٰس:12)

یہاں امام مبین سے مراد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مبارکہ ہی ہے جن میں تمام عالموں کی ہر شے جمع ہے اور جن کے ذریعے ہر شے اپنے اپنے جہان میں ظاہر ہوئی۔

☆☆☆☆☆☆

وَكُلُّ مَوْجُودٍ حَرْفٌ بِاعْتِبَارٍ وَّكَلِمَةٌ بِاعْتِبَارٍ وَّ مُفْرَدٌ وَّمُقَطَّعٌ بِاعْتِبَارٍ وَّ اَلْفَاظٌ مُرَكَّبٌ بِاعْتِبَارٍ وَّسُوْرَةٌ بِاعْتِبَارٍ۔

ترجمہ: اور ہر موجود (شے) ایک اعتبار سے حرف ہے اور دوسرے اعتبار سے کلمہ ہے، ایک اعتبار سے وہ (موجود) مفرد[1] اور مقطعہ[2] ہے اور دوسرے اعتبار سے مرکب اور سورۃ ہے۔

شرح: جس طرح سمندر سے نکلنے والا ہر قطرہ وہی خصوصیات رکھتا ہے جو خود سمندر کی ہیں کیونکہ سمندر بھی پانی ہے اور قطرہ بھی پانی ہے' اسی طرح سیاہی سے وجود پانے والے تمام حروف بھی اگرچہ مختلف شکلوں میں ڈھلے ہوئے ہیں لیکن سیاہی کے سوا کچھ نہیں۔ ہر حرف صرف سیاہی ہی کی مختلف شکل ہے۔ اسی کلیے کے مطابق نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے وجود پانے والی تمام اشیاء اگرچہ اس جہان میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئیں لیکن وہ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سوا کچھ نہیں خواہ بظاہر وہ کچھ بھی شکل رکھتی ہوں۔

علامہ ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''وجود کے حقائق اور اس کی برکت آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وجود کے ذرات ہیں۔'' (شجرۃ الکون)

جس طرح ہر قطرے کا وجود سمندر کے مقابلے میں صرف ایک چھوٹا سا قطرہ ہی ہے لیکن اس قطرے کو اگر خوردبین کے نیچے دیکھا جائے تو وہ قطرہ خود اپنے اندر ایک سمندر چھپائے ہوئے ہے اسی طرح نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے وجود پانے والی ہر شے اگرچہ مکمل جامع نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے

---

[1] واحد، ایک، غیر مرکب۔ جس کا جوڑا نہ ہو۔ [2] حروف مقطعات سے۔ وہ حروف جو قرآن کی بعض سورتوں کے آغاز میں آتے ہیں جیسے الٓمٓ۔ حٰمٓ۔

مقابلے میں ایک چھوٹے سے ذرے یا قطرے کی مانند ہے لیکن وہ اپنے اندر خود مکمل نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور اس کی تمام صفات رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے اگر وہ ایک طرف صرف ایک حرف کی مانند ہے تو دوسری طرف ایک مکمل کلمہ بھی ہے۔ اگر بظاہر دیکھا جائے تو وہ شے اتنے بڑے جہان میں صرف ایک چھوٹا سا واحد وجود ہے لیکن اگر اس کے باطن میں دیکھا جائے تو وہ اپنے اندر ایک پورا جہان رکھتی ہے۔ ایک انسان بظاہر ایک چھوٹا سا وجود ہے لیکن اس کے اندر جو روحِ قدسی موجود ہے وہ اللہ سے ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا کہ:

وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (الحجر۔29)

ترجمہ: اور میں نے اس میں اپنی روح پھونکی۔ اور فرمایا:

اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ترجمہ: "ان کی مدد "اپنی روح" سے کی" (المجادلہ۔22)

چنانچہ اللہ کی پوری ذات اس واحد انسان کے اندر موجود ہے حالانکہ بظاہر وہ ایک چھوٹا سا انسان ہے۔ جس وجود میں مکمل ذاتِ الٰہی موجود ہو وہ قطرہ ہو کر بھی سمندر، حرف ہو کر بھی مکمل کلمہ ہے۔ رسالہ غوثیہ میں اللہ تعالیٰ حضور غوث الاعظم رضی اللہ عنہ سے فرماتا ہے۔ "اے غوث الاعظم (رضی اللہ عنہ) انسان نہ کچھ کھاتا ہے نہ پیتا ہے، نہ اٹھتا ہے نہ بیٹھتا ہے نہ بولتا ہے نہ سوتا ہے نہ جاگتا ہے لیکن یہ کہ اس میں میں ہوتا ہوں۔" قرآن میں اللہ فرماتا ہے کہ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝ (سورۃ ق۔16) "اور ہم تو شہ رگ سے بھی نزدیک ہیں۔" اور فرماتا ہے وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ (سورۃ الانفال۔24) "اور جان لو بے شک اللہ انسان کے جسم اور قلب کے درمیان حائل ہے" مزید فرماتا ہے کہ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (سورۃ الذاریٰت۔21) "میں تمہارے اندر ہوں کیا تم نہیں دیکھتے۔"

چنانچہ انسانی باطن میں اللہ کی موجودگی کے لحاظ سے انسان کو عالمِ کبیر کہا گیا۔ حضرت مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

پس بصورت عالمِ صغریٰ توئی
پس بمعنی عالمِ کبریٰ توئی

ترجمہ: ’’جسمانی لحاظ سے تو ایک چھوٹا سا جہان ہے لیکن حقیقت میں تو ہی جہانِ کبیر ہے۔‘‘ آپ رحمتہ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں:

آدمی راہست حِس تن سقیم
لیک دو باطن یکے حق عظیم

ترجمہ: انسان جسمانی حواس کے نظریہ سے حقیر و ہیچ ہے مگر باطن میں عالمِ عظیم ہے۔

انسان کے باطن میں ہی تمام عالم پوشیدہ ہیں۔ وہ اپنے باطن میں ہی سفر کر کے عالم لاہوت لامکان تک پہنچ جاتا ہے اور اپنے باطن میں ہی ذاتِ حق تعالیٰ سے ملاقات اور اس کا دیدار کرتا ہے۔ یوں انسان مفرد یعنی واحد وجود رکھنے کے باوجود مرکب یعنی ایک سے زیادہ وجود رکھتا ہے۔ ایک ظاہری وجود اور ایک باطنی وجود اور باطنی وجود میں بھی کئی عالم پنہاں ہے۔ سو وہ مفرد ہو کر بھی مرکب ہے۔

قرآن کریم کی کچھ سورتوں کا آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے جیسے الٓمٓ، حٰمٓ، یٰسٓ، طٰہٰ، حٰمٓعٓسٓقٓ، قٓ۔ ان حروف کے معنی صرف اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یا ان کے باطنی خلفاء اور وارثینِ فقر ہی جانتے ہیں یا وہ جن پر اللہ ان کے معنی کو کھول دے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ہر وجود کو ایک اعتبار سے حرفِ مقطعہ کہہ رہے ہیں اور ایک اعتبار سے پوری سورۃ۔ ہر وجود اپنے باطن کے اعتبار سے حرف مقطعہ ہے کیونکہ اس کے باطنی وجود کی حقیقت سے اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور جن پر اللہ خود اس کی حقیقت کھول دے، اور کوئی واقف نہیں۔ اس کی حقیقت عام لوگوں کی نظر سے اوجھل ہے جس طرح حروفِ مقطعات کی حقیقت لوگوں سے پوشیدہ رکھی گئی ہے۔ جبکہ پوری سورۃ سے مراد اس وجود کی پوری حیاتِ دنیاوی و اخروی کا بیان ہے جس کے کچھ حصے سب پر ظاہر ہیں اور کچھ پوشیدہ، جیسے کہ ایک سورۃ کی آیات کے ظاہری معنی سب پر ظاہر ہیں اور حقیقی معنی صرف خاص الخاص لوگ جانتے ہیں۔

حروف مقطعات ہر سورۃ کے آغاز میں آئے ہیں اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہر وجود اپنے بعد آنے والی زندگی کا آغاز ہونے کی بنا پر حرفِ مقطعہ ہے۔ ہر پودا اپنے بعد آنے والے اپنے جیسے

پودوں کی ابتدا ہے۔ اسی کے بیج سے اس کی اگلی نسل چلے گی۔ اسی طرح انسانوں اور حیوانوں میں بھی ہے۔ لیکن اس وجود کی اپنی زندگی بھی ایک مکمل باب ہے۔ اس کا پیدا ہونا' نشوونما اور ترقی پانا' اپنے وجود سے دوسروں کو فیض یاب کرنا' اپنے اس دنیا میں آنے کے مقصد کے مطابق کام کرنا' اپنے بعد آنے والی زندگی کا آغاز کرنا اور پھر اس عالمِ ناسوت سے چلے جانا۔ اس طرح وہ ایک پوری سورۃ کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ہر مخلوق کا وجود کتابِ زندگی میں اپنی ہی نسل کے باب (سورۃ) کا آغاز بھی ہے اور خود پورا باب بھی۔

☆☆☆☆☆☆

لِاَنَّآ اِذَا نَظَرْنَا فِیْ ذَاتِ کُلِّ مَوْجُوْدٍ مِنْ غَیْرِ اَنْ نَنْظُرَ فِیْ وَجُوْھِھَا وَخَوَاصِھَا وَعَوَارِضِھَا وَلَوَازِمِھَا مُجَرَّدَۃٌ عَنِ الْکُلِّ فَبِاعْتِبَارِ تَجَرُّدِھَا عَنِ الْکُلِّ سَمَّیْنَاھَا حَرْفًا وَ اِذَا نَظَرْنَا اِلٰی وُجُوْھِھَا وَخَوَاصِھَا وَعَوَارِضِھَا وَلَوَازِمِھَا وَاَضَفْنَاھَا اِلَیْھَا۔

ترجمہ: اس لیے کہ جب ہم ہر موجود کے (پیدا ہونے کی) وجوہ اور اس کی خصوصیات اور عوارض[1] اور اس کے لوازم[2] پر نظر ڈالے بغیر صرف اس کے اندر موجود ذاتِ الٰہی پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ مجرد[3] ہے کُل سے۔ سو اس کے کُل سے مجرد ہونے کی بنا پر اس کا نام حرف رکھتے ہیں اور جب ہم اس کے (پیدا ہونے کی) وجوہ اس کی خصوصیات' خامیاں اور لوازم پر نظر ڈالتے ہیں اور اس کی ذات کو ان تمام باتوں سے منسوب کرتے ہیں تو کُل کی نسبت سے اسے ''کلمہ'' کا نام دیتے ہیں۔

شرح: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ پچھلی عبارت کی تفصیل بیان کرتے ہیں کہ جب ہم اشیائے عالم کے اس دنیا میں پیدا ہونے کے مقاصد' اسباب اس کی خامیوں اور خوبیوں سے قطع نظر کر کے

---

[1] خامیاں۔ عارضہ کی جمع' بیماریاں' کمیاں [2] لازمہ کی جمع۔ ضروری چیزیں' ایسی چیزیں جو ایک وجود کے پیدا ہونے اور قائم رہنے کے لیے ضروری ہیں۔ اسباب [3] مادہ سے پاک۔ اکیلا۔ تنہا

صرف اس کے باطن پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ مادہ سے پاک (مجرد) ہے اور کُل یعنی ذاتِ الٰہی یا نور محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سمندر سے وجود پانے کی بنا پر ایک قطرہ یا اس سیاہی سے وجود پانے والا ایک حرف ہے۔ لیکن جب ان تمام باتوں یعنی اس کے وجود کے اس دنیا میں آنے کے مقاصد' اسباب' اس کی خامیوں اور خوبیوں کو بھی مدنظر رکھتے ہیں تو وہ خود پورا ایک کلمہ ہے۔ جس کے کئی پہلو ہیں۔

کائنات کی ہر شے کا جوہر یا بنیادی وجود نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے جو نورِ الٰہی سے مشتق ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی اس زمانے میں ضرورت اور مقصد کے مطابق اس کو ظاہری وجود دیا۔ ہر مخلوق جس مقصد کو پورا کرنے کے لیے تخلیق کی گئی اس کا ظاہری جسم اسی کے مطابق ڈھالا گیا۔ چاند' سورج' پودے' حیوان' مرد' عورت' حشرات العرض ہر شے کا جسم اس کے پیدا ہونے کی وجوہات کو مدِنظر رکھ کر بنایا گیا۔ مرد اور عورت دونوں انسان ہیں۔ دونوں کے باطن میں ایک ہی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے لیکن ان کی دنیا میں ذمہ داریوں کے حساب سے ان کے وجود تخلیق کیے گئے۔

ہر جاندار و بے جان کے دنیا میں تخلیق ہونے کے اسباب بھی مختلف ہیں۔ کچھ جاندار بیج سے پیدا ہوتے ہیں، کچھ ماں کے پیٹ سے' کچھ انڈے سے' کچھ اشیاء قدرتی طور پر زیرِ زمین بنتی ہیں مثلاً معدنیات' دھاتیں وغیرہ' کچھ کو انسان خود خام مال سے بناتا ہے۔ یعنی جس طرح ہر شے کی تخلیق کے مقاصد الگ الگ ہیں اسی طرح اس کی تخلیق کے اسباب بھی الگ ہیں اور اسی طرح ہر شے کی خوبیاں اور خامیاں بھی دوسری اشیاء سے اسے ممتاز اور منفرد کرتی ہیں۔ اگر ہم ظاہری آنکھ سے نظر آنے والی ان تمام باتوں کو' جو اس دنیا کی رنگا رنگی اور اس کا نظامِ حیات چلانے کے لیے ضروری تھیں، قطع نظر کر کے صرف ان اشیاء کے باطنی وجود پر نظر ڈالیں تو وہاں انہیں ایک دوسرے سے ممتاز کرنے والی کوئی شے نہیں ہے بلکہ تمام اشیاء کا جوہر ایک ہی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے جو ''مجرد'' یعنی مادہ سے پاک وجود ہے۔ اس نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سمندر کا ایک پاک قطرہ ہونے کی بنا پر ہر شے ایک حرف ہے۔ لیکن اگر ہم اس کے باطن کے ساتھ ساتھ اس کے ظاہر پر بھی نظر ڈالیں تو اس ایک ذات یا اس ایک شے میں اس کی خامیوں' خوبیوں' دنیا میں اس کے آنے کے

اسباب اور مقاصد کی بنا پر اس قدر رنگا رنگی اور کثرت دکھائی دے گی کہ ہم اسے ایک حرف نہیں بلکہ پورا کلمہ کہیں گے۔

☆☆☆☆☆☆

وَبِاعْتِبَارِ تَجَرُّدِ کُلِّ مَوْجُوْدٍ عَنِ الْمُضَافَاتِ وَالْمَنْسُوْبَاتِ وَتَمِیْزِ بَعْضِھَا عَنْ بَعْضٍ سُمِّیَتْ حُرُوْفًا مُّقَطَّعَۃً مُّفْرَدَۃً وَبِاعْتِبَارِ عَدَمِ تَجَرُّدِھَا عَنِ الْمُضَافَاتِ وَالْمَنْسُوْبَاتِ وَ عَدَمِ تَمِیْزِ بَعْضِھَا عَنْ بَعْضٍ بَلْ تَدَخُلِ بَعْضِھَا فِی الْبَعْضِ سُمِّیَتْ اَلْفَاظًا مُّرَکَّبَۃً وَبِاعْتِبَارِ تَمِیْزِ کَلِمَاتِ نِ الْمُرَکَّبِ بَعْضُھَا عَنْ بَعْضٍ وَّوَقُوْعِ کُلِّ مَوْجُوْدٍ فِیْ مَرْتَبَۃٍ سُمِّیَتْ سُوْرَۃً۔

ترجمہ: اور جب ہر موجود کو اس کے مضافات[1] اور منسوبات[2] اور اس کو دوسروں سے ممتاز کرنے والے عوامل سے آزاد یا جدا کر کے دیکھا جائے تو وہ حروفِ مقطعہ ومفردہ ہے اور اگر اسے اس کے منسوبات اور مضافات سے اور دوسرے سے متمیز کرنے والے عوامل سے مجرد (آزاد علیحدہ) کر کے نہ دیکھا جائے بلکہ بعض کے بعض سے تعلقات (جو ان کی حیات میں داخل ہیں) کے اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ مرکب الفاظ ہیں اور ان مرکب الفاظ کے بعض کے بعض سے فرق اور ان کے مختلف مراتب میں موجود ہونے کے باعث ان کا نام سورۃ رکھا گیا ہے۔

شرح: کائنات کا ہر وجود ایک خاص مقام پر موجود ہے یا مقید ہے۔ چاند سورج ستارے زمین فضا میں اپنی اپنی جگہ موجود ہیں۔ انسان جانور پودے معدنیات دریا سمندر پہاڑ زمین میں اپنی اپنی جگہ رہتے ہیں۔ یوں ہر وجود چار سمتوں یا اطراف میں قید ہے جسے مکان کہتے ہیں۔ جبکہ اللہ

---

[1] اردگرد کے ماحول، ہر شے کے رہنے کی جگہ [2] تعلقات۔ جن جن اشیاء سے ایک شے جڑی ہے یا تعلق رکھتی ہے

مکان سے بالاتر ہے وہ کسی سمت میں قید نہیں، ہم اسے کسی جسم میں مقید قرار نہیں دے سکتے۔ اجسام جن مقامات پر موجود ہیں وہ ان کے ''مضافات'' ہیں۔ اسی طرح کائنات کی تمام موجودات میں ایک باہمی ربط اور کشش ہے جو انہیں ان کے مقام پر ٹکے رہنے میں مدد دیتی ہے۔ چاند' سورج' ستاروں اور زمین کی آپس کی کشش انہیں ان کی جگہوں پر باندھے رکھتی ہے اور وہ اپنی حد سے تجاوز نہیں کرتے۔ زمین کی کشش زمین پر موجود مخلوق کو باندھے رکھتی ہے۔ تمام مخلوق کے آپس کے یہ تعلقات ''منسوبات'' کے زمرے میں آتے ہیں۔ انسانوں اور جانوروں کے آپس کے رشتے اور تعلق بھی ان کے منسوبات ہیں جن سے بندھے رہ کر وہ اس دنیا کی زندگی گزارتے ہیں۔ لیکن ذاتِ الٰہی ایسے تمام تعلقات، منسوبات، مضافات اور بندھنوں سے بے نیاز ہے۔

ہر جاندار یا بے جان شے کی ہیئت' خصوصیات اور اس کے وجود کے مقاصد اسے دوسری موجودات سے ممتاز کرتے ہیں۔ ہم دنیا میں ان کی شناخت اور پہچان ان کی شکل وصورت' خصوصیات اور استعمال کی بنا پر کرتے ہیں اور یہی عوامل ہر شے کو دوسری شے سے الگ حیثیت' مقام اور شناخت دیتے ہیں اور ایک کو دوسری سے ممتاز کرتے ہیں۔ یہ سب اہتمام دنیا میں انسان کی سہولت کے لیے کیا گیا۔ ورنہ باطنی وجود تو ہر شے کا ایک ہی ہے' الگ الگ جسم انہیں ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں تا کہ وہ پہچانے جائیں۔ اسی طرح تمام انسانوں کی الگ الگ صورتیں' قبیلے اور نسلیں وغیرہ ان کی شناخت کے لیے بنائی گئی ہیں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ جسم' صورت سے پاک ہے۔ وہ کائنات کے ہر ذرے اور ہر جسم میں موجود ہو کر بھی اپنا علیحدہ ایسا خاص وجود رکھتا ہے جس کا کوئی جسم نہیں جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ''اللہ ہر شے کے ساتھ ہے لیکن مل کر نہیں، ہر چیز سے الگ ہے لیکن جدائی کی بنیاد پر نہیں'' (نہج البلاغہ)۔ چنانچہ جب ہم موجودات کو ان کے اس دنیا میں موجودگی کے مقام (مضافات)' اس کے دوسری موجودات سے تعلقات (منسوبات) اور ان کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنے والے عوامل سے قطع نظر کر کے ان کے حقیقی وجود پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ حروفِ مقطعہ مفردہ ہیں یعنی ایسا وجود ہیں جو سب سے جدا' علیحدہ' یکتا'

تنہا ہے اور ایسا وجود ہے جس کی حقیقت کو سمجھنا اللہ اور اس کے محبوبین کے سوا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ یہ تمام اجسام' مضافات' منسوبات اور بعض کو بعض سے ممتاز کرنے والے عوامل صرف اس جہانِ جسم کے لیے عارضی طور پر تیار کیے گئے۔ اصل ذات ازل سے ابد تک ایک ہی ہے جو مفرد (واحد) ہے اور جس کی ہیئت کو سمجھنے کے لیے عقل کے ہزاروں ہزار قافلے سنگسار ہو گئے لیکن سمجھ نہ پائے۔

جب ہم موجوداتِ عالم کو ان کے مضافات، منسوبات اور بعض کو بعض سے ممتاز کرنے والے عوامل کے ساتھ دیکھتے ہیں تو ہر موجود بہت سی چیزوں کا مرکب نظر آتا ہے۔ اس کی آسان ترین مثال خود انسان کا وجود ہے۔ بحیثیت ایک انسان وہ واحد وجود ہے جو دوسروں سے منفرد اور مختلف ہے۔ لیکن وہی ایک انسان واحد ہوتے ہوئے بھی ہاتھ' پاؤں' آنکھ' ناک' کان' جسم' روح' نفس وغیرہ کا مرکب ہے۔ یوں وہ ایک لحاظ سے مفرد ہے ایک لحاظ سے مرکب۔ تمام دنیا کے انسان ایک دوسرے سے جدا ہو کر بھی ایک ہی جیسے ہیں۔ ہر ایک میں وہی ہاتھ' پاؤں' آنکھ' ناک' کان' جسم' روح' نفس وغیرہ موجود ہیں۔ اسی طرح دنیا کی ہر شے مفرد بھی ہے، مرکب بھی ہے۔ ان تمام مرکب الفاظ یعنی موجوداتِ عالم کو ان کے آپس کے تعلقات' ضروریات' منسوبات کے حساب سے جوڑا جائے تو یہ الفاظ سے کلمے اور کلموں سے سورتیں بن جاتے ہیں۔ اس طرح یہ اپنے منسوبات اور مضافات کے بغیر تو مفرد لفظ ہیں لیکن ان منسوبات اور مضافات کے ساتھ ایک پوری سورت ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

فَاِذَا فَهِمْتَ هٰذَا فَاعْلَمْ اَيْضًا اَنَّ الْحَقَّ مَبْدَءُ الْكُلِّ وَمَعَدُهٗ وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ وَلَابُدَّ اَنْ يَّكُوْنَ الْكُلُّ فِيْهِ قَبْلَ كَوْنِهٖ وَلَا بُدَّ اَنْ يَّكُوْنَ فِي الْكُلِّ هُوَ۔

ترجمہ: پس جب تو نے یہ سب سمجھ لیا تو معلوم کر یہ بھی کہ پروردگار مبدا ہے کُل کا اور ہر امر کو اسی

کی طرف لوٹنا اور اسی کی طرف رجوع کرنا ہے اور اللہ کی ہی طرف عاقبت ہے ہر امر کی اور ضروری ہے کہ ہر شے (اپنا وجود پانے سے) پہلے اس (ذاتِ الٰہی) میں موجود ہو اور ضروری ہے کہ ہر شے میں وہ (ذاتِ الٰہی) موجود ہو۔

شرح: جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا کہ ہر شے کا وجود ذات الٰہی سے ہے۔ اللہ ہی وہ ذات ہے جو ہمیشہ سے موجود ہے جسے اپنے وجود کے لیے کسی دوسرے وجود کی ضرورت نہیں۔ اس کے سوا ہر شے اپنے وجود کے لیے کسی دوسرے وجود کی محتاج ہے اور وہ وجود کسی اور وجود کا محتاج ہے اور وہ کسی اور کا، یوں بالآخر ان سب کو کسی ایسے وجود کی ضرورت ہے جو از خود قائم ہو اور کسی اور کا محتاج نہ ہو اپنے وجود کے لیے۔ وہ وجود صرف ذاتِ الٰہی ہی ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ''میں اللہ کے نور سے ہوں اور تمام مخلوق میرے نور سے ہے۔'' یعنی نورِ محمدی ﷺ کا مبدا (ابتداء) نورِ الٰہی ہے اور باقی تمام مخلوق کا مبداء نورِ محمدی ﷺ ہے۔ اس طرح اصل مبداء ہر مخلوق کا نورِ الٰہی ہی ہوا۔ ہر شے اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اَلنِّهَايَةُ الرُّجُوْعُ اِلَى الْبِدَايَةِ ''انتہا ابتداء کی طرف لوٹ جانا ہے۔'' ہر مخلوق کی انتہا اور اس کے ظاہری وجود کا اختتام و انجام واپس ذاتِ الٰہی کی طرف لوٹ جانا ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ترجمہ: ''بے شک ہم سب اللہ ہی کی طرف سے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہم سب کو لوٹ کر جانا ہے'' اور فرمایا گیا کہ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى (النجم۔42) ترجمہ ''ہر چیز کی انتہا اللہ کی طرف ہے۔''

ہر شے اپنا وجود پانے سے پہلے یعنی عدم میں اس حیثیت سے موجود تھی کہ چونکہ اس کا وجود اللہ تعالیٰ سے ہے اس لیے وہ ذاتِ الٰہی میں اسی طرح موجود تھی جس طرح الفاظ صفحے پر بکھرنے سے پہلے سیاہی میں موجود ہوتے ہیں۔ جب یہ الفاظ صفحے پر ظاہر ہوتے ہیں تو ان کی ظاہری شکل میں سیاہی ہی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ الفاظ یا موجودات اپنا وجود حاصل کرنے سے پہلے سیاہی میں موجود تھے اور وجود حاصل کر لینے کے بعد سیاہی ان میں موجود ہو گئی۔ اگر ان

الفاظ کو صفحۂ (عالم) سے دھو کر یا کسی اور ذریعے سے علیحدہ کر دیا جائے تو یہ اپنی ظاہری شکل و صورت کھو دیں گے اور واپس مائع سیاہی کی صورت اختیار کر کے سیاہی میں واپس چلے جائیں گے۔ چنانچہ ہر شے کی عاقبت ذاتِ الٰہی کی طرف لوٹ جانا ہے، جب وہ اپنے ظاہری جسمانی وجود سے آزاد ہو چکی ہو گی اور اپنے حقیقی وجود کی طرف لوٹ جائے گی۔

☆☆☆☆☆☆☆

اِذَا ثَبَتَ اَنَّهٗ كَانَ وَلَا شَئَ مَعَهٗ وَهُوَ الْاٰنَ كَمَا كَانَ فَذَاتُ الْحَقِّ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى بِاِعْتِبَارِ اِنْدِرَاجِ الْكُلِّ فِيهَا هِيَ اُمُّ الْكِتٰبِ وَعِلْمُهٗ هُوَ الْكِتَابُ الْمُبِيْنُ۔

ترجمہ: جب ثابت ہو چکا یہ کہ وہ تھا اور نہ تھی کوئی چیز ساتھ اس کے' اور اب بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ تھا۔ پس ذات پروردِگار کی جو پاک ہے اور بلند ہے، ہر ایک (موجود) کے اس میں درج ہونے کے اعتبار سے وہ اُم الکتاب ہے اور علم اس کا وہ ''کتابِ مبین'' ہے۔

شرح: یہ تو ثابت ہو چکا کہ ہر شے کا اصل اور مبداء اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جیسا کہ وہ خود قرآن کریم میں فرماتا ہے: سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (سورۃ حٰم السجدہ۔53) ترجمہ: عنقریب ہم اپنے نشان عالم میں اور خود ان کے نفسوں میں دکھائیں گے حتیٰ کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ (سب) ''حق'' ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے نہ حدود ہیں نہ قیود اور نہ ہی توصیفی کلمات، نہ مقررہ وقت ہے اور نہ آخری مدت۔ اس نے تمام مخلوقات کو صرف اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا کیا ہے اور پھر اپنی رحمت سے ہی ہوائیں چلائی ہیں اور زمین کی حرکت کو پہاڑوں کی میخوں سے سنبھال رکھا ہے۔ دین کا آغاز اس کی معرفت سے ہے اور معرفت کا حقیقی عروج اس (کے وجود) کی قلبی تصدیق سے ہے۔ تصدیق کا عروج توحید کا اقرار ہے اور توحید کا حقیقی کمال اخلاص

ہے اور اخلاص کا کمال اللہ تعالیٰ کے سوا ہر ذات (کے وجود) کی نفی ہے کہ صفت کا مفہوم خود ہی گواہ ہے کہ وہ موصوف سے الگ کوئی شے ہے اور موصوف کا مفہوم یہی ہے کہ وہ صفت کے علاوہ کوئی ذات ہے۔ اس کے لیے الگ سے صفات کا اثبات ایک شریک کا اثبات ہے اور اس کا لازمی نتیجہ ذات کا تعدد ہے اور تعدد کا مقصد اس کے لیے اجزاء کا عقیدہ ہے اور اجزاء کا عقیدہ صرف جہالت ہے معرفت نہیں۔ جو بے معرفت ہو گیا اس نے اشارہ کرنا شروع کر دیا اور جس نے اس کی طرف اشارہ کیا اس نے اسے ایک سمت میں محدود کر دیا اور جس نے اسے محدود کر دیا اس نے اسے گنتی کا ایک شمار کر لیا جو کہ معدود ہے۔ جس نے یہ سوال اٹھایا کہ وہ کس چیز میں ہے؟ اس نے اسے کسی ضمن میں قرار دے دیا، جس نے کہا کہ وہ کس کے اوپر قائم ہے؟ اس نے اس کے نیچے کا علاقہ خالی کرا لیا۔ اس کی ہستی حادث نہیں ہے اور اس کا وجود عدم کی تاریکیوں سے نہیں نکلا''۔ (نہج البلاغہ)

وہ واحد ہے اور ہمیشہ سے قائم و دائم ہے۔ موجوداتِ عالم، جنہوں نے اپنا وجود اللہ سے پایا' میں کچھ نجس ناپاک' کریہہ مخلوقات بھی شامل ہیں لیکن ان کی ظاہری و باطنی نجاست و ناپاکی ذاتِ الٰہی میں کوئی بھی تبدیلی یا ناپاکی پیدا کرنے سے قاصر ہے۔

جس طرح آفتاب ہر وجود کے لیے باعثِ حیات ہے لیکن اس وجود کی نجاست سے آفتاب کی نورانیت میں کوئی تغیر اور نقصان واقع نہیں ہوتا یا جس طرح آئینہ میں مختلف رنگ دکھائی تو دیتے ہیں مگر وہ آئینے کی رنگت تبدیل نہیں کر سکتے۔ آئینے میں ہر نجس و پاک شے کا عکس دکھائی دیتا ہے لیکن اس کا آئینے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسی طرح اللہ کے انوار ہر قسم کے تغیر و تبدل سے ماورا[1] ہیں۔ اللہ تعالیٰ منزہ[2] و مبرا[3] ہے اپنی ذات میں کسی بھی قسم کی تبدیلی سے۔ وہ جیسا پاک ازل میں ہے ویسا ہی ابد میں ہے جیسا کہ فرمایا گیا: وَهُوَ الْاٰنَ كَمَا كَانَ ترجمہ: ''وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ وہ تھا''۔ اس کی تمام صفات ناقابلِ تبدیل ہیں۔ اشیائے عالم کی نجاست و ناپاکی کہیں تو ان کے اس جہان میں کردار (role) کے مطابق ان کی ضرورت ہے اور کہیں ان کے نفس و شیطان کی پیدا کردہ

1۔ بالا۔ اعلیٰ 2۔ پاک 3۔ بے عیب۔ صاف

ہے لیکن یہ نجاست وناپاکی ذاتِ حق تعالیٰ پر اثر انداز ہونے کی قوت یا اہلیت نہیں رکھتی۔ ذاتِ حق تعالیٰ اشیائے عالم کا کسی بھی قسم کا اثر قبول کرنے سے منزہ ہے۔ وہ موجودات پر اپنی تجلیات کے ذریعے اثر ڈالتا ہے' ان سے اثر لیتا نہیں ہے۔ اس لیے وہ جس پاک حالت میں ہمیشہ سے موجود تھا اسی میں اب ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اشیاء پر اس دنیا میں وقت' حالات' تعلقات' ضروریات اور دیگر بہت سے عوامل اثر کرتے ہیں اور ان کی حالت کو تبدیل کرتے رہتے ہیں لیکن اللہ ان سب عوامل سے پاک ہے۔ اس لیے موجودات کی ظاہری وباطنی حالت کچھ بھی ہو، ان میں موجود ذاتِ الٰہی کی حالت تبدیل نہیں ہوتی۔ وہ پاک' عظیم ترین اور بلند ترین ہے۔

اشیائے عالم کے اللہ کی ذات میں پوشیدہ ہونے کے سبب وہ ''اُم الکتاب'' ہے۔ یعنی ایسا وجود جو عالم کو پیدا کرنے والا ہے۔ ازل میں جب اللہ تعالیٰ نے نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خود سے جدا کیا تو اس لطیف نور کے آئینے میں اپنی ہی ذات کو ملاحظہ کیا اور اس کا نام محمد' احمد (تعریف کیا گیا) رکھا۔ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نورِ الٰہی سے جدا ہونے سے نعوذ باللہ یہ مراد نہیں کہ نورِ الٰہی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ذاتِ الٰہی تقسیم سے پاک ہے۔ جس طرح روشنی اور خوشبو کو علیحدہ علیحدہ تقسیم نہیں کیا جا سکتا، اس طرح نور کو بھی بانٹا نہیں جا سکتا۔ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نورِ الٰہی سے یوں جدا ہوا جیسے ''علم'' ایک شخص (استاد) سے دوسرے شخص (طالبِ علم) میں منتقل ہوتا ہے۔ جس وجود سے علم دوسرے وجود میں منتقل ہو رہا ہوتا ہے وہاں علم میں کوئی کمی بیشی یا تبدیلی نہیں آتی۔ اور وہ جیسا پہلے وجود میں ہے بعینہٖ دوسرے وجود میں بھی منتقل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ''علم'' کی صورت نورِ الٰہی سے جدا ہوا۔ جس طرح سکھانے والے اور سیکھنے والے دونوں کے پاس علم کی ایک ہی صورت و حالت ہوتی ہے اسی طرح نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور نورِ الٰہی کی ایک ہی صورت وحالت ہے۔ اسی لیے نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو آئینہ کی مانند قرار دیا گیا جس میں ذاتِ الٰہی کو اپنی ہی صورت دکھائی دی۔

تمام عالم کے لیے نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یا ذات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ''اُم الکتاب'' ہے اور نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے نورِ الٰہی یا ذاتِ الٰہی اُم الکتاب ہے۔ اس اُم الکتاب سے جب نور' علم' کی

صورت ذاتِ محمد ﷺ میں منتقل ہوا تو اس نور سے عالم کی ابتداء ہوئی اور نورِ الٰہی تمام عالم میں پھیلا اس لحاظ سے ذاتِ محمد ﷺ کتابِ مبین ہے کہ یہ کتاب کھلی تو تمام عالم میں نورِ الٰہی ظاہر اور روشن ہوا اور اس پوشیدہ نور نے بیان پایا۔

بِاِعْتِبَارِ تَفْصِیْلِ مَا اَنْدَرَجَ فِی الذَّاتِ الَّتِیْ قُلْنَا فِیْهَا اِنَّهٗ اُمُّ الْكِتَابِ وَظُهُوْرُ مَا كَمَنَ فِیْهَا فَعِلْمُهٗ بِذَاتِهٖ مُسْتَلْزِمٌ لِعِلْمِهٖ بِجَمِیْعِ الْاَشْیَآءِ اِذَا جَمِیْعُ الْاَشْیَآءِ كَانَتْ مُنْدَرِجَةً فِیْهِ كَانْدِرَاجِ الشَّجَرَةِ فِی النَّوَاةِ فَالْعِلْمُ الَّذِیْ قُلْنَا فِیْهِ اِنَّهٗ هُوَالْكِتَابُ الْمُبِیْن۔

ترجمہ: اس تمام تفصیل کے اعتبار سے جو اس ذات میں مندرج ہے ہم نے اسے اُم الکتاب کہا اور ظہور (بھی) اسی شے کا ہے جو اس میں پوشیدہ ہے۔ پس ذات کا علم جمیع اشیاء عالم کے علم کے ساتھ مستلزم[1] ہے۔ اس لیے کہ تمام اشیائے عالم اس ذات میں اسی طرح داخل تھیں جس طرح پورا درخت بیج میں داخل ہے۔ پس وہ علم جس کے بارے میں کہا گیا کہ اس ذات کے اندر موجود ہے وہ کتاب المبین ہے۔

شرح: حضرت امام حسین علیہ السلام حقائقِ کونیہ[2] بیان کرنے کے بعد حقائقِ الٰہیہ[3] بیان کرتے ہیں۔ ذاتِ حق تعالیٰ تمام حقائقِ الٰہیہ وکونیہ کی جامع ہے اس لیے اُم الکتاب ہے۔ حقائق کونیہ تفصیلاً اظہار سے قبل حقائقِ الٰہیہ میں پوشیدہ تھے انہی سے ظاہر ہوئے اور انہی کا اظہار ہیں۔ اظہار سے پہلے ان کی صورت علمی تھی اور اظہار کے بعد بدنی۔ اس عالمِ خلق میں اشیائے عالم کا علم ذاتِ حق تعالیٰ کے علم سے منسلک ہے۔ عالمِ خلق میں ذاتِ حق تعالیٰ موجودات میں اسی طرح پوشیدہ ہے جس طرح عالمِ امر میں موجودات ذاتِ حق تعالیٰ میں پوشیدہ تھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے درخت

1۔ جڑا ہوا، لازم وملزوم 2۔ کلمہ کن سے تخلیق ہونے والی تمام موجودات کے متعلق حقائق 3۔ ذاتِ حق تعالیٰ کے متعلق حقائق

اپنے وجود کے اظہار سے قبل بیج میں پوشیدہ ہوتا ہے اور اظہار کے بعد بیج پوشیدہ ہو جاتا ہے اور درخت ظاہر۔ عالمِ خلق کی ہر شے ذات حق تعالیٰ کا اظہار ہے یعنی حق تعالیٰ کی نشانی ہے۔ ذاتِ حق تعالیٰ کا علم حاصل کرنے کے لیے ان اشیاء کے حقائق کا علم حاصل کرنا لازم ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے۔

ترجمہ: ''بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں، رات اور دن کے باری باری آنے میں اور ان کشتیوں میں جو انسانوں کے کام آنے والی چیزیں لے کر سمندر میں چلتی ہیں اور اس پانی میں جس کو اللہ نے آسمان سے اتارا ہے، پھر اس سے مردہ زمین کو زندگی بخشی' اور زمین میں سب قسم کے جاندار پھیلا دیئے اور ہواؤں کی گردش میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان حکم کے تابع ہیں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔'' (البقرہ: 164)

ترجمہ: بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور دن اور رات کے باری باری آنے میں عقل والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ (آل عمران: 190)

احادیث میں آتا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب ایک رات حسبِ معمول تہجد کے لیے اٹھے تو دیکھا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان آیات بشمول آلِ عمران کی دیگر آخری آیات کی تلاوت فرمائی۔ تلاوت کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نظر آسمانوں کی طرف تھی' اس حال میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ''افسوس ہے اس پر جو ان آیات کو پڑھے مگر ان میں غور وفکر نہ کرے۔'' (ابنِ کثیر)

اللہ تعالیٰ نے اشیائے عالم میں غور وفکر کی دعوت اس لیے دی کیونکہ ان کے علم سے اللہ کی معرفت کا علم حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کی حقیقت کا علم اللہ کی ذات کا علم ہے کیونکہ ان کی حقیقت وہ خود ہے۔ ان کی تخلیق کے متعلق علم اگر کامل درجے تک پہنچ جائے تو اس بات میں کوئی شک نہ رہ جائے کہ ان کی تخلیق ذات حق تعالیٰ سے ہوئی۔

عالمِ امر میں اللہ تعالیٰ باطن ہے اور عالمِ خلق میں ظاہر۔ صوفیا کرام نے اللہ تعالیٰ کی پوشیدہ ذات کے خزانے کے اجسامِ عالم خصوصاً انسان میں اظہار کے سفر کے سات مراتب یا

مقامات کو حدیثِ قدسی: کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًا فَاَرَدْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ ذَات سَرْ چَشْمَہٗ چَشْمَانْ [1]

ترجمہ: ''میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں اس لیے میں نے مخلوق کو تخلیق کیا اور میری پہچان اور ظہور مکمل ہوا میری ذات کے سرچشمے (انسانِ کامل) میں'' کے حوالے سے بیان کیا ہے جنہیں تنزلاتِ ستہ کہتے ہیں۔ وہ سات مراتب یہ ہیں:

(1) ''کُنْتُ'' (میں تھا) سے مراد مقامِ احدیت ہے جہاں اللہ کے سوا کچھ موجود نہیں۔ یہاں اللہ کی ذات بطون [2] در بطون ہے جسے سمجھنا کسی کے لیے ممکن نہیں کیونکہ یہاں وہ ''لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ'' (کوئی شے اس کی مثل نہیں) کی حالت میں موجود ہے۔ بلکہ یہاں اسے نور بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ یہاں وہ 'نور' سے بھی اعلیٰ اور لطیف حالت میں ہے جس کا ادراک کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اسی حالت کے متعلق سلطان العارفین حضرت سخی سلطان باھو رحمۃ اللہ علیہ رسالہ روحی شریف میں فرماتے ہیں کہ ''اس کی ذات پاک کو سمجھنے کے لیے عقل کے ہزاروں ہزار و بے شمار قافلے سنگسار ہو گئے لیکن اس کی ماہیت کو نہ سمجھ پائے''۔ اسے عالمِ ھاھویت سے موسوم کیا جاتا ہے۔

(2) ''کَنْزًا'' یعنی ''خزانہ'' سے مراد مرتبہ وحدت یا حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے جو ذاتِ حق تعالیٰ کے اظہار کا پہلا مرتبہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی ذات نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صورت میں ظاہر ہوئی اور یہ نور ہی پوشیدہ خزانہ ہے جو اپنا اظہار چاہتا ہے۔ اسے عالمِ یاھوت بھی کہا جاتا ہے۔

(3) ''مَخْفِیًا'' یعنی چھپا ہوا۔ یہ مقامِ لاھوت لامکان ہے جہاں تمام عالم نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں چھپا ہوا موجود تھا اور اظہار کے لیے بے قرار تھا۔ اس مقام پر نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے صفاتِ الٰہیہ اور اسمائے الٰہیہ کے انوار ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ اس مرتبہ کو حقیقتِ انسانیہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہاں

---

[1] ذات سَرْ چَشْمَہٗ چَشْمَانْ۔ میری پہچان مکمل ہوئی انسان (کامل) میں۔ حدیثِ قدسی ''کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًا فَاَرَدْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ'' میں ''ذات سَرْ چَشْمَہٗ چَشْمَان'' کا خوبصورت اضافہ سلطان العارفین حضرت سخی سلطان باھو رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی الہامی تصنیف 'رسالہ روحی شریف' میں کیا ہے۔ [2] باطن کی جمع

سے انسان کی تفصیل شروع ہوتی ہے۔ اس لیے کہ یہاں نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ''روحِ قدسی'' کی صورت میں ظاہر ہوا اور روحِ قدسی ہی اصل انسان ہے۔ یہی وہ روح ہے جسے اللہ نے اپنی روح قرار دے کر انسان میں پھونکا جیسا کہ وہ فرماتا ہے کہ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ (الحجر۔29) ترجمہ: ''پھر میں نے اس (آدم) میں اپنی روح پھونکی'' اور اسی کے متعلق فرمایا اَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ترجمہ: ''ان کی مدد'' اپنی روح'' سے کی'' (المجادلہ۔22)۔ اللہ نے جب فرشتوں کو آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا تو درحقیقت اس روحِ قدسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ جن فرشتوں نے اسے پہچان کر سجدہ کر لیا وہ مقبولِ بارگاہ ہوئے اور جس نے نہیں پہچانا وہ شیطان کہلایا۔ یہی روحِ قدسی تمام مخلوقاتِ عالم خصوصاً انسانی ارواح کی تخلیق کا آغاز اور مادہ ہے۔ روحِ قدسی خود تو غیر مخلوق ہے کیونکہ اللہ کا نور ہے لیکن اسی سے مخلوق ارواح تخلیق ہوئیں۔

(4) ''فَاَرَدْتُ'' ''پس میں نے ارادہ کیا''۔ اس مرتبہ کو عالمِ ارواح یا جبروت کہتے ہیں جہاں اسمائے الٰہیہ سے افعال صادر ہوئے یعنی روحِ قدسی سے ارواح کی تخلیق ہوئی۔ پہلے روحِ قدسی سے قلبِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تخلیق ہوا اور پھر اسی مقام پر انسانی ارواح کی تخلیق کا بھی آغاز ہوا۔ روحِ قدسی جو غیر مخلوق نورِ الٰہی، نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے، کو جبروتی لباس پہنا کر روحِ سلطانی کی صورت میں عالمِ جبروت میں اتارا گیا۔ جس طرح انسان جب اس دنیا سے نکل کر خلا میں جاتا ہے تو اس کے لیے لازمی ہو جاتا ہے کہ وہ خلا کا خاص لباس پہنے ورنہ وہ خلا میں نہیں رہ سکتا۔ پس انسان کے لیے ہر عالم کا خاص لباس پہننا ضروری ہے۔ اسی طرح روح کے لیے بھی ہر عالم کا خصوصی لباس ہے جو اس عالم میں نزول پر اسے پہنایا جاتا ہے۔ روحِ سلطانی کا لباس اوڑھنے پر روحِ سلطانی نے روحِ قدسی کو خود میں چھپا لیا جیسے ایک روشن موتی کو ایک کپڑے سے ڈھانپ کر چھپا دیا جاتا ہے۔ اسی مقام پر فرشتوں کی تخلیق بھی روحِ قدسی سے ہوئی۔ اس عالم میں انسان کی روح کی تمام صفات، احوال اور افعال وہی ہیں جو فرشتوں کے ہیں اور اس کی نورانیت بھی ویسی ہے۔

(5) ''اَنْ اُعْرَفَ'' ''میں پہچانا جاؤں''۔ یہ مرتبہ ملکوت ہے جہاں روح کو ایک خیالی یا مثالی صورت

حاصل ہوئی۔ اب سے پہلے اللہ پوشیدہ تھا اور اسکو پہچاننا ممکن نہ تھا۔ مرتبہ احدیت، وحدت، لاھوت اور جبروت میں اللہ بطون در بطون چھپا ہوا تھا اور اظہار کے عمل سے گزر رہا تھا لیکن عالمِ ملکوت جہاں فرشتے محوِ کار ہیں اللہ کی پہچان یا ظاہر ہونے کا ابتدائی مرتبہ ہے۔ یہاں روحِ سلطانی نے خود کو روحِ نورانی کے لباس میں مخفی کیا یعنی روحِ قدسی یا نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس روشن موتی کو ایک اور کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا۔ اس عالم کو عالمِ مثال بھی کہتے ہیں کیونکہ یہاں روح مثالی صورتوں میں ظاہر ہوئی۔ مثالی صورتوں سے مراد ایسی صورتیں ہیں جن کو چھوا یا پکڑا نہیں جا سکتا ہے یعنی خیالی صورتیں جیسا کہ خواب میں نظر آتی ہیں۔ انسان کو خواب بھی عالمِ مثال سے ہی آتے ہیں۔ اس عالم میں انسانی روح نے صورت تو اختیار کر لی لیکن ابھی مادیت یا کثافت نہیں آئی یعنی پکڑا اور چھوا جانے والا جسم حاصل نہیں ہوا۔ اسی عالم میں حیوانات، جمادات اور نباتات کی ارواح بھی تخلیق ہوئیں۔ اسی مقام پر حیوانات کی تخلیق کی وجہ سے انسانی وجود میں حیوانات کی کچھ خصوصیات بھی شامل ہو گئیں مثلاً شہوت، حرص، درندگی، طوطا چشمی، اونٹ جیسا کینہ، لومڑی جیسی مکاری وغیرہ وغیرہ۔

(6) ''فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ'' پس میں نے مخلوق کو تخلیق کیا۔ اس مرتبہ پر روحِ قدسی یا نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مثالی صورت سے عنصری جسمانی صورت میں مخلوق میں ظاہر ہو گیا اور اس عالم کو عالمِ ناسوت کہتے ہیں جو عرش سے فرش تک پھیلا ہوا ہے اور جہاں چیزوں کو پکڑا اور چھوا جا سکتا ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ عالمِ امر سے نزول کر کے عالمِ ناسوت میں ظاہر ہو گیا جہاں مخلوق کے اجسام ظاہر ہیں اور اللہ باطن میں پوشیدہ ہے۔

(7) ''ذَاتِ سَرْ چَشْمَہ چَشْمَانْ'' یعنی میری پہچان مکمل ہوئی یا مکمل طور پر ظاہر ہوئی انسانِ کامل میں جو سر چشمہ ہے میری حقیقت کا۔ یعنی انسانِ کامل میں آ کر اللہ کا اظہار مکمل ہوا اور انسانِ کامل سے مراد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات ہے جو اللہ کے کامل مظہرِ اُتم ہیں۔

عالمِ خلق کی ہر شے ذاتِ حق تعالیٰ کا اظہار ہے لیکن اجسام کے اس عالم میں یہ ذات پوشیدہ ہے

البتہ انسانِ کامل وہ ذات ہے جس کی صورت میں ذاتِ حق تعالیٰ عالمِ خلق میں ظاہر بھی ہے۔ یہی وہ ذات ہے جہاں اُم الکتاب' کتاب مبین بن جاتی ہے۔ یعنی پوشیدہ اور جامع کتاب ظاہر اور بیان ہو جاتی ہے۔ اسی ذات میں عالمِ امر اور عالمِ خلق کا ہر علم جمع ہے۔ اس ظاہری دنیا یعنی عالمِ اجسام میں ذاتِ حق تعالیٰ کی معرفت اس انسانِ کامل کی معرفت کے ذریعے ہی ممکن ہے جو اس ذاتِ حق تعالیٰ کا مظہرِ اتم ہے۔ عام لوگ اجسام کو ہی کامل وجود جانتے اور ان کی حقیقت کے علم سے بے خبر رہتے ہیں۔ دین کی حقیقت کی کچھ خبر رکھنے والے خاص لوگ اشیاءِ عالم کو ذاتِ حق تعالیٰ کا اظہار قرار دیتے ہیں لیکن خاص الخاص لوگ اجسام سے قطع نظر صرف حقیقت کو دیکھتے ہیں اور مظہر میں ظاہر کو پہچانتے ہیں۔ پس ذاتِ حق تعالیٰ کا علم اس عالمِ خلق میں اجسام کی حقیقت کے علم کے ساتھ مستلزم و منسلک ہے۔ جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ''جس نے مجھے دیکھا اس نے بے شک حق تعالیٰ کو دیکھا'' یعنی جس نے انسانِ کامل کو پہچانا اس نے اللہ کو پہچانا۔

قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ سات مقامات پر اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ اللہ نے کائنات کو چھ ایام میں تخلیق کیا اور پھر عرش پر اپنا استویٰ فرمایا۔ یہ سات آیات قرآن میں ان مقامات پر ہیں:

(1) سورۃ اعراف۔ آیت 54

(2) سورۃ یونس۔ آیت 3

(3) سورۃ ھود۔ آیت 7

(4) سورۃ فرقان۔ آیت 59

(5) سورۃ السجدہ۔ آیت 4

(6) سورۃ ق۔ آیت 38

(7) سورہ الحدید۔ آیت 4

ساتوں مقامات پر تقریباً ملتے جلتے الفاظ میں اللہ فرماتا ہے اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ

ترجمہ: ''بے شک اللہ تمہارا رب ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ایام میں تخلیق کیا اور پھر عرش پر استویٰ فرمایا''۔ (الاعراف۔54)

ان تمام آیات میں چھ یوم سے مراد تین عالمِ امر کے اور تین عالمِ خلق کے مراتب ہیں جو مندرجہ بالا تنزلاتِ ستہ میں عالمِ امر میں احدیت، وحدت، واحدیت اور عالمِ خلق میں جبروت، ملکوت اور ناسوت کے نام سے موسوم ہیں اور ''عرش پر استویٰ'' سے مراد ساتواں مرتبہ یعنی انسانِ کامل کے وجود میں ذاتِ حق تعالیٰ کا مکمل طور پر ظاہر ہو جانا ہے۔

علمائے ظاہر نے ان آیات کی تفسیر میں ہمیشہ ''یوم'' سے مراد ''دن'' یا وقت یا زمانے کی کوئی مقدار لیا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اللہ کے ہاں ایک یوم ہزار برس کا ہے کوئی کہتا ہے کہ دس ہزار برس کا ہے لیکن ''وقت'' یا ''دنوں'' اور ''برسوں'' کی تخلیق تو کائنات کی تخلیق کے بعد ہوئی جب زمین نے سورج کے گرد گردش شروع کی اور اللہ تو وہ ذات ہے جو کن کہتا ہے اور فیکون ہو جاتا ہے۔ اسے وقت اور زمانے سے کیا سروکار کہ وہ تو ان سے ماورا ہے۔ بے شک ان آیات میں چھ یوم سے مراد نزول کے چھ مراتب ہیں اور عرش پر استویٰ سے مراد مظہرِ اتّم انسانِ کامل میں ذات کے اظہار کی تکمیل ہے کیونکہ عرش سے مراد مومن کا قلب ہے جیسا کہ حدیثِ قدسی میں فرمایا گیا ''قلب المومن عرش اللہ تعالیٰ'' مومن کا قلب اللہ کا عرش ہے۔

☆☆☆☆☆☆

فَالْعِلْمُ الَّذِیْ قُلْنَا فِیْہِ اَنَّہٗ ھُوَ الْکِتَابُ الْمُبِیْنُ مِرْاٰۃٌ لِلذَّاتِ الَّتِیْ قُلْنَا فِیْھَا اِنَّھَا اُمُّ الْکِتَابِ وَالذَّاتُ ظَاھِرٌ فِیْھَا لِاَنَّ الْعِلْمُ ھُوَ اَوَّلُ مَاتَعَیَّنَ بِہِ الذَّاتُ فَالذَّاتُ ھِیَ اُمُّ الْکِتَابِ مِنَ الْحَقَآئِقِ الْاِلٰھِیَّۃِ وَالْعِلْمُ ھُوَ الْکِتَابُ الْمُبِیْنُ مِنَ الْحَقَآئِقِ الْاِلٰھِیَّۃِ۔

ترجمہ: پس وہ علم جس کے بارے میں ہم کہہ چکے کہ وہ کتابِ مبین ہے، اس ذات کا آئینہ ہے

جس کی نسبت ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ کتابِ مبین ہے۔ اور ذات ظاہر ہے اس میں اس لیے کہ علم اس ذات کی تعینات میں اوّل ہے۔ پس ذات ''ام الکتاب'' ہے حقائقِ الٰہیہ سے اور علم ''کتابِ مبین'' ہے حقائقِ الٰہیہ سے۔[1]

شرح: حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ ''المومن مراۃ المومن'' ترجمہ: مومن مومن کا آئینہ ہے۔ اس حدیث کی شرح میں بیان کیا گیا کہ یہاں مومنِ اوّل اللہ تعالیٰ ہے جیسا کہ اللہ کا ایک صفاتی نام مومن بھی ہے، اور دوم مومن انسانِ کامل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مبارک ہے۔ نورِ الٰہی سے جب نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جدا ہوا تو اپنی کامل لطافت و نورانیت کے باعث ذاتِ حق تعالیٰ کے لیے بطور آئینہ ظاہر ہوا جس میں ذات حق تعالیٰ نے اپنا ہی عکس دیکھا۔ اسی طرح نورِ الٰہی بھی نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے آئینہ بنا لیکن نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس آئینہ میں اپنی ذات کو نہ دیکھ کر صرف اپنے رب کو دیکھا۔ اپنی ذات کی نفی کر کے اُس ذات کو سجدہ کیا اور کہا ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' نہیں کوئی عبادت کے لائق سوائے اللہ کے۔ حالانکہ نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نورِ الٰہی کے آئینے میں اپنا ہی عکس دیکھ رہا تھا لیکن بتقاضائے عبودیت اور اللہ کے نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ظاہر کر کے ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر احسان کرنے کے شکرانے کے طور پر ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی ذات کی نفی کر دی۔ یہیں سے کلمہ حقیقی ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' کے 'لَا' کی ابتدا ہوئی اور دینِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حقیقت کا آغاز ہوا کہ جب تک بندہ اپنی ذات کی نفی نہ کرے گا اللہ کو نہ پائے گا۔

اس مقام پر اشیاءِ عالم کا تمام علم نور کی صورت میں نورِ الٰہی سے نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں منتقل تو ہو

---

[1] اس عبارت کی شرح سے قبل یہ حقیقت بیان کر دینا بے حد ضروری ہے کہ اگلی سطور میں عالمِ امر کے ان حقائق کو بیان کیا جانے لگا ہے جو عالمِ خلق یا عالمِ ناسوت میں قید قلب و ذہن رکھنے والے عوام کے لیے سمجھنا بہت مشکل ہے۔ جب تک انسان کسی جگہ، خواہ وہ اسی دنیا میں ہی کیوں نہ ہو، خود پہنچ کر اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں لیتا اس کے متعلق اس کا علم محدود ہی رہتا ہے چاہے کتابوں یا گفتگو کے ذریعے اسے کتنا ہی کیوں نہ بتایا جائے۔ اسی طرح جب تک انسان جسم کی قید سے رہائی پا کر عالمِ امر یعنی لاھوت لامکان تک قربِ الٰہی حاصل نہیں کرتا تب تک اُس عالم کے متعلق حقائق نہیں سمجھ سکتا کہ یہ سب حقائق اس کے عقل و شعور کی حد سے بہت بالا ہیں۔

چکا تھا لیکن مخفی تھا۔ ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اپنی ذات کی نفی اور ذاتِ حق تعالیٰ کے اثبات سے راضی ہو کر اللہ تعالیٰ نے اس علم کو ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر کھول دیا اور کہا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (الکہف۔65) ترجمہ: ''بیشک ہم نے اسے علمِ لدّنی عطا فرمایا'' چنانچہ اشیائے عالم کے ظہور سے پہلے ان کا وجود علمی صورت میں نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں ظاہر ہوگیا۔ ذاتِ حق تعالیٰ ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے آئینہ اور ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ذاتِ حق تعالیٰ کے لیے آئینہ۔ دونوں جانب وجود ایک ہی ہے بنا کسی تغیر وتبدل کے۔ سوائے اس فرق کے کہ ایک خالق ہے اور دوسرا مخلوق۔ اس اعتبار سے تو ''اُم الکتاب'' ہی ''کتاب مبین'' ہے اور ''کتابِ مبین'' ہی ''اُم الکتاب'' ہے۔ لیکن اگر علم کے مفصل اور مجمل اظہار کے اعتبار سے دیکھیں تو ذات حق تعالیٰ ام الکتاب'' ہے جس میں تمام کائنات وعالمین کا علم ''گٹھلی میں درخت'' کی صورت پوشیدہ ہے اور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کتابِ مبین ہیں جن کے واسطے سے اور جن پر یہ علم پہلی بار ظاہر ہوا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ علم کو ذات (حق تعالیٰ) کا پہلا تعین[1] قرار دیتے ہیں حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ذات کا پہلا اظہار تو نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صورت ہوا ہے۔ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بجائے ''علم'' کو ذاتِ حق تعالیٰ کا پہلا تعین قرار دینے میں یہ حکمت نظر آتی ہے کہ نورِ محمدی کو نورِ الٰہی کا تعینِ اوّل قرار دینے سے یہ ظاہر ہوگا کہ نورِ محمدی اور نورِ الٰہی دو وجود ہیں اور نورِ الٰہی ایک وجود تھا جس سے دوسرا وجود نورِ محمدی پیدا ہوا حالانکہ وجود تو ایک ہی ہے۔ علم تعینِ اوّل اس لیے ہوا کہ نورِ الٰہی سے نورِ محمدی میں منتقل ہوتے ہوئے اس علم نے ہی حالتِ پوشیدگی سے حالت بیانیہ کی طرف سفر کا آغاز کیا ورنہ اصل وجود ایک ہی رہا۔ جس طرح گٹھلی سے پیڑ کا آغاز جڑ کی صورت میں ہوتا ہے۔ جیسے جڑ آغاز اور بنیاد ہے تمام پیڑ کی اسی طرح ''علم'' تعینِ اوّل بھی ہے نورِ الٰہی کا اور آغاز اور ابتدا بھی ہے حیات کی۔

سرالاسرار میں حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''جان لے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے روحِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اپنے نورِ جمال سے پیدا کیا جیسا کہ فرمانِ حق تعالیٰ ہے ''میں نے روحِ محمد

---

[1] ٹھہرانا۔ مقرر کرنا

صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اپنے چہرے کے نور سے پیدا فرمایا'' یا جیسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے:

1. اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میری روح کو پیدا فرمایا۔
2. اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرے نور کو پیدا فرمایا۔
3. اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا۔
4. اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا فرمایا۔

ان سب سے مراد ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جس کا نام نور اس لیے رکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات ظلماتِ جلالیہ سے بالکل پاک ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے: ''تمہارے پاس آیا اللہ کی طرف سے ایک نور اور کتابِ مبین'' اور عقل اس لیے کہا کہ آپ کی ذات تمام کلیات پر محیط ہے اور قلم اس لیے نام رکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات علم کو منتقل کرنے کا ذریعہ ہے جیسا کہ قلم عالمِ حروفات میں علم نقل کرنے کا ذریعہ ہے''۔ (سرالاسرار)

چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی علم ہیں' آپ ہی کتابِ مبین' آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی قلم اور تمام موجودات کے لیے آپ ہی اُم الکتاب، کہ سارا عالم آپ کے نور کے توسط سے ظاہر ہوا۔ البتہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات کے لیے ذاتِ حق تعالیٰ اُم الکتاب ہے۔ لیکن ایک دوسرے کا آئینہ ہونے کے اعتبار سے ام الکتاب ہی کتابِ مبین ہے اور کتابِ مبین ہی اُم الکتاب ہے۔

☆☆☆☆☆☆

كَمَآ اَنَّ الْقَلَمَ هُوَ اُمُّ الْكِتَابِ مِنَ الْحَقَآئِقِ الْكَوْنِيَّةِ وَاللَّوْحُ الْمَحْفُوْظِ هُوَ الْكِتَابُ الْمُبِيْنُ مِنَ الْحَقَائِقِ الْكَوْنِيَّةِ فَبَيْنَ الذَّاتِ وَالْقَلَمِ مُضَاهَاةٌ مِنْ جِهَةِ الْاِجْمَالِ وَالْكُلِّيَّةِ. وَ كَوْنِ الْاَشْيَاءِ فِيْهِمَا عَلٰى وَجْهِ الْكُلِّيِّ وَ كَذَالِكَ بَيْنَ اللَّوْحِ وَالْعِلْمِ مُشَابَهَةٌ مِنْ جِهَةِ التَّفْصِيْلِ وَظُهُوْرِ الْاَشْيَآءِ فِيْهِمَا عَلَى الْوَجْهِ الْجُزْئِي۔

ترجمہ: جیسا کہ 'قلم' حقائقِ کونیہ کے لحاظ سے اُم الکتاب ہے اور لوحِ محفوظ کتابِ مبین ہے البتہ ذات (حق تعالیٰ) اور قلم میں اجمال اور کلیت کی جہت سے مشابہت ہے اور اسی طرح علم اور لوحِ محفوظ کے درمیان بھی مشابہت ہے تفصیل اور ظہورِ اشیاء کی جہت سے۔

شرح: نظریہ وحدت الوجود کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ہر شے نے ذاتِ حق تعالیٰ سے وجود پایا۔ ہر عام مسلمان کا نظریہ بھی یہی ہے کہ اگر اللہ نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا لیکن اللہ خود فرماتا ہے کہ ''اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نہ ہوتے تو کچھ نہ ہوتا'' لَوْلَاكَ لَمَا اَظْهَرْتُ الرَّبُوْبِيَةَ ترجمہ: ''اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نہ ہوتے تو میں اپنا ربّ ہونا ظاہر نہ کرتا'' اور فرماتا ہے: لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ۔ ترجمہ: ''اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں نے لولاک (تمام عالمِ مکان ولامکان) صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے تخلیق کیے''۔ یعنی اگر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مبارک ذات نہ ہوتی تو نہ اللہ کا ہونا ظاہر ہوتا، نہ عالم تخلیق ہوتے نہ مخلوق پیدا کی جاتی۔ اللہ موجود ہوتا لیکن نہ اسے کوئی ربّ کہنے والا ہوتا نہ ماننے والا، نہ سجدہ کرنے والا، نہ اس کے سامنے عاجزی کرنے والا، نہ دعا کرنے والا۔ یعنی اس کی ربوبیت بھی ظاہر نہ ہوتی اور وہ خود بھی ظاہر نہ ہوتا۔ پس ہوتا لیکن نہ ہوتا۔ پس وہ وجود جو ہر شے کی تخلیق کا باعث ہے وہ ایک جہت سے خود ذاتِ حق تعالیٰ ہے اور ایک جہت سے ذات محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے۔ اگر حقیقتاً سمجھا جائے تو یہ وجود دو نہیں بلکہ ایک ہے، لیکن اگر ظاہراً دیکھا جائے تو وجود دو ہو کر بھی ایک دوسرے کے عین اور مشابہ ہیں۔

قلم سے مراد بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات ہے اور لوحِ محفوظ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی ہیں لیکن ان دونوں میں مراتب کا فرق ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے کہ ''اللہ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا''، تو قلم سے مراد نورِ محمدی کا مرتبہ وحدت یا ظہورِ اوّل ہے جہاں تمام حقائقِ کونیہ ابھی قلم یعنی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں پوشیدہ ہیں۔ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تو نورِ الٰہی سے ظاہر ہو چکا، اپنا وجود پا چکا لیکن حقائقِ کونیہ اگرچہ اسی وجود میں موجود ہیں لیکن ظاہر نہیں ہوئے اسی لیے اسے قلم کہا جس میں سارا علم اور بیان کیا جانے والا ہر حرف سیاہی کی صورت میں موجود ہوتا ہے۔ حقائقِ کونیہ کا مطلب کون

ومکان یعنی تمام عالم اوران میں پائی جانے والی تمام مخلوقات کا ذاتی وجوداور اس کے متعلق ہر تفصیل ہے کہ وہ شے کیسی ہوگی، اس کے وجود کا مقصد کیا ہوگا، وہ عالم میں کب سے کب تک، کس لیے اور کس مقام پر ظاہر ہوگی۔ ہر شے اپنی ذات اور ہر قسم کی تفصیل کے ساتھ حقائق کونیہ میں شامل ہے اور یہ تمام حقائقِ کونیہ ظاہر ہونے سے قبل نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یا قلم میں موجود تھے۔ اس لحاظ سے حقائقِ کونیہ کے لیے "قلم" اُم الکتاب ہے۔

لوحِ محفوظ سے مراد روحِ قدسی ہے جو نورِ محمد کا تفصیلی اظہار ہے اور نورِ محمد سے ہی تخلیق ہوئی ہے۔ یہ روحِ قدسی واحد وجود ہے اور توحید کی صورت ہے۔ اگرچہ اس میں تمام ارواحِ انسانی کی علمی تفصیل اور علمی وجود موجود ہے لیکن بذاتِ خود یہ صرف ایک واحد وجود ہے جو نورِ محمد سے تخلیق ہوا یا ظاہر ہوا۔ یہ روحِ قدسی اللہ کی وہ روح ہے جسے اللہ نے ہر انسان کو بطورِ امانت عطا کیا جس کے متعلق اللہ فرماتا ہے کہ ترجمہ: "ہم نے "اپنی امانت" آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی لیکن سب نے اسے اُٹھانے سے انکار کر دیا البتہ انسان نے اسے اٹھالیا۔ بے شک وہ (اس روحِ قدسی کے اپنے اندر موجود ہونے سے) جاہل اور (اس کی قدر نہ کرنے کی وجہ سے) ظالم ہے"۔ (سورۃ الاحزاب۔72)

حضرت ابراہیم الجیلیؒ فرماتے ہیں "جاننا چاہیے کہ محسوسات کی ہر شے کی ایک مخلوق روح بھی ہے جس کے ساتھ اس شے کی صورت قائم ہے۔ روح اس شے کے لیے ایسی ہے جیسے لفظ کے لیے معنی۔ پھر اس مخلوق روح کے لیے ایک روحِ الٰہی جس کے ساتھ وہ مخلوق روح قائم ہے اور وہ روحِ الٰہی روحِ قدسی ہے"۔ (انسانِ کامل)۔ یعنی روحِ قدسی تو روحِ الٰہی ہونے کی وجہ سے غیر مخلوق ہے لیکن اسی غیر مخلوق روحِ الٰہی سے مخلوق ارواحِ انسانی کی تخلیق ہوئی۔

نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا روحِ قدسی میں ڈھلنا ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اجمال سے تفصیل کی طرف پہلا قدم ہے، یا قلم میں پوشیدہ حقائقِ کونیہ کے اظہار کا پہلا مرتبہ ہے۔ قلم میں پوشیدہ حروف کو بیان یا ظاہر کرنے یا وجود بخشنے کے لیے ایک لوح (تختی) کی ضرورت ہے جس پر ان حروف کو لکھا جا سکے۔ اس مقامِ وحدت پر اللہ ہی کی ذات نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صورت ظاہر ہے، اور اس کے سوا

یہاں کچھ موجود نہیں۔ نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آئینہ میں خود کو ملاحظہ کر کے اللہ تعالیٰ اس پر فریفتہ ہو چکا، نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے ربّ اور اپنے خالق کو سجدہ کر کے اسے مسجود بنانے، اس کی ربوبیت کو تسلیم کر کے اسے معبود بنانے کی ادا سے راضی ہو کر اللہ اسے اپنا محبوب بنا چکا۔ پس اب جو بھی تخلیق ہوگا وہ نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہی تخلیق ہوگا کیونکہ اللہ رب العزت کو اپنی مخلوق کی تخلیق کے لیے یہی جوہر پسند آگیا اور اس نے اسے اپنی تمام مخلوقات کے جوہر کے طور پر چن لیا۔ اگرچہ وہ قدرت رکھتا ہے کہ مخلوق کی تخلیق کے لیے الگ سے کوئی مادہ یا جوہر تخلیق کرے لیکن وہ ہر صورت میں یہی صورت دیکھنا چاہتا ہے، ہر وجود میں یہی نور ملاحظہ کرنا چاہتا ہے اس لیے نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قلم بنا اور روحِ محمد یا روحِ قدسی لوحِ محفوظ بنی جیسا کہ اقبالؒ نے فرمایا:

لوحؑ بھی تو قلمؑ بھی تو تیرا وجود الکتاب

گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

اسی نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قلم سے اسی روحِ قدسی کی لوحِ محفوظ پر حقائقِ کونیہ منتقل ہوئے، ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ ہر شے کا وجود پہلے قلم یعنی نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پوشیدہ تھا، پھر لوحِ محفوظ پر منتقل ہوا یعنی روحِ قدسی کی صورت میں ظاہر ہوا اور پھر وہاں سے درجہ بدرجہ نزول کرتے ہوئے دنیا میں ظاہر ہوا۔ اس لحاظ سے لوحِ محفوظ کتابِ مبین ہے کیونکہ اس کتاب میں تمام حقائقِ کونیہ پہلی مرتبہ قلم کے ذریعے ظاہر ہوئے۔ کتابِ مبین سے مراد کھلی ہوئی روشن کتاب جس میں حقائق ظاہر ہوں۔ ذاتِ حق تعالیٰ سے قلم (نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مرتبہ اجمال (جہاں حقائقِ کونیہ کی تفصیل ابھی جامع حالت میں پوشیدہ ہے) کے لحاظ سے وہی نسبت ہے جو علم کو لوحِ محفوظ سے مرتبۂ تفصیل (جہاں حقائقِ کونیہ تفصیلاً ظاہر ہونے لگے) کے لحاظ سے ہے۔ جیسے جیسے نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوشیدگی سے ظہور، اجمال سے تفصیل کی طرف نزول کیا ذاتِ حق تعالیٰ نے بھی اسی نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے توسط سے نزول کیا۔ اجمال کے لحاظ سے دیکھا جائے تو تمام حقائقِ کونیہ ظہور سے قبل ذاتِ حق تعالیٰ میں بھی پوشیدہ تھے اور قلم یعنی نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بھی پوشیدہ ہی تھے۔ اس

طرح ذاتِ حق تعالیٰ اور نورِ محمد ﷺ یا قلم میں اسی طرح نسبت ہے۔ جس طرح ذاتِ حق تعالیٰ کی واحدیت اور نورِ محمد ﷺ کی وحدت میں۔ اللہ مقام واحدیت میں ہر شے کا علم حتیٰ کہ نورِ محمد ﷺ کو بھی اپنی ذات میں چھپائے ہے اور نورِ محمد ﷺ یعنی قلم تمام حقائقِ کونیہ حتیٰ کہ اپنی ذات کا علم بھی اپنے اندر حالتِ اجمال میں چھپائے ہے، یوں یہ نسبت اللہ کے مرتبہ واحدیت اور نورِ محمد ﷺ کے مرتبۂ وحدت میں قائم ہوئی۔ نورِ الٰہی 'کُل' ہے کہ تمام مخلوقات اس میں موجود ہیں۔ نورِ محمد ﷺ میں بھی کُلیت اور اجمال ہے' کہ نورِ الٰہی سے تمام مخلوقات کا علمی وجود پہلے نورِ محمدی ﷺ میں منتقل ہوا۔ اس کلیت اور اجمال کی وجہ سے یہ دونوں اُم الکتاب ہیں اور اسی وجہ سے ان میں نسبت ہے۔

اللہ کا پہلا ظہور نورِ محمد ﷺ میں علم کی صورت ہوا۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا کہ نورِ الٰہی سے نورِ محمد ﷺ کو یوں نہ سمجھا جائے کہ کسی ایک وجود سے دوسرا وجود پیدا ہوا یا ایک مادہ سے کوئی دوسرا مادہ تخلیق ہوا، بلکہ وجود بھی ایک ہے، مادہ بھی ایک، جوہر بھی ایک ہے۔ نورِ الٰہی سے نورِ محمدی ﷺ کے ظہور سے مراد علمِ الٰہی جو تمام مخلوقاتِ عالم پر محیط ہے، کا حالتِ پوشیدگی سے حالت بیانیہ کی طرف پہلا نزول ہے۔ ذات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی صرف علم نے اجمال سے تفصیل کی طرف پہلا قدم رکھا ہے۔ چنانچہ علم اگر نورِ الٰہی یا نورِ محمد ﷺ ہے تو لوحِ محفوظ روحِ قدسی ہے جس پر اس علم کا نزول ہوا۔ علم ذاتِ حق تعالیٰ کے نزول کا مرتبۂ اوّل ہے اور لوحِ محفوظ نورِ محمد ﷺ کے نزول کا مرتبۂ اوّل ہے جہاں نور پہلی مرتبہ روحِ قدسی میں ڈھلا۔ 'علم' ذاتِ حق تعالیٰ سے قلم یا نورِ محمد ﷺ میں منتقل ہوا اور قلم سے لوحِ محفوظ یا روحِ قدسی میں۔ اس طرح اللہ کی جو نسبت قلم سے ہے، علم کی وہی نسبت لوحِ محفوظ سے ہے۔ اللہ اور قلم میں تمام مخلوق اجمالاً پوشیدہ ہے اور اللہ سے نورِ محمدی ﷺ کا ظہور یا قلم سے لوحِ محفوظ پر علم کا ظہور دونوں میں یہ نسبت ہے کہ دونوں ہی سے ظہورِ اشیاء کا تفصیلاً آغاز ہوا۔ اللہ اور قلم (نورِ محمدی ﷺ) میں اجمال کے لحاظ سے نسبت ہے اور علمِ الٰہی اور لوحِ محفوظ (روحِ قدسی) میں تفصیل کے لحاظ سے نسبت ہے۔ اس تفصیل کی وجہ سے

روحِ قدسی اور لوحِ محفوظ کتابِ مبین کہلائے۔

☆☆☆☆☆☆

فَالْقَلَمُ مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ فِيْ مَرْتَبَةِ الْكَوْنِيَّةِ مِرْاٰةُ الذَّاتِ فَمَا فِي الذَّاتِ مُنْدَرَجٌ عَلٰى وَجْهِ الْكُلِّيِّ وَالْاِجْمَالِيِّ فَهُوَ فِي الْقَلَمِ مُوْدَعٌ عَلَى الْوَجْهِ الْكُلِّيِّ وَالْاِجْمَالِيِّ وَاللَّوْحُ الْمَحْفُوْظُ اَيْضًا مِّنْ هٰذَا الْوَجْهِ فِي الْمَرْتَبَةِ الْكَوْنِيَّةِ مِرْاٰةُ الْعِلْمِ فَمَا فِي الْعِلْمِ عَلَى الْوَجْهِ الْجُزْئِيِّ وَ التَّفْصِيْلِيِّ فَهُوَ فِي اللَّوْحِ ظَاهِرٌ عَلَى الْوَجْهِ الْجُزْئِيِّ وَالتَّفْصِيْلِيِّ۔

ترجمہ: پس قلم اس وجہ سے مرتبۂ کونیت میں ذات کا آئینہ ہے کہ جو کچھ ذات میں کلی اور اجمالی حالت میں موجود ہے وہی قلم میں اماناً رکھا گیا ہے کلی اور اجمالی صورت میں۔ اسی طرح لوحِ محفوظ بھی علم کا آئینہ ہے مرتبۂ کونیہ کی (تفصیلی) صورت میں۔ سو جو کچھ 'علم' میں ہے جزئی اور تفصیلی صورت میں وہی لوحِ محفوظ میں ظاہر ہوا اپنی جزئی اور تفصیلی حالت میں۔

شرح: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ پچھلی عبارت کو ہی تفصیلاً بیان کر رہے ہیں کہ قلم یا نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذاتِ حق تعالیٰ کا آئینہ ہے کیونکہ تمام مخلوقات کے وجود اور ان کے حقائق جس طرح 'کُل' کی صورت میں ذاتِ حق تعالیٰ میں موجود ہیں اسی طرح قلم میں بھی کُل کی صورت میں ہی موجود ہیں۔ ''کُل'' کی صورت میں موجود ہونے سے مراد یہ ہے کہ اشیاء عالم ابھی اپنا علیحدہ ذاتی کوئی وجود نہیں رکھتیں بلکہ وہ اپنے خالق کے وجود میں ہی پوشیدہ ہیں جس طرح حروف اپنا وجود پانے سے قبل سیاہی میں 'کُل' کی صورت میں پوشیدہ ہوتے ہیں یا پورے درخت کا وجود پتے، شاخیں، جڑیں، پھل، پھول وغیرہ ایک بیج میں 'کُل' کی صورت میں پوشیدہ ہوتے ہیں اور اس کو اجمال کی صورت بھی کہا گیا ہے۔ اس لحاظ سے ذاتِ حق تعالیٰ اور قلم یا نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نسبت اور مشابہت ہے۔ بلکہ وہ ایک دوسرے کا عین اور آئینہ ہیں۔ قلم میں حقائقِ کونیہ کو اماناً رکھا گیا۔ جو شے

کسی جگہ یا مقام پر امانتاً رکھی جاتی ہے، اسے وہاں مستقل نہیں رہنا ہوتا بلکہ آگے منتقل ہونا ہوتا ہے۔

حقائقِ کونیہ کو بھی چونکہ قلم کے ذریعے سے یا نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے توسط سے عالم میں اپنے اپنے مقام پر منتقل ہونا تھا اس لیے وہ قلم میں امانتاً رکھے گئے۔ قلم سے سب سے پہلے یہ لوحِ محفوظ یا روحِ قدسی میں منتقل ہوئے پھر عرش یا قلبِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر، پھر عالمِ ارواح یا جبروت جہاں انسانی ارواح کی تخلیق ہوئی، پھر عالمِ ملکوت جہاں مثالی اجسام تخلیق ہوئے اور پھر عالمِ ناسوت جہاں ظاہری جسم تخلیق ہوئے، میں درجہ بدرجہ منتقل ہوئے اور ظہور کے مراتب مکمل کیے۔ قلم سے لوحِ محفوظ یا نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روحِ قدسی کی طرف منتقلی اگرچہ مرتبہ ٔ کلی سے مرتبہ ٔ تفصیلی کی طرف پہلا قدم ہے لیکن ابھی اشیاء کا علیحدہ ظہور نہیں ہوا۔ نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روحِ قدسی کی طرف ذات کے نزول کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جیسے بیج سے درخت کے پھوٹنے سے قبل اس کے اندر ہی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جو ظاہر نہیں ہوتیں بلکہ بیج کے اندر ہی رہتی ہیں۔ اسی طرح اشیاء کے ظہور پانے سے قبل نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم روحِ قدسی میں ڈھلا یا قلم سے علم لوحِ محفوظ پر منتقل ہوا۔ اور پھر اگلے مراتب میں لوحِ محفوظ سے عرش اور عالمِ ارواح میں منتقل ہوا جہاں روحِ قدسی سے قلبِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ظہور ہوا جس سے ارواحِ انسانی کی تخلیق ہوئی۔

جب ایک انسان اللہ کے قرب کا سفر کرتا ہے تو اس کی ذات نفس سے روح، روح سے قلب اور قلب سے واپس روحِ قدسی اور نور میں ڈھل جاتی ہے یوں جو سفر نور سے روحِ قدسی، روحِ قدسی سے قلب، قلب سے روحِ انسانی اور روح سے نفس تک طے ہوا تھا وہ واپس نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر پہنچ کر ختم ہوتا ہے۔ اسی کے متعلق کہا گیا کہ انتہا ابتداء کی طرف لوٹ جانا ہے۔ نفس کا روح، روح کا قلب اور پھر مکمل روحِ قدسی اور نور میں ڈھلنا ہی مرتبہ ٔ وحدت ہے جہاں نفس، روح، قلب اور نور ایک ہو جاتے ہیں یعنی مرتبہ ٔ تفصیل سے واپس مرتبہ ٔ کُل تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہی حقیقتِ محمدیہ یا مقامِ انسانِ کامل ہے جیسا کہ سلطان العارفین حضرت سخی سلطان باھُو رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں

''چونکہ اللہ تعالیٰ کے نورِ مبارک سے جنابِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نورِ مبارک ظاہر

ہوا، اس لیے انسان کی اصل نور ہے اور عمل کے مطابق جب نفس، قلب اور روح تینوں نور بن جاتے ہیں اس کو انسانِ کامل کہتے ہیں''۔ (عقلِ بیدار)

جس طرح نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یا قلم اجمال اور کُلیت کے لحاظ سے ذاتِ حق تعالیٰ کا آئینہ ہے اسی طرح جزئی اور تفصیلی لحاظ سے لوحِ محفوظ یا روحِ قدسی علمِ الٰہی کا آئینہ ہے۔ کیونکہ جو کچھ علمِ الٰہی میں تفصیلاً موجود ہے وہ لوحِ محفوظ یا روحِ قدسی میں ہی ظاہر ہوا۔ اس تمام تفصیل کے بیان سے اوّل تو یہ مراد ہے کہ ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہر مرتبہ اور ہر مقام پر ذاتِ حق تعالیٰ کا آئینہ اور اس سے مشابہت رکھتی ہے۔ اور دوسرے یہ مراد ہے کہ جیسے جیسے ذاتِ حق تعالیٰ نے ظہورِ اشیاء کی طرف نزول کیا اسی طرح نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھی نزول کیا بلکہ حقیقتاً ایک ہی ذات نے نزول کیا۔ وجود ہمیشہ سے ایک ہی ہے۔ نزول کے مراتب مختلف ہیں۔ جیسے بیج کا وجود ایک ہی اور درخت کا وجود بھی ایک ہی ہے البتہ درخت کے ظاہر ہونے سے قبل بیج یا خود درخت مختلف حالتوں سے گزرتا رہا۔

اس تمام تفصیل سے یہ بھی مراد ہے کہ عالم کی ہر شے نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نسبت سے، اس کے توسط، وسیلے اور ذریعے سے ذاتِ حق تعالیٰ سے جڑی ہے اور اگر اس نسبت اور وسیلے کو بیچ سے نکال دیا جائے تو تمام نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے۔ نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور روحِ قدسی اللہ اور مخلوق کے درمیان مرکزی کڑی ہے۔ نہ اللہ اس واسطے کے بغیر مخلوق کو دیکھتا ہے نہ مخلوق اس واسطے کے بغیر اللہ تک پہنچ سکتی ہے۔

ہر شے اپنے اصل کی طرف رجوع کرتی ہے اگر کسی انسان کو اپنے اصل کو جاننا اور پہچاننا ہے تو وہ جان لے کہ اس کے وجود کا اصل اور اس کی بنیاد نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے۔ اقبال رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ہستی مسلم تجلی گاہِ او

طُور ہا بالد ز گردِ راہِ او

ترجمہ: ''مسلمان کا وجود نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جلوہ گاہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی گردِ راہ سے کئی طور پیدا ہوتے ہیں۔'' طُور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کا دیدار کیا اور مسلمان اپنی ذات میں

موجود نورِ محمد ﷺ تک پہنچ کر اپنے اندر ہی اللہ کا دیدار کرتا ہے۔ یعنی مسلمان کا طُور اس کے اندر موجود نورِ محمد ﷺ ہے اور یہ طُور ہر مومن کے قلب میں موجود ہے۔ اپنی حقیقت اپنے اصل تک پہنچنے کے لیے لازم ہے کہ انسان نورِ محمد ﷺ تک پہنچے یعنی مجلسِ محمدی ﷺ تک پہنچے۔ خود کو پہچاننے کے لیے نورِ محمد ﷺ کو پہچانے جو ہر زمانے میں اس زمانے کے انسانِ کامل کی صورت میں ظاہر ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ فرماتے ہیں:

بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

گر بہ او نہ رسیدی، تمام بولہبی است (جاوید نامہ)

ترجمہ: ''تُو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تک خود کو پہنچا کہ (یعنی انسانِ کامل تک خود کو پہنچا) کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پہچان ہی مکمل دین ہے۔ اگر تو ان تک پہنچ کر انہیں نہیں پہچانتا تو تیرا سارا دین ابولہب کا دین ہے''۔

کیونکہ ابولہب اللہ کو تو مانتا تھا لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حقیقت کو نہیں پہچانتا تھا۔

علم کا کوئی ٹھوس مادی وجود نہیں۔ 'علم' ایک قوت ہے جو اشیاء کی حیات کا باعث ہے۔ ہر شے اپنا وجود پانے سے قبل علم کی صورت کسی ذہن میں تخلیق ہوتی ہے پھر وہ ذہن اپنے اندر موجود علم کے مطابق اس شے کو وجود عطا کرتا ہے۔ جیسا کہ دنیا میں عام ہوتا ہے کہ کوئی بھی شے اپنا وجود پانے سے قبل اپنے خالق مثلاً مصور یا انجنیئر کے ذہن میں 'علم' کی صورت میں موجود ہوتی ہے اور پھر مختلف مراحل سے گزر کر وجود پاتی ہے۔ چنانچہ 'علم' حیات کی ابتداء ہے۔ علم کے غیر مادی وجود کو محسوس کرنے کے لیے اسے کتاب پر منتقل کیا جاتا ہے جہاں یہ محفوظ بھی ہو جاتا ہے اور پھر دوسروں تک بھی پہنچ پاتا ہے۔ اللہ کی ذات میں تمام مخلوقات اور اشیائے عالم کا علم غیر مادی صورت میں موجود تھا۔ یہ 'علم' ہی ان اشیاء کی کُلی اور اجمالی صورت ہے جو ابھی کُھلی نہیں۔ اس علم کو اپنے اظہار کے لیے اور آگے منتقل ہونے کے لیے کتاب کی ضرورت ہے۔ اللہ نے اپنے علم سے ہی لوحِ محفوظ

کو تخلیق کیا (کیونکہ کتاب کی تخلیق بھی علم کی وجہ سے ہی ہوئی)۔ اس لوحِ محفوظ کی تخلیق کے لیے نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو روحِ قدسی میں ڈھالا جس میں علم کو منتقل کیا گیا۔ علم جب تک ذہن میں ہوتا ہے تو ایک ہی جگہ اکٹھا 'کُل' کی صورت میں ہوتا ہے لیکن جب کتاب پر منتقل ہوتا ہے تو تفصیلاً ظاہر ہو جاتا ہے۔ پس اشیائے عالم کا پہلا وجودِ کُل اور اجمال کی صورت میں ذاتِ حق تعالیٰ اور نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یا قلم میں پوشیدہ تھا اس لحاظ سے قلم اور ذات میں مناسبت اور مشابہت ہے۔ ذات سے اشیاءِ عالم کا وجود تفصیلی علم کی صورت میں لوحِ محفوظ یا روحِ قدسی میں منتقل ہوا۔ ذات سے علم ظاہر ہوا، نور روحِ قدسی میں ڈھلا اور قلم سے علم لوح پر منتقل ہوا، اجمال نے تفصیل پائی اور کُل سے جز کے اظہار کا آغاز ہو گیا۔ یہ سب ذات کے صرف پہلی مرتبہ نزول پر ہوا۔ ذاتِ حق تعالیٰ سے نورِ محمد یا قلم کے ظاہر ہونے کو ذات کا نزول نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہاں ذات نے نزول نہیں کیا بلکہ ذات نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صورت میں ''ظاہر'' ہوئی۔ نزول اس کے بعد کیا جب قلم سے علم لوحِ محفوظ پر منتقل ہوا یا نور روحِ قدسی میں ڈھلا۔ اس تفصیلی اظہار کے لحاظ سے 'علم' کی لوحِ محفوظ سے مناسبت اور مشابہت ہے۔

☆☆☆☆☆☆

فَكَمَا عَلِمْتَ اَنَّ لِعَالِمِ الْاَمْرِ كِتَابًا مُجْمَلًا مُلَقَّبًا بِاُمِّ الْكِتَابِ وَ كِتَابًا مُفَصَّلًا مَوْسُوْمًا بِالْكِتَابِ الْمُبِيْنِ وَ الْكِتَابُ الْمُجْمَلُ هُوَ الْعَقْلُ وَالْكِتَابُ الْمُبِيْنُ هُوَ اللَّوْحُ الْمَحْفُوْظُ فَاِعْلَمْ كَذٰلِكَ اَنَّ لِعَالَمِ الْمُلْكِ كِتَابًا مُجْمَلًا هُوَ الْعَرْشُ وَ كِتَابًا مُفَصَّلًا هُوَ الْكُرْسِيُّ۔

ترجمہ: پس جب تم نے معلوم کیا کہ عالمِ امر کے واسطے ایک مجملِ کتاب ہے جس کا لقب اُمّ الکتاب ہے اور مفصل کتاب ہے جس کا نام کتاب مبین ہے۔ اور کتابِ مجمل عقل ہے اور کتابِ مبین لوحِ محفوظ ہے۔ ایسے ہی جاننا چاہیے کہ عالمِ ملک کے واسطے ایک مجمل کتاب ہے وہ عرش

ہے اور ایک مفصل کتاب ہے وہ کرسی ہے۔

شرح: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ اللہ تعالیٰ کے تمام مخلوقاتِ عالم میں بوساطتِ ذات محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نزول کے مراتب بیان کر رہے ہیں۔ مرآۃ العارفین میں بیان کی گئی تفصیل کے مطابق ہی صوفیاءِ کرام نے اللہ کے نزول کے تنزلاتِ ستہ بیان کیے۔ اگر اس کتاب کی شرح پڑھتے ہوئے تنزلاتِ ستہ کو ذہن میں رکھا جائے جو پچھلے صفحات میں بیان کیے جا چکے ہیں، تو حقیقت کو سمجھنا نسبتاً آسان ہو جائے گا۔ قارئین کی سہولت کے لیے انہیں یہاں دہرایا جا رہا ہے۔

نزول کے سات مراتب میں پہلے تین عالمِ امر کے مراتب ہیں اور باقی تین عالمِ خَلق کے ہیں اور ساتواں مرتبہ خود انسانِ کامل یا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مبارک ذات ہے جس میں ذاتِ حق تعالیٰ نے کامل و مکمل طور پر جلوہ گر ہو کر اپنے نزول اور ظہور کو مکمل فرمایا جیسا کہ اس نے قرآن میں سات مقامات پر فرمایا کہ: ''میں نے کائنات کو چھ ادوار میں مکمل کیا اور پھر عرش پر استویٰ فرمایا۔'' عرش سے مراد کوئی مقام یا جگہ نہیں بلکہ قلبِ مومن ہے جیسا کہ حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ قلب المومن عرش اللّٰہ تعالٰی۔ ''مومن کا قلب اللہ کا عرش ہے''۔ اور چھ ادوار سے مراد تین دور یا مراتب عالمِ امر کے ہیں اور تین عالمِ خلق کے ہیں۔

عالمِ امر سے مراد وہ عالم ہے جہاں اشیائے عالم کو علیحدہ علیحدہ ایسا کوئی وجود عطا نہیں ہوا جو اس کی شناخت کا باعث بن سکے۔ یہ ذاتِ محمد یا قلب محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے باطن میں موجود تو ہیں لیکن نہ انہیں جداگانہ حیثیت سے دیکھا جا سکتا ہے نہ چھوا جا سکتا ہے۔ ان کے متعلق تفصیل تو واضح ہو چکی، اور ان کے متعلق علمی نوعیت کا تمام ابتدائی کام مکمل ہو چکا، اب ان کا تخلیق ہونا باقی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کسی بھی شے کی تخلیق کا کام پہلے انسانی ذہن میں مکمل ہوتا ہے جہاں اسے چھوا یا دیکھا نہیں جا سکتا، یا بیج سے درخت پھوٹنے سے قبل تمام تبدیلیاں اس بیج کے اندر ہی پوشیدہ طور پر رونما ہوتی ہیں اور پھر اس کے بعد ظاہری تخلیق کا عمل شروع ہوتا ہے۔

عالمِ امر کے تین مراتب کُنْتُ۔ کَنْزًا۔ مَخْفِیًا ہیں۔ کُنْتُ یعنی 'میں تھا' مراد ذاتِ حق تعالیٰ

ہے۔ کَنْزًا یعنی ''خزانہ'' مراد نورِ محمد ﷺ یا قلم ہے جو اللہ کا علم منتقل کرنے کا ذریعہ ہے۔ مَخْفِیًا یعنی ''چھپا ہوا'' مراد روحِ قدسی یا لوحِ محفوظ جہاں قلم سے علم منتقل تو ہو چکا اور کامل و مکمل طور پر ہو چکا لیکن یہ تمام مخلوقاتِ عالم کا علم ابھی پوشیدگی کی حالت میں ہے اور ظاہر نہیں ہوا یا یوں کہا جائے کہ اس علم کے مطابق ابھی مخلوقات کی تخلیق کا آغاز نہیں ہوا۔ عالمِ امر میں ''قلم'' یا نورِ محمد ﷺ ''اُم الکتاب'' ہے کیونکہ یہاں اس میں تمام علم جامع اور مجمل حالت میں موجود ہے۔ اس قلم کے بطن میں تمام مخلوقات کا وجود پوشیدہ ہے۔ یہ قلم یا نورِ محمد ﷺ عالمِ امر کیلئے کتابِ مجمل یا اُم الکتاب ہے۔ جب اس قلم سے مخلوقاتِ عالم کا وجود، جو ابھی صرف علم کی صورت میں ہے، لوحِ محفوظ یا روحِ قدسی میں تفصیلاً منتقل ہو گیا تو لوحِ محفوظ یا روحِ قدسی کتابِ مبین یا کتابِ مفصل کہلائی۔ مندرجہ بالا عبارت میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ کتابِ مجمل یا اُم الکتاب کو ''عقل'' کہہ رہے ہیں۔ عقل بھی ذاتِ محمد ﷺ ہی ہے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''اوّل ما خلق اللّٰہ قلم'' ''اللہ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا اور فرمایا'' اول ما خلق اللّٰہ العقل'' اللہ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا کیا اور فرمایا'' اول ما خلق اللّٰہ روح نبیك یا جابرؓ'' اے جابرؓ اللہ نے سب سے پہلے تیرے نبی ﷺ کی روح کو پیدا فرمایا۔'' قلم، عقلِ کُل، روحِ کُل یا روحِ قدسی سب سے مراد صرف ایک ہی ذات یعنی نورِ محمد ﷺ یا حقیقتِ محمدیہ ﷺ ہے۔ اسی سے تمام مخلوقات کی ارواح تخلیق ہوئیں اور اسی سے انہیں اپنے اپنے حصے کی عقل، علم، حیات، غرض ہر شے ملی۔ یہی مبدا اور منبع ہے ہر اس شے کا جو تمام عالمین میں ظاہری یا باطنی کسی بھی حالت میں وجود رکھتی ہے، خواہ عقل و شعورِ انسانی اس سے واقف ہے یا نہیں۔

عالمِ امر میں جو کتابِ مفصل ہے وہ عالمِ خلق کے ابتدائی مرتبے یعنی عالمِ مِلک جہاں ارواح کی تخلیق ہوئی، میں کتابِ مجمل ہے۔ لوحِ محفوظ یا روحِ قدسی عالمِ امر کا تیسرا مرتبہ ہے جہاں علم مفصل صورت میں موجود ہے۔ اسی علم کی بنیاد پر عالمِ ملک میں مخلوقات تخلیق ہوئیں۔ عالمِ امر کے تیسرے مرتبے یعنی عالمِ لاھوت سے عالمِ خلق کے پہلے مرتبے یعنی جبروت میں نزول کے دوران

یہ روحِ قدسی یا روحِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قلبِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں ڈھل گئی۔ مخلوقاتِ عالم کا جو علمی وجود روحِ قدسی میں مفصل صورت اختیار کر گیا تھا اب قلبِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں منتقل ہوا۔ عالمِ جبروت میں قلبِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کتابِ مجمل بنا کیونکہ اب اس میں تمام علمِ حق و خلق مجمل صورت میں جمع ہو گیا ہے جہاں سے اگلے مرتبے میں نزول کے دوران اسے مزید تفصیل حاصل ہو گی۔ جیسے قلم سے لوح کی تخلیق کے دوران نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم روحِ قدسی کی صورت میں ظاہر ہوا تھا اسی طرح روحِ قدسی سے جب قلبِ محمد کی صورت میں ذاتِ حق تعالیٰ نے نزول فرمایا تو لوح سے عرش تخلیق ہوا۔ نزول کی ترتیب کے مطابق نور سے روحِ قدسی اور روحِ قدسی سے قلب تخلیق ہوا اور ساتھ ساتھ قلم سے لوحِ محفوظ اور لوحِ محفوظ سے عرش ظاہر ہوا۔ چنانچہ عرش اور قلبِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تخلیق ایک ہی مقام پر ہوئی اور مخلوقاتِ عالم کے وجود اور ان کے متعلق علم نے ایک درجہ مزید نزول کیا۔ اب یہ علم روحِ قدسی سے قلب میں منتقل ہو کر اس میں جمع ہو چکا ہے یا لوحِ محفوظ سے نزول کر کے عرش پر ظاہر ہو چکا ہے۔ یہ قلبِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم عرشِ اللہ ہے کہ اس میں نہ صرف تمام ارواح کے قلوب کا جوہر موجود ہے بلکہ یہ ہی تمام قوتوں حیات، علم، سمع، بصر وغیرہ کا سرچشمہ ہے۔ یہی اصل سمیع، بصیر، علیم، خبیر ہے اور اسی سے تمام مخلوقات جو ابھی تخلیق کے عمل سے گزر رہی ہیں، کو ہر طرح کی ضروری قوت مہیا کی جائے گی۔ اس لحاظ سے عرش عالمِ ملک کے لیے اُم الکتاب یا کتابِ مجمل ہوا جس میں ہر قوت جمع ہے۔

عرش کو اگر ایک وجود سمجھا جائے تو وہ وجود بیشک صرف قلبِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے لیکن جب انسانی ذہن 'عرش' کا تصور کرتا ہے تو کوئی بے انتہاء وسیع و عریض مقام ذہن میں آتا ہے جو انوارِ الٰہی سے جگمگا رہا ہے۔ جہاں ہر طرف تجلیاتِ الٰہیہ کی رونق ہے اور اللہ ان تجلیات کی صورت میں اس پر جلوہ افروز ہے۔ اس تصور کو سامنے رکھتے ہوئے بھی صرف قلبِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی وہ مقام دکھائی دیتا ہے جو عرشِ الٰہی کہلانے کے لائق ہے کیونکہ اس مقام سے زیادہ کسی بھی عالم کا کوئی بھی مقام تجلیاتِ الٰہیہ کی آماجگاہ نہیں ہے۔ انوارِ الٰہی جیسے یہاں جگمگا رہے ہیں کہیں اور نہیں ہیں۔ اس سے وسیع و

عریض کوئی مقام نہیں ہوسکتا کہ جہاں اللہ کی سمائی ہوجائے۔ عالمِ ملک یا عالمِ خلق کے پہلے مرتبے یعنی عالمِ جبروت میں یہ انوارِ الٰہی سے معمور قلب کتابِ مجمل ہے کیونکہ اب اسی عالم میں اسی قلب سے انوارِ الٰہی پھوٹ کر ارواح کی صورت اختیار کریں گے۔ اب اس روح کے جوہر یعنی قلب سے تمام ارواحِ انسانی کو تخلیق ہونا ہے۔ لیکن ہر روح میں قلب ایک ہی ہوگا یعنی قلبِ محمد ﷺ جس کی موجودگی کی وجہ سے ہر روح کو علم، حیات، سمع، بصر، وغیرہ کی قوتیں تا ابد ملتی رہیں گی۔ یہ قلبِ محمد ﷺ کائنات کے ہر ذرے کا قلب ہے، ہر ذرے کی قوت ہے اور اس طرح اپنی وسعت کے لحاظ سے اللہ کا عرش ہے اور اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو تمام کائنات تمام عالم اللہ کا عرش ہے کہ ہر جگہ قلب و نور و روحِ محمد ﷺ یعنی روحِ قدسی کی جلوہ آرائیاں ہیں۔ سبحان اللہ!
عالمِ جبروت میں اس قلبِ محمد ﷺ سے جب ارواح تخلیق ہو چکیں تو وہ علم جو قلب میں مجمل تھا ظاہر ہو گیا۔ اجمال سے تفصیل کی طرف اگلا قدم اٹھا۔ کتاب مجمل کھل کر کتاب مفصل ہو گئی۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنے محبوب کے قلب کے جوہر سے تخلیق شدہ ارواحِ انسانی کو اپنے روبرو آراستہ کیا۔ ہر روح کی ہر قوت اور مکمل وجود نور و روح و قلبِ محمد ﷺ سے ہے۔ چنانچہ قلبِ محمد یا عرشِ اللہ ان تمام ارواح کے تمام تر وجود کا مکمل احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کا جمال، جلال، قدرت، عظمت ان تمام ارواح پر حاوی ہے۔ اس کی گرفت اور قدرت ان ارواح پر کامل ہے۔ وہ کیا ہیں کیسی ہیں، کیسی ہونگی، کیا کہیں گی، کیا سنیں گی، کیا کریں گی، ان کے دِل سے کیا کیا خیال گزریں گے الغرض ان کے اوّل، آخر، ظاہر، باطن، آغاز، انجام ہر شے کی خبر قلبِ محمد ﷺ میں ہر تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ کچھ بھی اس کے احاطہ اور قدرت سے باہر نہیں۔ اس کی عظمت وجلال ان سب کا احاطہ کیے ہے۔ وہ خود ان کی سمع، بصر، حیات، علم ہے اسی لیے وہ ان کی مکمل خبر رکھتا اور خبیر ہے۔ پس اس کی یہ عظمت، قدرت اور احاطہ ہی 'کرسی' ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے:

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔ (البقرہ۔255)

ترجمہ: وہ علم رکھتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے (ان کا آخر یا ظاہر) اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے (ان کا آغاز یا باطن)۔ اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے۔ اس کی کرسی کی وسعت نے زمین و آسمان کو گھیر رکھا ہے۔

پس کرسی کے مقام سے مراد ان تمام پوشیدہ قوتوں کا، جو عرش یا قلبِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں مجمل تھیں تفصیلاً ارواح کی صورت میں ظاہر ہو جانا ہے اس لیے کرسی عالمِ مِلک میں کتابِ مفصل ہے۔ اللہ کی ''کرسی'' یا اللہ کی تمام مخلوقات پر قدرت و احاطہ کا اظہار ارواح کے ظہور کے بعد ہوا۔ اللہ سے نورِ محمد، نورِ محمد سے روحِ قدسی پھر روحِ قدسی سے قلبِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک وجود ایک ہی رہا، کوئی دوسری شے نہ تھی جس پر اس کی قدرت، یا احاطے یا عظمت کا مقابلتاً اظہار ہوتا۔ ذات ہی نور میں ظاہر ہوئی اور نور ہی روحِ قدسی اور قلب میں ڈھلا۔ نور اور روحِ قدسی ذاتِ حق تعالیٰ کا آئینہ ہیں اس لیے عظمت و قدرت کا اب تک اظہار نہ ہو پایا۔ جب ارواح کی تخلیق ہوئی جنہیں علم، حیات، سمع، بصر میں سے حکم و منشاءِ الٰہی کے مطابق حصہ ملا تو ہی اللہ کے علم، حیات، سمع و بصر وغیرہ کا ان تمام پر احاطہ، وسعت اور قدرت ظاہر ہوئی۔ پس ارواح کا تفصیلاً ظہور، کرسی کا ظہور ہے اس لیے اب کرسی کتابِ مفصل ہے۔

سورہ النور کی آیت 35 میں اللہ فرماتا ہے: اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِہٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ۔

ترجمہ: اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا۔ اس کے نور کی مثال ایک طاق کی مثل ہے جس میں چراغ ہو اور چراغ شیشے کی قندیل میں ہو اور (قندیل کے اندر یہ چراغ) ایک درخشندہ ستارے کی مانند روشن ہے۔'' یہ آیتِ مبارکہ بھی اللہ کے نور کے تمام مخلوقاتِ عالم میں نور و قلبِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے توسط سے پھیل جانے کی دلیل ہے۔ مصباح یعنی چراغ نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے جو تمام ترعالمین کی نورانیت کا منبع و مصدر ہے۔ یہ چراغ شیشے کی قندیل زجاجہ میں ہے زجاجہ قلبِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے۔ چراغ سے پھیل کر نور نے قندیل یا قلب کی صورت اختیار کی۔ یہ نور یا چراغ کا اجمال سے تفصیل

کی طرف سفر ہے۔ یہ قندیل ایک طاق میں رکھی ہے۔ نور قندیل میں سے نکل کر طاق میں پھیل رہا ہے۔ طاق عرش وکرسی ہے جہاں نور مزید پھیلا اور اسے اجمال سے تفصیل حاصل ہوئی۔ اور پھر اس نور کو مزید پھیلاؤ اور تفصیل حاصل ہوئی اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے بعد یہ زمین وآسمان اور تمام مخلوقات میں پھیل گیا۔

☆☆☆☆☆☆

فَبِاعْتِبَارِ اِنْدِرَاجِ مَايُرِيْدُ اَنْ يُّفَصَّلَ فِي الْكُرْسِيِّ مَا كَانَ فِي الْعَرْشِ مُجْمَلاً يُّقَالُ لَه اُمُّ الْكِتَابِ وَبِاعْتِبَارِ تَفْصِيْلِ مَاكَانَ فِي الْعَرْشِ مُجْمَلاً فِي الْكُرْسِيِّ يُقَالُ لَهُ الْكِتَابُ الْمُبِيْنُ فَبَيْنَ الْعَرْشِ وَالْقَلَمِ مُضَاهَاةٌ مِنْ جِهَةِ الْاِجْمَالِ وَكَوْنُ الْاَشْيَآءِ فِيْهِمَا عَلَى الْوَجْهِ الْكُلِّيِّ وَكَذٰلِكَ بَيْنَ الْكُرْسِيِّ وَ اللَّوْحِ مُنَاسَبَةٌ مِنْ جِهَةِ مَظْهَرِ يَّتِهِمَا وَمِنْ جِهَةِ تَقْسِيْمِ اَمْرٍ وَّاحِدٍ فِيْهِمَا بِالْقِسْمَيْنِ وَمِنْ جِهَةِ ظُهُوْرِ الْاَشْيَاءِ فِيْهِمَا عَلَى الْوَجْهِ الْجُزْئِيِّ وَالتَّفْصِيْلِيِّ۔

ترجمہ: پس جس چیز کو کرسی میں تفصیل سے ظاہر کرنے کا ارادہ کرتا ہے (اللہ) اس کے عرش میں مجملاً درج ہونے کے اعتبار سے عرش اُم الکتاب ہے اور جو کچھ عرش میں مجمل ہے، اس کے کرسی میں تفصیل (سے ظاہر ہونے) کے اعتبار سے کرسی کتابِ مبین ہے۔ پس اجمال کی جہت سے عرش اور قلم میں مشابہت ہے کیونکہ ان میں اشیاء کُلی صورت میں ہیں۔ اور اسی طرح کرسی اور لوح میں (تفصیلاً) ظہور کی جہت سے، اور اس لحاظ سے کہ امرِ واحد اِن میں دو قسموں میں تقسیم ہوا اور ان دونوں قسموں میں ظہور اشیاء کی جزئی اور تفصیلی جہت سے مشابہت ہے۔

شرح: واضح ہو کہ جس چیز کو اللہ ظاہر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے وہ اس کی اپنی ذات ہے جیسا کہ اس

نے حدیثِ قدسی میں فرمایا کہ ''جب میں نے ظاہر ہونے کا ارادہ فرمایا تو میں نے مخلوق کو تخلیق کیا۔'' اس ارادے کی وجہ اور سبب نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے جس کے بطور آئینہ الٰہی رونما ہونے کے بعد اللہ نے اس میں اپنا حسن ملاحظہ کیا اور چاہا کہ اس حسن کو زیادہ سے زیادہ پہچانا جائے اور اس کی تعریف و تسبیح کی جائے۔ اپنی ذات کے اظہار کے ارادے کو ہی عملی جامہ پہناتے ہوئے درجہ بدرجہ نزول کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اشیائے عالم میں ظہور فرمایا۔ اس نزول کے دوران وہ اجمال سے تفصیل کی طرف سفر کرتا رہا۔ ایک مرتبے کے اجمال نے جب تفصیل پائی تو یہی تفصیل اگلے مرتبے کے لیے اجمال بنی اور پھر اس نے مزید تفصیل پائی۔ پھر یہ تفصیل اگلے مرتبے کے لیے اجمال بنی اور اسے مزید تفصیل حاصل ہوئی اور یونہی وحدت سے کثرت کی طرف اللہ نے نزول کیا۔ چنانچہ ذات، جو اپنے ہی اندر پوشیدہ تھی اور اجمال کی حالت میں تھی، کو نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اظہار اور تفصیل ملی۔ نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جس میں تمام مخلوق اور اس کے متعلق تفصیل مجمل اور کُل کی حالت میں پوشیدہ تھی، قلم اور اُم الکتاب کہلایا تمام عالم کے بیان ہونے سے پہلے۔ اس بیان کے آغاز کے طور پر نور کو روحِ قدسی میں ڈھالا گیا اور قلم سے تمام عالم کے متعلق علم نسبتاً تفصیل کے ساتھ لوحِ محفوظ پر منتقل کیا گیا۔ اس طرح تفصیل کے اعتبار سے لوحِ محفوظ یا روحِ قدسی کتابِ مبین کہلائی۔ اگلے مرتبے پر اسی روحِ قدسی یا لوحِ محفوظ میں موجود علمِ عالم کو مزید تفصیل حاصل ہوئی۔ اس لحاظ سے اس مرتبے پر لوحِ محفوظ یا روحِ قدسی اُم الکتاب کہلائی اور یہاں اس سے قلبِ محمد تخلیق ہوا جو عرشِ الٰہی ہے اور جو اس مرتبے پر تو کتابِ مبین ہے لیکن اگلے مرتبے کے لیے اُم الکتاب ہوگا کیونکہ یہاں تو اسے اپنی اُم الکتاب یعنی روحِ قدسی یا لوحِ محفوظ کی نسبت تفصیل حاصل ہوئی ہے لیکن اگلے مرتبے پر یہ مزید پھیلے گا اور خود اُم الکتاب بن کر اگلے مرتبے کی کتابِ مبین کو ظاہر کرے گا۔ جب یہ اور زیادہ پھیلا اور مزید تفصیل سے مخلوق کی ارواح کی صورت ظاہر ہوا تو اس کی قوت و وسعت ''کرسی'' کہلائی اور اسی اعتبار سے اس مرتبے پر کرسی کتابِ مبین ہوئی جس کے لیے اُم الکتاب عرش تھا۔ اس لحاظ سے عالمِ امر کے ''قلم'' اور عالمِ خلق کے عرش میں

مناسبت ہوئی کیونکہ ان دونوں عالموں کے لیے یہ اُم الکتاب ہیں، اور انہی سے اجمال نے تفصیل پائی۔ اسی طرح عالمِ امر کی ''لوح'' اور عالمِ خلق کی کرسی میں مشابہت ہے کیونکہ یہاں اجمال تفصیل کی صورت اختیار کر چکا ہے اور دونوں اپنے اپنے عالم کے لیے کتابِ مبین ہیں۔

''امرِ واحد کے دو قسموں میں تقسیم'' ہونے سے مراد ذات کا ظاہری اور باطنی صورت میں تقسیم ہونا ہے۔ جب تک اللہ تنہا تھا وہ واحد تھا۔ اس کا ظاہر ہی اس کا باطن تھا۔ یا یہ کہ دونوں میں کوئی تخصیص نہ تھی۔ نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، روحِ قدسی اور قلبِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صورت میں بھی ذات اب تک واحد ہی ہے۔ لوح بھی واحد ہے قلم بھی واحد ہے لیکن عالمِ خلق میں ارواح کی تخلیق پر کرسی کی عظمت، وسعت اور قدرت مخلوق پر تفصیلاً ظاہر ہوئی۔ اس مقام پر ایک قلبِ محمد، ایک نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایک روحِ قدسی سے تمام ارواح کی تخلیق ہوئی۔ پہلے نور ہی روحِ قدسی اور قلب میں ڈھلا تھا لیکن روحِ انسانی کی تخلیق پر نور اور قلب جدا ہو گئے اور روحِ قدسی ان میں چھپ گئی جیسے درخت کی تخلیق پر بیج اس میں چھپ جاتا ہے۔ روحِ انسانی کے وجود میں نور اور قلب کی اپنی اپنی حیثیت اور حقیقت ہے جیسا کہ سورہ النور کی مندرجہ بالا آیت مبارکہ میں نور کی مثال روشن چراغ سے دی گئی اور قلب کی مثال اس کے گرد ایک قندیل یا فانوس سے دی گئی۔ کرسی کے اس مقام پر ایک وجودِ واحد سے دو وجود کی تخلیق شروع ہوئی اور مخلوق کی تخلیق مکمل ہونے پر یہ تقسیم مخلوق کے ظاہری وجود اور باطنی وجود کی صورت میں کامل تفصیل کے ساتھ ظاہر ہوگئی۔

امرِ واحد یا نفسِ واحد کی دو قسموں میں تقسیم یوں تو نورِ الٰہی سے نورِ محمد کی تخلیق کے وقت ہی ہو گئی تھی۔ نورِ الٰہی باطن تھا اور نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کا ظاہر تھا۔ ربّ تعالیٰ خالق تھا نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مخلوق تھا لیکن وجود ایک ہی تھا اور دو علیحدہ علیحدہ وجود نہ تھے۔ دو وجود میں تقسیم کا پہلا اظہار کرسی کے مقام پر ہوا جب ربّ اور مخلوق بالکل جدا ہو چکے، نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور قلب ان ارواح کا باطنی وجود ہو گیا اور روحِ انسانی ظاہری وجود۔ یہ تقسیم دنیا میں آنے پر ظاہری جسم کی تخلیق پر بالکل مکمل ہوگئی۔ اصل وجود اب بھی ایک ہے یعنی نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جو مخلوق کا اصل جوہر ہے، لیکن کثرت، رنگا رنگی، پہچان اور بعض کو

بعض پر فضیلت دینے کی خاطر مخلوق کے دو وجود تخلیق کیے گئے اور یوں ایک وجود دو صورتوں میں ظاہر ہوا' ایک ظاہری اور ایک باطنی۔ اس باطنی وجود یعنی نورِ قلبِ محمد ﷺ کی ہر شے کے ظاہری وجود میں موجودگی کی بدولت ہی کائنات کی ہر شے اپنے خالق کی تسبیح کر رہی ہے خواہ وہ ظاہری طور پر کیسا ہی نجس یا ناپاک وجود رکھتی ہو۔ جیسا کہ اللہ فرماتا ہے: ترجمہ "ساتوں آسمانوں اور زمین اور وہ سارے موجودات جو ان میں ہیں، اللہ کی تسبیح کرتے ہیں اور (جملہ کائنات میں) کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تمہیں ان کی تسبیح کا شعور نہیں"۔ (بنی اسرائیل۔44)

ظاہری وجود اس تسبیح سے بے خبر ہے لیکن باطنی وجود یعنی نورِ محمد ﷺ نے جو پہلی بار رب تعالیٰ کی پاکی اور حمد بیان کی تو آج تک اسی تسبیح میں مصروف ہے۔ کامل سعادت اس انسانی وجود کے لیے ہے جس کا ظاہری وجود بھی اپنے باطن سے واپس مل جائے، پھر دو سے ایک ہو جائے اور دونوں وجود یک زبان ہو کر ربِ دوجہان کی تسبیح بیان کریں۔ اگر باطنی وجود تسبیح کرتا ہے اور ظاہری وجود نہ کرے تو ظاہری انسان کو اس تسبیح سے غفلت کے باعث کوئی اخروی نفع حاصل نہیں ہوتا البتہ اس نورِ محمدی ﷺ کے ہر وجود کے باطن میں موجودگی اور تسبیح کی وجہ سے ہی اللہ تعالیٰ ہر مخلوق کا پروردگار اور رازق ہے اور ہر ایک پر رحم کرتا ہے خواہ وہ کافر ہو یا مسلمان۔ اگر ظاہری وجود اپنے ربّ کی تسبیح زبان سے تو کرے لیکن باطنی وجود کی تسبیح سے یک زبان ہوئے بغیر، یا اس تک پہنچے اور اس کی تسبیح کو پہچانے بغیر محض رسمِ تسبیح ادا کرے تو بھی یہ عبادت کامل نہ ہوگی۔ حقیقی عبادت و تسبیح صرف تب ہی ممکن ہے جب ظاہری وجود اور باطنی وجود یکجا ہو کر کامل تسبیح کریں، جیسا کہ ازل میں تھا۔

☆☆☆☆☆☆
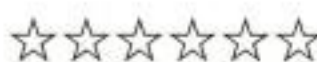
فَالْعَرْشُ مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ فِي الْمَرْتَبَةِ الْحِسِيَّةِ مِرْاٰةُ الْقَلَمِ فَمَا فِي

الْقَلَمِ مُنْدَرِجٌ عَلَى الْوَجْهِ الْكُلِّيِّ وَالْإِجْمَالِيِّ فَهُوَ فِي الْعَرْشِ مُنْدَرِجٌ كَذٰلِكَ وَالْكُرْسِيُّ أَيْضًا مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ فِي الْمَرْتَبَةِ الْحِسِّيَّةِ مِرْاٰةُ اللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ فَمَا فِي اللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ ثَابِتٌ عَلَى الْوَجْهِ الْجُزْئِيِّ وَالتَّفْصِيْلِيِّ فَالْقَلَمُ الْمُكَنّٰى بِالْعَقْلِ أُنْمُوْذَجُ الذَّاتِ وَمِرْاٰتُهَا وَمَظْهَرُهَا وَمَنَصَّتُهَا وَمُجَلَّاهَا وَاللَّوْحُ الْمُسَمّٰى بِالنَّفْسِ أُنْمُوْذَجُ الْقَلَمِ وَمِرْاٰتُه، وَمَظْهَرُهٗ وَمَنَصَّتُهٗ وَمُجَلَّاهُ وَالْعَرْشُ أُنْمُوْذَجُ الْقَلَمِ وَمِرْاٰتُه، وَمَظْهَرُهٗ وَمَنَصَّتُهٗ وَمُجَلَّاهُ وَالْكُرْسِيُّ أُنْمُوْذَجُ اللَّوْحِ وَمِرْاٰتُه، وَمَظْهَرُهٗ وَمَنَصَّتُهٗ وَمُجَلَّاهُ۔

ترجمہ: پس عرش اس وجہ سے مرتبہ حسی میں قلم کا آئینہ ہے سو وہ چیز جو قلم میں داخل ہے' اوپر وجہ کلی کے اور اجمالی کے' وہی عرش میں داخل ہے۔ اسی طرح کرسی بھی مرتبہ حسی میں لوحِ محفوظ کا آئینہ ہے۔ سو وہ چیز جو لوحِ محفوظ میں ثابت ہے اوپر وجہ جزئی اور تفصیلی کے وہی کرسی میں ثابت ہے اوپر وجہ جزئی اور تفصیلی کے۔ پس قلم، جس کی کنیت عقل ہے ذات (حق تعالیٰ) کا آئینہ، اس کی جلوہ گاہ، جائے ظہور اور جائے وضاحت ہے۔ اور لوح، جس کا نام نفس ہے، قلم کا آئینہ، اس کی جلوہ گاہ، اس کی جائے ظہور اور جائے وضاحت ہے۔ اور عرش نمونہ ہے قلم کا اور اس کا آئینہ، جائے ظہور اور جائے وضاحت ہے اور کرسی نمونہ ہے لوح کا، اس کا آئینہ جائے ظہور اور جائے وضاحت ہے۔

شرح: مرتبہ حسی سے مراد محسوسات کے مراتب ہیں۔ عالمِ امر میں نورِ محمد ﷺ چھوا یا دیکھا تو نہیں جا سکتا لیکن درجہ بدرجہ نزول کے ساتھ وہ محسوسات کے عالم کی طرف بڑھ رہا ہے۔ محسوس کرنے کے لیے اشیاء کا دیکھا یا چھوا جانا ضروری نہیں ہے۔ ''احساس'' انتہائی لطیف شے یا جذبہ ہے جو خود بھی دیکھنے یا پکڑنے میں نہیں آ سکتا اور انہی چیزوں کو محسوس کرنے کے کام آتا ہے جو

دیکھی یا پکڑی نہیں جا سکتیں مثلاً محبت، نفرت، غصہ، خوشبو، کسی کی موجودگی وغیرہ۔ ذاتِ الٰہی جب تنہا تھی تو وہ مرتبہ حسی سے بھی ماورا تھی یعنی اسے محسوس بھی نہ کیا جا سکتا تھا کیونکہ اوّل تو محسوس کرنے کے لیے دو وجود ضروری ہیں۔ محسوس کرنے والا اور محسوس کیا جانے والا۔ اور دوسرے وہ لطافت کے اس انتہائی درجہ پر ہے جسے محسوس بھی نہیں کیا جا سکتا۔ نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب اس کے روبرو بطور آئینہ ظاہر ہوا تو ہی وہ محسوسات کی دنیا میں داخل ہوا اور سب سے پہلے جذبۂ عشق کا ظہور ہوا جسے محسوس کیا جا سکتا ہے اور علم کا بھی ظہور ہوا جس کا تعلق بھی محسوسات سے ہے۔ نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نورِ الٰہی کا جامع ہے اور اپنی جمعیت کی بنا پر ہی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ذاتِ الٰہی مرتبۂ حسی میں داخل ہوتی ہے۔ دنیا میں بھی نورِ الٰہی کو صرف ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ نورِ الٰہی کو دیکھنے یا محسوس کرنے کی کوئی اور صورت نہیں جیسا کہ اس نے خود سورۃ النور کی آیت مبارکہ میں اپنے نور کی مثال روشن چراغ سے دی اور تمام مفسرین حق اس بات پر متفق ہیں کہ روشن چراغ سے مراد صرف ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی ہیں۔ نورِ الٰہی کو دیکھا یا محسوس اس لیے بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کی تجلیات نہایت شدید اثر رکھتی ہیں، کسی انسان، خواہ وہ ولایت کے کسی بھی مقام پر ہو، کے لیے ممکن نہیں کہ نورِ الٰہی کو بالکل بے حجاب دیکھ لے۔ اگر نورِ الٰہی نورِ محمدی کا نقاب اوڑھے بغیر ظاہر ہو جائے تو کائنات کی ہر شے جل کر راکھ ہو جائے جیسا کہ سلطان العارفین حضرت سخی سلطان باھو رحمتہ اللہ علیہ رسالہ روحی شریف میں فرماتے ہیں ''جان لے! جب نورِ احدی نے وحدت کے حجلہ تنہائی سے کثرت کی طرف ظہور کا ارادہ فرمایا تو اپنے حسن و جمال کے جلوؤں کی گرم بازاری سے (دو عالم کو) رونق بخشی۔ اس کے حسن کی شمع پر کونین پروانے کی طرح جلنے لگے تو اس نے میم احمد کا نقاب اوڑھ کر صورتِ احمدی اختیار کر لی'' (رسالہ روحی شریف)

پس میم احمدی کا نقاب اللہ کے جمال کا مظہر ہے جس نے اللہ کے جلال کی سخت تجلیوں کو تمام عالموں کی مخلوق تک پہنچنے سے روکا ہے تاکہ وہ جل نہ جائیں۔ اسی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم رحمتِ عالم بھی ہیں۔ پس نورِ الٰہی کو نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نقاب کے بغیر نہ دیکھا جا سکتا ہے نہ

محسوس کرنے کی قوت کسی بھی مخلوق میں ہے۔ البتہ خود انسانِ کامل یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی وہ واحد ذات ہیں جنہوں نے اللہ کا مکمل دیدار اس کے جلال و جمال سمیت کیا اور بلا واسطہ بغیر کسی نقاب کے کیا۔ اپنی باطنی حیات میں بھی اور ظاہری حیات میں بھی شبِ معراج کے موقعہ پر۔

وحدت سے کثرت کی طرف سفر کے دوران نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب تفصیل کی طرف بڑھا تو وہ مراتبِ حِسی میں بھی آگے بڑھا یہاں تک کہ عالمِ محسوسات سے بڑھتے بڑھتے عالمِ اجسام کی دنیا میں ظاہر ہو گیا۔ پہلے مرتبۂ حِسی پر وہ قلم کی صورت ظاہر ہوا۔ نورِ محمد اور قلم اگرچہ ایک ہی ہیں لیکن نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم باطن اور قلم اس کی ظاہری یا حِسی صورت ہے۔ اسی طرح لوحِ محفوظ روحِ قدسی کی ظاہری یا حِسی صورت ہے، عرش قلبِ محمد کی اور کرسی نفس کی ظاہری یا حِسی صورت ہے اور باطن میں سب صرف نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے جو تفصیل اور محسوسات کے مراتب میں آگے بڑھ رہا ہے۔ ان مراتب میں اگلا مرتبہ پچھلے مرتبے سے جڑا ہوا یا مربوط ہے۔ اس طرح سے کہ جیسے نورِ محمدی نورِ الٰہی کا آئینہ ہے اسی طرح عرش قلم کا آئینہ ہے اور لوحِ محفوظ کرسی کا آئینہ ہے۔ پہلے مرتبے پر قلم جامع حالت ہے اور لوح تفصیلی حالت ہے۔ دوسرے مرتبے پر عرش جامع حالت ہے اور کرسی تفصیلی۔ یوں جامع ہونے کی وجہ سے قلم کا آئینہ عرش ہے اور تفصیلی حالت کی بنا پر لوح کا آئینہ کرسی ہے۔ قلم اور عرش نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جامع صورتیں ہیں اور لوح اور کرسی تفصیلی۔

ذاتِ حق سب سے پہلے نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یا قلم کی صورت ظاہر ہوئی جس میں تمام علمِ حق اور علمِ مخلوق پوشیدہ تھا اس لیے قلم، جسے عقل بھی کہا جاتا ہے کیونکہ قلم اور عقل ہی بنیاد ہیں ہر علمِ الٰہی کی منتقلی کی اور حدیثِ مبارکہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ

1) اللہ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا۔

2) اللہ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا فرمایا۔

اور ان دونوں سے مراد ایک ہی ذات یعنی نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے چنانچہ نورِ الٰہی کا ظہور نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یا قلم یا عقل کی صورت میں ہوا اس لیے قلم ذاتِ حق کی جلوہ گاہ بھی ہے جائے ظہور بھی، ظاہر ہونے کا

مقام بھی اور وہ مقام بھی جہاں ذاتِ حق کو تفصیل یا وضاحت حاصل ہوئی۔ قلم میں پوشیدہ تفصیل لوح پر ظاہر ہوئی اس لحاظ سے لوح قلم کا آئینہ، اس کی جلوہ گاہ، ظاہر ہونے کی جگہ اور وضاحت حاصل کرنے کا مقام ہے۔ عرش کے مقام پر قلم کا وہ علم جمع ہوا جو لوح پر ظاہر ہوا تھا۔ اس لیے عرش قلم کا آئینہ اور ظہور کی جگہ بھی ہے اور وہ مقام بھی جہاں سے اس علم کو مزید وضاحت حاصل ہو گی۔ کرسی کے مقام پر لوح میں موجود علم اور نور کو وضاحت حاصل ہوئی اس لحاظ سے کرسی لوح کا آئینہ، جائے ظہور اور جائے وضاحت ہے۔

جب ایک عام فہم رکھنے والا انسان نور، لوح، قلم، عرش، قلب، عقل، روح، علم، نفس وغیرہ کو سمجھنا چاہتا ہے تو اپنے ذہن کے مطابق ان کو کسی نہ کسی شکل اور ہیئت کے مطابق دیکھنا چاہتا ہے حالانکہ یہ سب وجود کسی بھی قسم کی ظاہری شکل اور ہیئت سے پاک ہیں۔ یہ سب عالمِ امر کی تخلیقات ہیں جہاں وجود موجود تو ہوتا ہے لیکن چھوا نہیں جا سکتا بلکہ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ اس دنیا کا سارا کاروبار علم اور عقل کی وجہ سے چل رہا ہے لیکن ان کو موجود ہونے کے باوجود دیکھا یا چھوا نہیں جا سکتا۔ اسی طرح نور، روح، قلم، عرش، قلب، لوح کا وجود ہے جس پر تمام حیات کی بنیاد ہے لیکن ان کی ہیئت کو انسانی ذہن کی محدود صلاحیت کے ذریعے سمجھنا ناممکن ہے۔

اگرچہ یہ تمام تر تفصیل تمام عالموں اور ان میں موجود تمام مخلوقات کی تخلیق کے متعلق ہے لیکن حقیقتاً یہ تمام عالم اور ان میں ظاہر ہونے والے تمام مراتب انسان کی ذات کے اندر ہی موجود ہیں۔ جیسا کہ اولیاء کرام انسان کی ذات کو عالمِ کبیر فرماتے ہیں جس میں تمام عالم موجود ہیں۔ حضرت ابراہیم الجیلی رحمتہ اللہ علیہ ''انسانِ کامل'' میں فرماتے ہیں: ''عالم انسان کے قلب (باطنی وجود) کا آئینہ ہے۔ قلب صورت اور اصل ہے اور عالم فرع و آئینہ ہے۔ صورت اور آئینہ میں سے ہر ایک دوسرے کا عکس ہے۔'' یعنی انسان کی ذات میں ہر عالم کی ہر تفصیل جامع حالت میں موجود ہے اور اسی کی ذات کا پرتو تمام عالم میں ظاہر ہے۔ چنانچہ یہ تمام تر تفصیل حقیقتاً انسان کی ذات کی تفصیل ہے۔ ''مرآۃ العارفین'' لکھنے سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ کا مقصد انسان کو عالموں کی تخلیق

کے حوالے سے اپنی ذات کو پہچاننے کی ترغیب دینا ہے۔ جس نے مرآۃ العارفین کو صرف عالموں کی تخلیق کی تفصیل جانا اور اس کے ذریعے خود کو پہچاننے کی کوشش نہ کی اس نے اس تصنیف کے بنیادی مقصد کو نہ پایا۔

جس طرح انسان کے ظاہری جسم کی تخلیق صرف ایک واحد نطفہ سے ہوئی اسی طرح باطنی انسان کی تخلیق ایک واحد نورِ الٰہی سے ہوئی۔ جس طرح نطفہ انسان کی ایک جامع صورت ہے کہ اس میں تمام انسان کی تفصیل پوشیدہ ہے اور پھر اسی نطفہ نے تفصیل و وضاحت حاصل کی تو ایک خلیے سے بافتے (Tissues) بنے پھر بافتوں (Tissues) نے تفصیل حاصل کی تو پٹھے (Muscles) بنے، پھر پٹھے مل کر عضو بنے، عضو مل کر نظام بنے اور نظام مل کر پورا انسان بنا بالکل اسی طرح نورِ الٰہی سے نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روحِ قدسی، روحِ قدسی سے قلب، قلب سے نفس اور روح اور پھر روح مختلف مراتب سے گزر کر انسان میں ڈھلی۔ انسان کا اپنی حقیقت کو پالینے سے مراد اپنی اصل اپنے نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک واپس پہنچنا اور اپنے اندر اللہ کو پہچان کر خود کو پہچاننا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

فَالْعَقْلُ نُسْخَةُ الذَّاتِ وَاللَّوْحُ نُسْخَةُ الْعِلْمِ وَالْعَرْشُ نُسْخَةُ الْقَلَمِ وَالْكُرْسِيُّ نُسْخَةُ اللَّوْحِ وَ اَمَّا الْاِنْسَانُ الْكَامِلُ فَهُوَ نُسْخَةٌ جَامِعَةٌ لِّجَمِيْعِ الشَّيْخِ وَهُوَ الْمُسْتَخْرَجُ وَالْمُسْتَنْبَطُ مِنَ الْكُلِّ وَهُوَ الْجَامِعُ بَيْنَ الْحَقَآئِقِ الْاِلٰهِيَّةِ وَالْكَوْنِيَّةِ۔

ترجمہ: پس عقل نسخہ ذات کا ہے اور لوح نسخہ علم کا ہے اور عرش نسخہ قلم کا ہے اور کرسی نسخہ لوح کا ہے اور انسانِ کامل پس وہ کتابِ جامع ہے تمام نسخوں کا اور وہ نکالا گیا اور اخذ کیا گیا ہے کُل سے اور وہ جامع ہے درمیان حقائقِ الٰہیہ اور کونیہ کے۔

شرح: ذاتِ حق تعالیٰ کا پہلا اظہار نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم عقلِ کُل، علم کُل اور نور کُل ہے۔ اس کی

نورانیت کامل ہے لیکن اس نورانیت میں ابھی ظہورِ ذات کامل ہوتے ہوئے بھی مکمل نہیں کہ نور تو خود ذاتِ حق تعالیٰ کا وجود بھی ہے۔ وہ اس نور کا مجسم اظہار چاہتا ہے۔ اگر صرف نورانی وجود ہی ظہور کے لیے کافی ہوتا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نورانیت سے بشریت تک نورِ الٰہی مرتبہ در مرتبہ نزول کیوں کرتا۔ جب تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بشری وجود ظاہر نہ ہو جائے اظہارِ ذات حق تعالیٰ مکمل نہیں۔ نورانیت سے بشریت تک کے اس سفر میں اولاً واحد ذاتِ حق تعالیٰ سے تمام عالموں کا نور یعنی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ظاہر ہوا اور اس سے ظاہر ہوئے تمام عالم اور تمام عالموں کی مخلوقات۔ یعنی یہ نورِ حق تعالیٰ کے پھیلاؤ کا سفر تھا، عقلِ کُل سے عقلِ عالم، علمِ کُل سے علمِ عالم، نورِ کُل سے نورِ عالم کا سفر، مراتبِ اجمال سے مراتبِ تفصیل کا سفر تھا۔ سفر کا دوسرا حصہ نور کے واپس ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں سمٹ کر ظاہر ہو جانے کا سفر ہے جہاں ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بشری صورت اختیار کر لے اور تمام عالم کا نورِ علم وعقل اس ایک بشری وجود انسانِ کامل میں سمٹ جائے۔ یعنی پہلے حصے میں نورِ الٰہی Diverge[1] ہوا اور تمام عالم میں پھیلا اور دوسرے حصے میں Converge[2] ہو کر انسانِ کامل کی بشری صورت میں سمٹ آیا۔ جب تک انسانِ کامل کا بشری ظہور نہ ہوا نورِ ذات کا ظہور مکمل نہ ہوا۔

ذاتِ حق تعالیٰ کُل ہے جو عقل، علم اور قلم کی صورت ہر عالم میں ظاہر ہے اور جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا کہ عقل، علم اور قلم سے مراد صرف نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی ہے۔ چنانچہ ''عقل'' ذات کا اظہار بھی ہوئی اور اس ذات سے تخلیق کی جانے والی تمام مخلوقات کا نسخہ بھی۔ نسخہ سے یہاں وہی مراد ہے جو عام اردو زبان میں نسخہ کا معنی ہے یعنی کسی شے کے بنانے کی ترکیب یا طریقہ۔ نسخے میں وہ تمام بنیادی لوازمات (Ingredients) لکھے ہوتے ہیں جنہیں ملا کر کوئی شے خصوصاً دوا بنائی جاتی ہے۔ کسی شے یا دوا کے بنانے کا نسخہ ایک ہی ہوتا ہے اور جب بھی وہ شے یا دوا بنائی جائے گی اسی

---

[1] ایک نقطے یا ایک مقام سے نکلنے والی روشنی کا چاروں طرف پھیل جانا [2] روشنی کی شعاعوں کا ایک مقام پر جمع یا مرکوز ہو جانا

نسخے کے مطابق بنائی جائے گی۔ چنانچہ ذات کی تمام ترکیب (نسخہ) عقلِ کُل علمِ کُل یعنی نورِ محمد ﷺ میں ہے، علم کی تمام ترکیب لوح پر لکھی گئی۔ اور قلم میں موجود تمام مخلوقاتِ عالم کی تمام ترکیب عرش پر لکھی گئی۔ اور لوح پر لکھی گئی تمام ترکیب کی مزید تفصیل کرسی کے مقام پر ظاہر ہوئی۔ لوح اور عرش سے مراد روحِ قدسی اور قلبِ محمد ﷺ ہے جہاں علم و عقل و نور کے نسخے کے مطابق مخلوقاتِ عالم کی تفصیل لکھی گئی۔ علم و قلم و نور مرتبۂ اجمال، مرتبۂ کُل اور ذات کا پہلا اظہار، نزول یا مخلوقاتِ عالم کے لیے اُم الکتاب ہیں۔ لوح و روحِ قدسی اور عرش و قلب ایک طرف تو علم و عقل و نور کا تفصیل کی طرف پہلا قدم اور کتابِ مبین ہیں تو دوسری طرف مخلوقاتِ عالم کے لیے بنیاد، ترکیب، نسخہ اور اُم الکتاب ہیں۔ جب ان سے تمام عالم کی مخلوقات تخلیق ہو چکیں، ان تمام کے باطن میں موجود نورِ محمد ﷺ تمام عالم میں پھیل چکا تو اب اس نور کو واپس اپنی ہی ذات میں سمٹنا ہے۔ نور سے مخلوق کی تخلیق چھ ادوار میں ہوئی جیسا کہ تنزلاتِ ستہ کی تفصیل میں پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ یہ ادوار مرتبہ در مرتبہ (Step by Step) مکمل ہوئے لیکن ساتواں مرتبہ یعنی انسانِ کامل کی ذات میں نورِ عالم، عقلِ عالم، علمِ عالم کا واپس سمٹ آنا ایک ہی مرحلہ (Step) میں مکمل ہو گیا۔ اسی لیے اس ساتویں مرتبے کو تمام مراتب کا جامع کہا جاتا ہے کیونکہ نور کے پھیلنے کے سفر میں جو مراتب قدم بہ قدم طے ہوئے وہ تمام سمٹاؤ کے سفر میں ایک ہی قدم میں طے ہو گئے۔ اس قدم کو قرآن کریم میں ''استویٰ'' کے لفظ سے موسوم کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو چھ ادوار میں مکمل کیا اور پھر عرش پر اپنا استویٰ فرمایا۔ اور عرش سے مراد قلبِ محمد ﷺ ہی ہے اور قلبِ محمد ﷺ سے مراد قلبِ انسانِ کامل ہے جو ازل تا ابد عرشِ الٰہی ہے اور ہر زمانے میں مخلوقاتِ عالم کا باطن ہے لیکن انسانِ کامل کے لباس میں باطن بھی ہے اور ظاہر بھی ہے۔ اسی طرح انسانِ کامل کا نور ''تخلیق'' کا آغاز اور اُس کی بشریت ''تخلیق'' کی انتہا ہے۔ وہی اوّل وہی آخر وہی ظاہر وہی باطن۔ جو بات نور سے شروع ہوئی وہ بشر پر ختم ہوئی، ''ھُو'' سے شروع ہوئی ''عبد'' پر تکمیل پائی اور اس تمام سفر کا نتیجہ، لب لباب ہے ''عبدہٗ'' یعنی وہ نقطہ جس پر تمام عالم کا

نور، عقل، سمع، بصر، حیات، روح حتیٰ کہ ہر تخلیق کردہ شے واپس سمٹ آئی۔ یوں ''انسانِ کامل'' تمام عالم کا مرکز، محور، تمام نسخوں کی جامع کتاب ہے۔ وہی اُم الکتاب ہے اور وہی کتابِ مبین، جس کے متعلق فرمایا گیا ''وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ o'' (یٰسین۔12) ترجمہ: ''ہر شے کو جمع کر رکھا ہے ہم نے امامِ مبین میں''۔ جیسا کہ حدیث قدسی ''كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًا فَاَرَدْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ ذات سِرّ چشمۂ چشمانْ'' میں بیان کردہ تنزلاتِ ستہ میں ''ذات سِرّ چشمہ چشمان'' آخری اور ساتواں مرتبہ ہے جس سے مراد ذاتِ انسانِ کامل ہے جو سرچشمہ ہے پہچانِ حق تعالیٰ کا، جس میں آ کر تخلیق کے تمام مراتب کی تکمیل ہوگئی اور جس کے وجود میں ذاتِ حق تعالیٰ مکمل طور پر جلوہ گر اور ظاہر ہوگئی۔

اس انسانِ کامل میں آ کر تمام حقائقِ الٰہیہ اور کونیہ سمٹ گئے ہیں۔ وہ 'کُل' یعنی ذاتِ حق تعالیٰ سے اخذ کیا گیا یا اسی ذات سے ظاہر ہوا، اسی کا پرتو، اسی کی صورت ہے یوں اس میں حقائقِ الٰہیہ سب جمع ہیں۔ اسی انسانِ کامل کے نور سے تمام حقائقِ کونیہ یعنی مخلوقاتِ عالم کے متعلق تمام حقائق ظاہر ہوئے اس لیے اس میں حقائقِ کونیہ بھی جمع ہیں۔ پس وہ ایک جامع کتاب ہے حقائقِ الٰہیہ اور حقائقِ کونیہ کی۔ وہ ایک Link، واسطہ، وسیلہ، مقامِ اتصال (جڑنے کا مقام) ہے 'عبد' اور 'ھُو' کے بیچ میں۔ اس کی اپنی ذات 'ھُو' بھی ہے اور 'عبد' بھی۔ حقائقِ الٰہیہ کا جامع ہونے کی نسبت سے وہ 'ھُو' ہے اور حقائقِ کونیہ کا جامع ہونے کی نسبت سے وہ عبد ہے۔ علامہ ابنِ عربی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

- ''انسانِ کامل کی حقیقت ربوبیت اور عبودیت کی جامع ہے۔ ذات ایک ہے شانیں دو ہیں ایک شان کا نام ربوبیت ہے دوسری شان کا نام عبودیت ہے''۔ (شرح فصوص الحکم والایقان)
- حضرت انسانِ کامل ربوبیت اور عبودیت کا جامع ہے۔ کبھی اُس پر ربوبیت کا تجلی ہوتا ہے اور کبھی عبودیت کا۔۔۔۔۔ حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعض وارثین مثلِ سمندر ہیں جو کبھی خشک نہیں ہوتا۔ دائمی ربوبیت اور دائمی عبودیت اُن کی شان

ہے''۔(شرح فصوص الحکم والایقان)

❁ انسانِ کامل دو نسخہ ہے۔ نسخہ ظاہر اور نسخہ باطن۔ نسخہ ظاہر تمام عالم کے مشابہ ہے اور نسخہ باطن مرتبۂ الٰہیہ کے مشابہ ہے۔ پس انسان باعتبار اطلاق اور حقیقت ''کُل'' ہے اور وہ تمام موجودات قدیمہ[1] اور حدیثہ[2] کو قبول کرنے والا ہے۔ اور جو موجودات انسان کے علاوہ ہیں وہ ان دونوں اوامر (امر کی جمع) کو قبول نہیں کرتی کیونکہ عالم کی کوئی شے الوہیت[3] کو قبول نہیں کرتی اور الٰہ (معبود، اللہ تعالیٰ) عبودیت کو قبول نہیں کرتا۔ بلکہ عالم سب کا سب عبد ہے اور حق اللہ، واحد اور صمد ہے پس حق تعالیٰ کو اُن اوصاف سے موصوف کرنا جائز نہیں جو اوصافِ الٰہیہ کے مخالف ہوں۔ جیسے عالم کو ان اوصاف سے موصوف نہیں کر سکتے جو اوصافِ عبودیت کے خلاف ہے۔ پس صرف انسانِ کامل کے لیے دو نسبتِ کاملہ ہیں۔ ایک نسبت سے وہ حضرت الٰہیہ میں داخل ہوتا ہے اور ایک نسبت سے مرتبۂ کونیہ میں داخل ہوتا ہے۔ پس مرتبہ کونیہ میں اس کو عبد کہتے ہیں اسی لیے کہ وہ (حضورِ حق تعالیٰ میں) مکلّف[4] ہے اور حضرتِ الٰہیہ میں اس کو رب کہتے ہیں کیونکہ وہ خلیفہ ہے۔'' (فصوص الحکم)

اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا اس حدیثِ قدسی میں کہ ''میں نے انسان کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔'' دونوں ہاتھوں سے مراد صفاتِ جلال و جمال بھی ہیں اور صفاتِ ربوبیت و عبودیت بھی ہیں۔ اور دیگر مخلوقات کو یدِ واحد یعنی ایک ہی ہاتھ سے بنایا یعنی ان میں صرف عبودیت ہے اور خود ذاتِ حق تعالیٰ میں صرف ربوبیت ہے، عبودیت بالکل نہیں ہے۔ اس لحاظ سے انسانِ کامل تمام موجودات کی جامع کتاب ہے کہ اس میں صفاتِ عبودیت و ربوبیت دونوں موجود ہیں۔ اسی لحاظ سے انسان کو عالمِ کبیر کہا گیا ہے اور اس کائنات کو عالمِ صغیر کہا گیا ہے کہ یہ کائنات اور اس کی تمام مخلوق انسانِ کامل کی ذات کا ایک رخ ہے اور ذاتِ حق تعالیٰ دوسرا

---

[1] موجوداتِ قدیمہ سے مراد حقائقِ الٰہیہ ہیں بمعنی نور، علم، عقل، قلم، لوح، کرسی، عرش وغیرہ۔ [2] موجوداتِ حدیثہ سے مراد حقائقِ کونیہ ہیں۔ حادث وہ شے ہے جو پہلے موجود نہ تھی اور پھر پیدا کی گئی۔ یعنی تمام مخلوقاتِ عالم۔

[3] ذات حق تعالیٰ کا الٰہ یعنی معبود ہونا [4] اپنے اعمال کا جوابدہ

رخ۔ یوں کائنات انسانِ کامل سے چھوٹی ہوئی۔

☆☆☆☆☆☆

فَکَمَآ اَنَّ ذَاتَ الْحَقِّ کِتَابٌ جُمَلِیٌّ وَاُمٌّ جَامِعٌ لِّجَمِیْعِ الْکِتَابِ قَبْلَ تَفْصِیْلِھَا وَ عِلْمُہٗ تَعَالٰی بِنَفْسِہٖ کِتَابٌ مُّبِیْنٌ تَفْصِیْلِیٌّ مُفَصَّلٌ مُّبَیَّنٌ فِیْہِ مَاکَانَ فِی الذَّاتِ مُضْمَرًا کَذٰلِکَ اِنْسَانُ الْکَامِلُ کِتَابٌ جُمَلِیٌّ وَ اُمٌّ جَامِعٌ لِجَمِیْعِ الْکُتُبِ بَعْدَ تَفْصِیْلِھَا وَعِلْمُہٗ بِنَفْسِہٖ کِتَابٌ مُّبِیْنٌ تَفْصِیْلِیٌّ مُفَصَّلٌ مُبَیَّنٌ فِیْہِ مَا کَانَ فِی الْاِنْسَانِ الْکَامِلِ مُجْمَلاً۔

ترجمہ: پس جس طرح ذاتِ حق تعالیٰ مکمل کتاب اور جامع جمیع اُم الکتاب ہے اور علمِ حق تعالیٰ بہ نفسہٖ خود تفصیلی کتابِ مبین ہے اور اس میں ہر وہ چیز مفصل اور مبیّن ہے جو ذات میں پوشیدہ ہے اسی طرح انسانِ کامل بھی کُلی، جُملی جامع جمیع کتاب ہے بعد تفصیل کے اور علمِ انسانِ کامل بہ نفس خود کتابِ مبین تفصیلی ہے۔ اس (علم) میں ہر وہ چیز مفصل اور مبین ہے جو انسانِ کامل میں مجمل ہے۔

شرح: حضرت ابراہیم الجیلی رحمتہ اللہ علیہ انسانِ کامل کے متعلق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب انسانِ کامل سے فرماتا ہے "میرے حبیب تیری انیت[1] میری ہویت[2] ہے یعنی وہ میں ہی ہوں۔ اَنْت کا عین ھُو ہے اور "ھُو" ہی "انا" ہے۔ میرے دوست تیری بساطت[3] میری ترکیب ہے اور تیری کثرت میری واحدیت بلکہ تیری ترکیب میری بساطت ہے۔ تجھ سے میں ہی مراد ہوں۔ میں تیرے لیے ہوں نہ کہ اپنے لیے۔ مجھ سے تو ہی مراد ہے، تو میرے لیے ہے نہ کہ اپنے لیے۔ (مراد تو اور میں دو نہیں ایک ہی ہیں)۔ میرے حبیب تو ایک نقطہ ہے جس پر وجود کا دائرہ

---

[1] تیرا وہ وجود جس کی طرف لفظ انا (میں) سے اشارہ کیا جاتا ہے۔ [2] مقام احدیت جہاں اللہ تعالیٰ واحد تنہا، بے مثل و بے مثال ہے۔ ایسا مقام جہاں اسے دیکھا جا سکتا ہے نہ پہچانا جا سکتا ہے۔ محض پکارنے کے لیے اسے ھُو کے نام سے موسوم کیا گیا مراد یہ ہے کہ انسانِ کامل کا وجود (انیت) ہی حق تعالیٰ کی ہویت کی پہچان ہے۔ [3] پھیلاؤ

ہے۔ پھر اس دائرے میں تو ہی عابد ہے اور تو ہی معبود ہے۔ تو ظہور ہے تو حسن و زینت ہے۔ تو مثل آنکھ کے ہے جو انسان کے لیے ہے اور مثل انسان کے ہے جو آنکھ کے لیے ہے۔'' (انسانِ کامل)

حضرت علامہ ابنِ عربی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا جیسا کہ پھل بیج کی صورت پر ہوتا ہے۔ پس آدم یعنی انسانِ کامل حق تعالیٰ کی صورت پر ہے یعنی حق تعالیٰ کی ذات وصفات و افعال کا جامع ہے۔ لہٰذا حق تعالیٰ نے عالَم (کائنات) کی تدبیر عالم (انسانِ کامل) کے ساتھ کی یا صورتِ عالَم یعنی انسانِ کامل کے ساتھ کی۔ اس لیے انسانِ کامل صورتِ عالم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانِ کامل میں تمام اسمائے الٰہیہ اور کائنات کے تمام حقائق جو ظاہر میں اس عالمِ کبیر میں تفصیلاً موجود ہیں، کو ایجاد اور جمع کیا۔ انسانِ کامل تمام حقائقِ الٰہیہ اور کونیہ کا جامع نسخہ ہے۔ حق اور خلق کی تمام صفات کا جامع ہے۔ پس یہ ثابت ہوا کہ انسانِ کامل میں کل اسمائے الٰہیہ موجود ہیں اور اس میں وہ حقائق موجود ہیں جو حق تعالیٰ نے اس عالمِ کبیر میں تفصیلاً ظاہر کیے۔ چونکہ حق تعالیٰ انسانِ کامل کی صورت پر جلوہ نما ہے لہٰذا ہر شے اس کی تابع ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ۔

ترجمہ: اے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سارے کا سارا آپ کے لیے مسخر کر دیا۔'' پس جو کچھ عالم میں ہے وہ سب انسانِ کامل کی تسخیر کے تحت ہے۔ (فصوص الحکم والایقان)

حضرت شاہ محمد ذوقی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''انسانِ کامل تمام موجودات کا خلاصہ ہے۔ باعتبار اپنی عقل اور روح کے اُم الکتاب ہے، باعتبار قلب کے لوحِ محفوظ ہے، باعتبار اپنے نفس کے محو و اثبات کی کتاب ہے۔ انسانِ کامل صحفِ مکرمہ[1] اور یہی وہ کتابِ مظہر ہے جس سے کوئی چیز نہیں چھوٹی (یعنی ہر چیز اس میں موجود ہے)۔ اس کے اسرار و معنی کو سوائے ان لوگوں کے جو حجاباتِ ظلماتی[2] سے پاک ہوں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ (سِرّ دلبراں)

---

[1] مقدس صحیفہ [2] ظلمت یعنی غفلتوں اور گناہوں کے اندھیروں کے حجاب

سلطان العارفین حضرت سخی سلطان باھُو رحمتہ اللہ علیہ انسانِ کامل کی حقیقت اور ذاتِ حق تعالیٰ کے قلبِ انسانی میں نزول کے مراتب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اور بیشک وہ انسانِ کامل ہے جس کا ظاہر مخلوق کے ساتھ اور باطن حق کے ساتھ ہو۔ کیونکہ وہ لاھُوت عالمِ غیب میں مقرر ہے اور عالمِ غیب میں اس کی شناخت روح کی شکل میں ہے جو ظاہری صورت کا مدبّر[1] بھی ہے۔ عالمِ شہادت کی طرف اس کا نزول پانچ صورتوں میں ہے اور اس کا نام حضرت خمس (پانچ درجے) ہے۔ اوّل ذات کی تجلی اشیاء ثابتہ[2] پر جو موجود نہیں ہیں، اس کو عالمِ معنی کہتے ہیں۔ دوم عالمِ معانی سے عالمِ روح کی طرف نزول۔ تیسرا عالمِ معانی سے عالمِ روحانی، حیوانی کو اترنا جس کو عالمِ نفوس ناطقہ بھی کہتے ہیں۔ چہارم متشکل[3] اور مجسم عالم جس کو عالمِ مثال کہتے ہیں۔ پانچواں عالمِ اجسام اور مادی دنیا، وہ عالمِ حسن اور عالمِ شہادت ہے''۔ (سلطان الوھم کلاں)

پس انسانِ کامل حق تعالیٰ کی صورت، آئینہ، اظہار اور اُس کا عین ہے۔ انسانِ کامل کا وجود وہ وجود ہے جو حق تعالیٰ کی ہویت کو ''انا'' (میں) کا وجود عطا کرتا ہے۔ یعنی انسانِ کامل کے وجود سے قبل حق تعالیٰ کے لیے ''ھُو'' کا اسم تو موجود تھا لیکن ایسا کوئی وجود نہ تھا جسے اللہ تعالیٰ ''انا'' (میں) کہہ کر مخاطب کرتا۔ انسانِ کامل کا وجود ہی حق تعالیٰ کے لیے ''انیت'' ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ اپنے لیے ''یدُ اللہ'' (اللہ کے ہاتھ)، وجہہ اللہ (اللہ کا چہرہ) جیسے الفاظ استعمال کرتا ہے حالانکہ نہ اس کے ہاتھ ہیں نہ پاؤں، نہ چہرہ۔ مقامِ ہویت پر تو وہ صرف نور ہے بلکہ نور سے بھی برتر کوئی ایسی شے ہے جس کی مثال کسی چیز سے بھی نہیں دی جا سکتی کہ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ ترجمہ: ''اس کی مثل کوئی شے نہیں''۔ چنانچہ حق تعالیٰ کی ہویت کا وجود اصل میں انسانِ کامل کا وجود ہی ہے، اس کے ہاتھ اللہ کے ہاتھ، اس کے پاؤں اللہ کے پاؤں، اس کا چہرہ اللہ کا چہرہ ہے۔ اس کی بات اللہ کی بات ہے اور اس کے متعلق بات درحقیقت اللہ کے متعلق بات ہے۔ جیسا کہ

---

[1] تدبیر کرنے والا [2] اشیاء کا علمی وجود جو ظاہر ہونے سے قبل ذاتِ حق تعالیٰ میں پوشیدہ تھا [3] شکل وصورت رکھنے والا

حدیثِ قدسی میں بیان کیا گیا کہ لایزال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل حتّٰی احببۃ فکنت سمعہ الذی یسمع بہٖ و بصرہ الذی یبصربہٖ ویدہٗ التی یبطِش بھاٗ و رجلہ التی یمشی بھا۔ ترجمہ: میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ پس میں اس کے کان بن جاتا ہوں وہ ان سے سنتا ہے، میں اس کی بصارت بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے"۔ (صحیح بخاری۔ جلد۲ صفحہ۹۶۳)

اسی قرب کی انتہا پر اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرمایا:

❁ وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی (سورۃ الانفال۔17)

ترجمہ: اور اے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) جس وقت آپ نے کنکریاں دشمن پر پھینکی تھیں، درحقیقت وہ آپ نے نہیں اللہ نے پھینکی تھیں۔

❁ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ط یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ (سورۃ فتح۔10)

ترجمہ: بے شک (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) جو لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔

حضرت علامہ ابنِ عربی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"عالم میں ہر موجود (شے) اللہ کے کسی نہ کسی اسم کا مظہر ہے اور وہی اسم اس کا رب ہے اور انسانِ کامل حق تعالیٰ کے اسمِ جامع "اسم اَللّٰہُ" کا مظہر ہے جو سب اسماءِ الٰہی کا ربّ ہے پس ربّ الارباب ہے پس رب العالمین ہے"۔ (فصوص الحکم والایقان)

مرآۃ العارفین کی مندرجہ بالا عبارت میں حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ انسانِ کامل کو ذات کا عین قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جس طرح ذاتِ حق تعالیٰ تمام مخلوقات کی جامع ہے، تمام مخلوقات نے اپنا وجود وجودِ الٰہی سے پایا، اسی کا نور ہر شے کا باطن ہے اور ہر شے کا ظاہر اسی کا اظہار ہے، عین اسی طرح انسانِ کامل کا وجود بھی تمام مخلوقات اور تمام عالموں کا جامع ہے۔ اسی کے وجود

سے ہر شے کا وجود ہے، ہر شے کا باطن اُس کا نور ہے اور وہ ہر عالم کی ہر شے، ہر مخلوق کے لیے اُم الکتاب ہے۔ وہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں تمام حقائقِ الٰہیہ اور حقائقِ کونیہ درج ہیں پس وہ کتب الاکتاب ہے۔ وہی ہر شے کے لیے اجمال کے لحاظ سے اُم الکتاب ہے اور تفصیل کے لحاظ سے کتابِ مبین ہے۔ اشیائے عالم اس کے "نور" میں مجمل اور جمع ہیں اور اس کے "علم" میں وہ تفصیلاً موجود ہیں۔ اسی بنا پر انسانِ کامل، جس میں حقیقتِ محمدیہ یعنی ازل میں نورِ الٰہی سے ظاہر ہونے والا نورِ محمدی کامل جلوہ گر ہے، کے پاس کائنات کے ہر عالم کی ہر شے کا علم اسی طرح موجود ہے جس طرح حق تعالیٰ کے پاس موجود ہے۔ کچھ بھی اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔ اس کی نظر ہر عالم کی ہر شے پر ہے۔ حق تعالیٰ کو جو کچھ بھی دیکھنا اور جاننا ہے وہ اُس انسانِ کامل کے واسطے اور وسیلے سے دیکھتا اور جانتا ہے۔ علامہ ابنِ عربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "انسان کے لغوی معنی "آنکھ کی تپلی" کے ہیں جس میں بینائی کی قوت ہے اور جس سے آنکھ کو نظر حاصل ہے۔ چونکہ حق تعالیٰ نے اپنے آپ کو یعنی اپنے کمالات کو انسان (کامل) کے توسط سے دیکھا اور جملہ مخلوق کو بھی اسی انسان کے سبب سے دیکھا لہٰذا انسان (کامل) حق تعالیٰ کے لیے بمنزل آنکھ کی تپلی ٹھہرا جس سے حق تعالیٰ اپنی مخلوق کو دیکھتا ہے اور اُس پر رحم فرماتا ہے۔ پس انسانِ کامل عالم میں ایسے ہی ہے جیسے نگینہ انگوٹھی میں اور نگینہ نقش و علامت کا محل (مقام) ہے۔ اسی علامت کے سبب بادشاہ اپنے خزانوں پر مہر کرتے ہیں۔ پس جیسے بادشاہ اپنے خزانوں کی مہر کے ساتھ "حفاظت" کرتے ہیں ایسے ہی حق تعالیٰ اپنی مخلوق کی انسانِ کامل کے ساتھ حفاظت کرتا ہے۔ اس اعتبار سے اس انسانِ کامل کا نام خلیفہ رکھا گیا۔ پس جب تک کہ عالم میں انسانِ کامل رہے گا اس وقت تک خزانہ ہمیشہ محفوظ و مامون رہے گا (یعنی انسانِ کامل کے وجود کی وجہ سے عالم قائم ہے)۔ چونکہ جو کچھ صورتِ الٰہیہ میں "اسماء" تھے وہ سب خلقتِ انسانی میں ظاہر ہوئے یعنی تمام اسماء الٰہیہ کا ظہور اس نشاۃِ انسانی میں ہوا اس لیے اس وجودِ عنصری کے ساتھ آدم علیہ السلام کو احاطت اور جمعیت کا رتبہ حاصل ہوا اور اسی احاطت اور جمعیت کے باعث اللہ تعالیٰ کی حجت فرشتوں پر قائم ہوئی۔ پس اے طالب تو نصیحت حاصل کر

اور حضرت انسانِ کامل کے کمالاتِ الٰہیہ کا انکار نہ کر۔" (شرح فصوص الحکم والایقان)

☆☆☆☆☆☆

فَعِلْمُ الْاِنْسَانِ الْکَامِلِ بِذَاتِہٖ مِرْاٰۃٌ لِّذَاتِہٖ وَذَاتُہٗ ظَاهِرَۃٌ فِیْہِ وَ مُمَیَّزَۃٌ بِہٖ کَمَآ اِنَّ عِلْمَ الْحَقِّ بِذَاتِہٖ مِرْاٰۃٌ لِّذَاتِہٖ وَذَاتُہٗ ظَاهِرَۃٌ فِیْہِ مُتَعَیِّنَۃٌ بِہٖ فَبَیْنَ ذَاتِ الْحَقِّ سُبْحَانَہٗ وَذَاتَ الْاِنْسَانِ الْکَامِلِ مُضَاهَاتٌ مِنْ جِهَۃِ الْکُلِّیَّۃِ وَالْاِجْمَالِ وَ کَوْنُ الْاَشْیَآءِ فِیْهِمَا عَلَی الْوَجْهِ الْکُلِّیِّ وَالْاِجْمَالِیِّ وَ بَیْنَ عِلْمِ الْحَقِّ وَ عِلْمِ الْاِنْسَانِ الْکَامِلِ مُضَاهَاتٌ مِّنْ حَیْثُ مَظْهَرِیَّتِہٖ لِتَفْصِیْلِ مَآ اُجْمِلَ۔

ترجمہ: پس انسانِ کامل کا علم بذاتِ خود اس کی ذات کا آئینہ ہے اور اس کی ذات اس میں ظاہر ہے اور اس کے سبب سے متمیز[1] ہے جیسے علمِ حق بذاتِ خود ذاتِ حق کا آئینہ ہے اور اس کی ذات اس میں ظاہر اور اس سے متعین ہے۔ ذاتِ حق اور ذاتِ انسانِ کامل میں مشابہت ہے بسبب کُلیت اور اجمال کے اور بسبب اشیاء کے ان دونوں میں بوجہ کُلی اور اجمالی طور پر موجود ہونے کے اور علمِ حق اور علمِ انسانِ کامل میں مشابہت ہے اسی لیے کہ دونوں علم مظہر ہیں اس چیز کی تفصیل کے جو دونوں میں مجمل ہے۔

شرح: حیات کی بنیاد علم ہے۔ دنیا کی ہر شے پہلے علم کی صورت کسی نہ کسی مقام (ذہن یا کتاب) پر موجود ہوتی ہے پھر اس علم کے مطابق ہی وہ ظاہر ہوتی ہے پس ہر شے کا وجود اس کے علم کا عین ہے۔ انسانِ کامل کا وجود بھی عین اس کا علم ہے۔ نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنی صورت، اپنے وجود، اپنی حقیقت کے اظہار سے قبل علمِ الٰہی میں موجود تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے علم کے مطابق وجود عطا کیا۔ چنانچہ انسانِ کامل کا وجود عین اس کا علم ہے۔ حق تعالیٰ کا نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صورت میں ظاہر ہونا

---

[1] خاص، ممتاز

درحقیقت اللہ کے علم کا اوّلین اظہار ہے۔ اسی لیے علم اور نورِ انسانِ کامل ایک دوسرے کا آئینہ ہیں۔ ذاتِ حق تعالیٰ میں ہر شے کا وجود سب سے پہلے علمی صورت میں موجود تھا۔ اس علمی وجود کو اس شے کا ''عین ثابتہ'' کہتے ہیں۔ اس عین ثابتہ کے مطابق انہیں ظاہری وجود عطا کیا گیا جسے ''عین خارجہ'' کہتے ہیں۔ یعنی ہر شے کے وجود کی بنیاد اس کا علمی وجود ہے۔ کائنات میں کسی بھی ایسی شے نے وجود نہیں پایا جو پہلے علمِ الٰہی میں موجود نہ تھی چنانچہ حیات کی بنیاد علمِ الٰہی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ (الانعام۔122)

ترجمہ: ''کیا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لیے نور (علم) رکھا جس سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، اس شخص کی مانند ہوسکتا ہے جو (جہالت کی) تاریکیوں میں ہے''۔

ہر انسان بلکہ ہر مخلوق کا ہر عمل اس کے علم کے مطابق ہی ہے۔ چیونٹی کا ہر عمل صرف اس کو عطا کیے گئے علم کے مطابق ہے۔ وہ زندہ ہی اس علم کی وجہ سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا کیا کہ کس طرح اس نے اپنے لیے کھانا تلاش کرنا ہے۔ اسی طرح ہر جاندار کی حیات کی بنیاد بھی علمِ الٰہی ہے اور اس کی حیات کا جاری رہنا بھی اس جاندار کو عطا کردہ علمِ الٰہی کی بدولت ہے یعنی کھانے، رہنے، حرکت اور سکون وغیرہ کا علم اور یہ علم ہر زندہ کے لیے ضروری ہے پس ثابت ہوا کہ حیات کی بنیاد علم ہے۔ حق تعالیٰ کی صفتِ حیّ اس کی بیشتر صفات سمع، بصر، قدرت، خبیر وغیرہ کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اور علم ''حیات'' کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اسی بنا پر ''علم'' حق تعالیٰ کی اعلیٰ ترین صفت ہوئی کہ اس علم کی بنا پر ہی اس نے تخلیق کا عمل شروع کیا اور پھر اس علم کے مطابق تخلیق کردہ مخلوقات پر اس کے دیگر اسماء وصفات مثلاً رحمٰن، رحیم، کریم وغیرہ کی تجلیات کا اظہار ہوا چنانچہ علمِ حق تعالیٰ عین ذاتِ حق تعالیٰ ہے۔ یا علمِ حق تعالیٰ آئینہ حق تعالیٰ ہے۔ اس علم کا پہلا اظہار انسانِ کامل کے نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صورت میں ہوا یوں علم بھی حق تعالیٰ کا آئینہ ہے اور انسانِ کامل بھی حق تعالیٰ کا آئینہ ہے۔ چونکہ علمِ حق تعالیٰ مکمل و کامل طور پر انسانِ کامل کی صورت میں ظاہر ہوا یعنی تمام مخلوقاتِ عالم

کے اعیان[1] ثابتہ ذاتِ حق تعالیٰ سے نورِ انسانِ کامل میں ڈھلے، اس لیے یہ علم ہی انسانِ کامل کی ذات اور اس کا آئینہ بھی ہوا۔ جو اعیانِ ثابتہ علمِ الٰہی میں مجمل و جمع تھے وہی اپنے ظاہری وجود کی طرف پہلا قدم اٹھانے سے قبل علمِ انسانِ کامل میں مجمل و جمع ہوئے۔ ذاتِ حق تعالیٰ کی ہی طرح ذاتِ انسانِ کامل میں بھی یہ اعیان ثابتہ ''کُل'' کی صورت میں موجود ہیں جیسے الفاظ اپنا وجود پانے سے قبل سیاہی میں کُل کی صورت میں موجود ہوتے ہیں پس ذاتِ حق تعالیٰ اور ذاتِ انسانِ کامل میں مشابہت کُلی ہے ہر بنا پر خواہ وہ ''علم'' ہو یا حیات، جلال ہو یا جمال، سمع ہو یا بصر۔
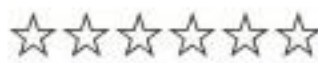
☆☆☆☆☆☆

فَالْاِنْسَانُ الْکَامِلُ مِرْاٰۃٌ تَآمَّۃٌ لِلذَّاتِ بِسَبَبِ ھٰذِہِ الْمُضَاھَاتِ وَالذَّاتُ مُتَجَلِّیَۃٌ عَلَیْہِ عَلَی الْوَجْہِ الْکُلِّیِّ وَالْجُمْلِیِّ وَعِلْمُ الْاِنْسَانِ الْکَامِلِ مِرْاٰۃٌ لِّعِلْمِ الْحَقِّ وَعِلْمِ الْحَقِّ مُتَجَلٍّ عَلَیْہِ وَظَاھِرٌ م بِہٖ فَمَا فِی الذَّاتِ مُنْدَرَجٌ عَلَی الْوَجْہِ الْکُلِّیِّ وَالْاِجْمَالِیِّ فَھُوَ فِی الْاِنْسَانِ الْکَامِلِ مُنْدَرَجٌ عَلٰی ذٰلِکَ الْوَجْہِ وَمَا فِی عِلْمِ الْحَقِّ ظَاھِرٌ عَلَی الْوَجْہِ الْجُزْئِیِّ وَالتَّفْصِیْلِیِّ فَھُوَ فِیْ عِلْمِ الْاِنْسَانِ الْکَامِلِ ظَاھِرٌ عَلَی الْوَجْہِ الْجُزْئِیِّ وَالتَّفْصِیْلِیِّ۔

ترجمہ: پس انسانِ کامل ذاتِ حق تعالیٰ کے لیے مراۃ تامہ (مکمل باصفا آئینہ) ہے اس مشابہت کے سبب اور ذات اس (مراۃ تامہ انسانِ کامل) پر بروجہ کُلی جُملی متجلی ہے۔ اور علمِ انسان آئینہ ہے علمِ حق کا اور علمِ حق اس پر متجلی ہے اور اس میں ظاہر ہے۔ ساتھ اس کے پس وہ چیز کہ ذات میں داخل ہے اور بروجہ کُلی اور اجمالی کے سو ہی انسانِ کامل میں داخل ہے اور اسی وجہ (کلی اور اجمالی)

---

[1] عین کی جمع یعنی مخلوقات کے علمی وجود جو ظاہر ہونے سے قبل ذاتِ حق تعالیٰ اور ذاتِ انسانِ کامل میں موجود تھے۔

کے اور وہ چیز کے علم اللہ میں ظاہر ہے اور بوجہ جزئی اور تفصیلی کے سو وہی بیچ علمِ انسانِ کامل کے ظاہر ہے اور بوجہ جزئی اور تفصیلی کے۔

شرح: انسانِ کامل ذاتِ حق تعالیٰ کی پہچان ہے۔ جس طرح جب تک ایک انسان خود کو آئینہ میں نہ دیکھے اپنی ہی صورت سے آشنا نہیں ہو سکتا اسی طرح جب تک اللہ تعالیٰ نے انسانِ کامل کی صورت میں اپنا ہی عین اور آئینہ تخلیق نہ فرمایا خود کو نہ پہچان پایا۔ آئینہ میں جب تک کوئی صورت اپنا عکس نہ ڈالے آئینہ بھی بے حقیقت ہے چنانچہ آئینہ اور صورت لازم وملزوم ہیں۔ آئینہ بس وہی کچھ ہے جو اس میں دکھائی دے۔ آئینہ انسانِ کامل ہے اور اس میں دکھائی دینے والی صورت حق تعالیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آئینہ کو اپنی ہی تجلی سے پیدا فرما کر اس پر اپنی تجلی ڈالتا اور خود کو ملاحظہ کرتا ہے۔ آئینہ اس تجلی سے اپنا وجود پاتا ہے اور رب تعالیٰ کو اس کا دیدار عطا کرتا ہے پس آئینہ عین تجلیءِ الٰہی اور تجلیءِ الٰہی عین آئینہ ہے۔ انسانِ کامل عین صورتِ حق تعالیٰ ہے۔ دونوں میں ہر لحاظ سے مشابہت ہے۔ حضرت ابراہیم الجیلی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''انسانِ کامل وہ ہے جو بمقتضائے حکمِ ذاتی بطور ملک واصالت[1]، اسماء ذاتی وصفاتِ الٰہیہ کا مستحق ہو۔ حق کے لیے اس کی مثال آئینے کی سی ہے کہ سوائے آئینہ کے کوئی شخص اپنی صورت نہیں دیکھ سکتا، اور نہ اس کے لیے ممکن ہے کہ سوائے اسمِ اَللّٰہُ کے آئینہ کے، کہ وہ اس کا آئینہ ہے، اپنے نفس کی صورت دیکھ سکے اور انسانِ کامل بھی حق کا آئینہ ہے اس لیے حق تعالیٰ نے اپنے اوپر لازم کر دیا ہے کہ سوائے انسانِ کامل کے اپنے اسماء وصفات کو کسی اور چیز میں نہ دیکھے۔'' (انسانِ کامل)

انسانِ کامل کا مرآۃِ[2] تامہ ہونا نہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے بلکہ مخلوق کے لیے بھی ہے۔ اس کا قلب، روح، نفس سب ایک شفاف آئینہ ہے جس میں مخلوق بھی اپنی حقیقت دیکھ سکتی ہے۔

انسانِ کامل وہ ہے جس نے ذاتِ حق تعالیٰ سے بلا واسطہ وجود پایا اور ذاتِ حق تعالیٰ کا کامل مکمل وجود پایا اور پھر اس کے وجود سے دیگر مخلوقات نے وجود پایا۔ اسی طرح انسانِ کامل وہ ہے جس نے

---

[1] کسی بھی کدورت، کثافت یا آمیزش سے پاک اصل حقیقی وجود [2] کامل ومکمل آئینہ

اللہ تعالیٰ سے بلاواسطہ ''علم'' پایا جیسا کہ اللہ نے فرمایا عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی (النجم۔5) ترجمہ: ''اسے علم دیا شدید قوت والی ذات نے۔'' علم کے ساتھ ساتھ انسانِ کامل تمام صفاتِ الٰہیہ سے بھی بلاواسطہ متصف ہوا۔ حیات، سمع، بصر، جلال، جمال، سب پایا اور پھر انسانِ کامل کے علم، حیات، سمع، بصر، جلال، جمال وغیرہ سے تمام مخلوقات نے اپنا اپنا حصہ پایا۔ پس جس طرح ذاتِ حق تعالیٰ کُل ہے اسی طرح انسانِ کامل کُل ہے اور دیگر تمام مخلوق جز ہے اور اسی کُل ہونے کی بنا پر ہی انسانِ کامل ذاتِ حق تعالیٰ کا کامل آئینہ یعنی مراۃِ تامہ ہے۔ ان دونوں میں کُلی مشابہت ہے سوا اس کے کہ ''ربّ'' خالق ہے اور ''انسانِ کامل'' مخلوق۔ اس کے سوا دونوں کی صفات مشترک ہیں، دونوں کا علم مشترک ہے، بلکہ علم ہی دیگر تمام صفات کی بنیاد بھی ہے۔

حق تعالیٰ کا علم اور انسانِ کامل کا علم مشترک ہونے کی بنا پر انسانِ کامل کی زبان ''کُن'' کا درجہ رکھتی ہے، کہ اس زبان سے وہی نکلتا ہے جو علمِ الٰہی میں ازل سے لکھا ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضور غوث الاعظمؓ فرماتے ہیں کہ ''فقیر (انسانِ کامل) وہ ہے جو ''کُن'' کہے اور ہو جائے۔'' وہ جو کہتا ہے وہی ہو جاتا ہے یا یوں کہا جائے کہ وہ کہتا ہی وہی ہے جو ہونا ہوتا ہے کیونکہ اس کا علم علمِ الٰہی ہے۔ اس کے علم میں ہے جو ہو چکا، ہو رہا ہے اور ہونے والا ہے۔

اگرچہ 'علم' ذاتِ حق تعالیٰ اور انسانِ کامل کا آئینہ اور تخلیقِ عالم کی بنیاد ہے لیکن علم انسانِ کامل کے تحت ہے نہ کہ انسانِ کامل علم کے تحت ہے مراد یہ کہ انسانِ کامل علم سے برتر ہے۔ انسانِ کامل کُل ہے اور علم ایک صفتِ الٰہی جو ذاتِ حق تعالیٰ سے انسانِ کامل میں کُلی طور پر منتقل ہوئی البتہ علم کی اہمیت اس لیے دیگر تمام صفات سے زیادہ ہے کہ اسی علم کی صورت میں تمام کے تمام حقائقِ الٰہیہ اور حقائقِ کونیہ ذاتِ حق تعالیٰ سے نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں منتقل ہوئے۔ حضرت سخی سلطان باھُو رحمتہ اللہ علیہ تخلیقِ علم کے متعلق فرماتے ہیں: ''جب اللہ تعالیٰ نے نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تخلیق کیا تو اسے 273000 سال اپنے مدِنظر رکھ کر روحِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں ڈھال کر اس سے کلام فرمایا تو اس سے کہا کہ اے روحِ محمد ﷺ اٹھ اور ہم سے کلام کر۔ اس پر روحِ

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' اور حق تعالیٰ نے فرمایا ''محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' اس کلمہ پاک کے نور سے علمِ اسلام وذکرِ اللہ وکلام اللہ کی صورت پیدا ہوگئی۔ صورتِ علم نے روحِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا ''اسلامُ علیکم یا روحِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' روحِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''وعلیکم السلام یا علمِ کلام اللہ۔'' روحِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صورتِ علم کو تعظیم دی، اسے پسند فرمایا اور بوسہ دے کر اپنی آنکھوں سے لگایا۔ علم نے آپ کی زبان مبارک پر سکون وقرار پکڑا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی آنکھوں سے اس کا مطالعہ فرمایا۔ (محک الفقر کلاں)

پس نور روحِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''علم'' سے افضل اور برتر ہے۔ تمام اشیاء کا علم، بلکہ ہر علم کا علم، کُل اور اجمال کی صورت میں ذاتِ حق تعالیٰ سے نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں منتقل ہوا۔ یہاں بھی پہلے وہ کُل و اجمال کی صورت میں ہی موجود ہوا پھر اسے کُل سے جز یعنی نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نورِ مخلوقات میں منتقل کیا گیا اور یوں اجمال کو تفصیل حاصل ہوئی۔ چنانچہ کُل اور اجمال کے لحاظ سے بھی علمِ الٰہی اور علمِ انسانِ کامل ایک ہی ہے اور جزوی اور تفصیلی لحاظ سے بھی ایک ہی ہے۔ بلکہ ذات کی طرح علم بھی واحد ہے اور مقام وحدت پر تو ذات خود ہی علم ہے کیونکہ مقامِ وحدت پر وجود ایک ہی ہے اسی وجود میں تمام صفاتِ علم وحیات پوشیدہ ہیں۔ دورانِ نزول ذات سے علم ظاہر ہوا اور حالتِ اجمال سے حالتِ تفصیل میں تبدیل ہوا لیکن علم ازل سے لے کر ابد تک ایک ہی ہے اور وہی علم اس کائنات میں بھی ظاہر ہو رہا ہے۔

نورِ انسانِ کامل ہی انسانِ کامل کی حقیقت اور باطن ہے۔ جب یہ نور روحِ قدسی، قلب، نفس اور پھر جسمِ انسان میں ڈھلا تو وہ تمام کا تمام علم ساتھ ساتھ منتقل ہوتا رہا یا نزول کرتا رہا حتیٰ کہ جب جسمِ انسان تخلیق ہوا تو یہ علم اس کامل ذات کا کامل حصہ بن گیا۔ اس علم کی بنا پر ہی کائنات کا ظہور ہوا اور پھر اس کائنات کے ظہور کے بعد بواسطہ انسانِ کامل یہ علم اس دنیا میں آکر درجہ بدرجہ ظاہر ہونے لگا۔ حضرت انسان ہی اس دنیا میں ظاہر ہونے والے تمام علم کا وسیلہ ہے۔ اللہ نے اپنی کائنات کا اور اپنا تمام علم انسان کے قلب ودماغ میں جمع کر دیا خواہ وہ انسانی جسم کا علم ہو یا روح کا، زمین کے

نیچے موجود اشیاء کا علم ہو یا زمین سے اوپر خلا کا علم ہو، جانوروں کے متعلق علم ہو یا پودوں کے متعلق، ہر علم مخلوقاتِ الٰہی میں سے صرف اور صرف انسان کے پاس موجود ہے جبکہ دیگر مخلوقات کے پاس صرف ان کی اپنی حیات کے لیے ضروری علم ہے۔ دنیا میں ترقی اور ضرورت کے حساب سے اللہ کا علم انسان کے ذریعے اپنے اپنے وقت پر ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ مختلف انسان اس علم کے اظہار کا سبب بنتے رہتے ہیں۔ لیکن ایک ہستی ''انسانِ کامل'' دنیا میں ایسی موجود ہوتی ہے جس کی ذات میں تمام کا تمام علم جمع ہے۔ ایک ڈاکٹر کے پاس صرف طب کا، سائنس دان کے پاس صرف سائنس کا، کمپیوٹر انجینئر کے پاس صرف کمپیوٹر کا، اور اسی طرح دیگر شعبوں کے متعلق قیاس کیا جائے لیکن انسانِ کامل وہ ہے جس کے پاس تمام علمِ الٰہی بشمول حقائقِ الٰہیہ وکونیہ موجود ہے۔ نہ صرف یہ کہ تمام علم اس کی ذات میں جمع ہے بلکہ دیگر تمام انسانوں کے علم کا منبع و مصدر اور سرچشمہ بھی اسی کی ذات ہے یعنی زمانے میں جو علم ظاہر ہو رہا ہے اور انسانوں کو حاصل ہو رہا ہے وہ اسی کے توسط اور واسطے سے ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس میں ان انسانوں کی اپنی کوشش کا بھی دخل ہے لیکن اس علم کو زمانے پر کھولنے والی ذات اس انسانِ کامل کی ہے کیونکہ علم کا تمام خزانہ اس کے تصرف میں ہے اور وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

انسانِ کامل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام عین علمِ الٰہی ہیں۔ تمام کائنات کا علم ان کی ذات میں جمع ہے جس کا اظہار قرآن، احادیث اور احادیثِ قدسی میں ہوا۔ جو بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے چودہ سو سال قبل فرما دی سائنس آج اسے ثابت کر رہی ہے۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی فرمائی ہوئی بہت سی باتوں کی تہہ تک سائنس بھی اب تک نہیں پہنچ پائی البتہ کوشش اور تگ ودو میں مصروف ہے۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس علمِ کامل موجود ہے جو آہستہ آہستہ کائنات میں ظاہر ہو رہا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا کہ ''اے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہم نے آپ کے لیے تمام کائنات مسخر کر دی۔''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہر زمانے کے انسانِ کامل کی صورت میں موجود و حاضر ہیں اس لیے آج بھی زمانہ جس علم سے فیض یاب ہو رہا ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یعنی انسانِ کامل کا ہی عطا کردہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا

قلب مبارک علمِ الٰہی کا محل (گھر) ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات 'قلم' ہے جس کے ذریعے یہ علم منتقل ہو رہا ہے۔ پس صرف انسانِ کامل کا علم ذاتی علم ہے، اس کے سوا کسی انسان کو حاصل ہونے والا علم اس کا ذاتی علم نہیں ہے بلکہ بواسطہ کامل انسان اس انسان پر کھولا گیا ہے تا کہ زمانہ اس علم سے فائدہ اٹھا سکے۔ یعنی اصل پاور سٹیشن انسانِ کامل ہے اور ہر انسان اپنی اپنی طلب، استعداد، توفیق، کوشش اور عطائے الٰہی کے مطابق اس سے فیض یاب ہو رہا ہے خواہ وہ کوئی فلسفی ہو یا ادیب، ڈاکٹر ہو یا انجینئر، خلانورد ہو یا کان کن۔ اور خواہ وہ خود اس بات سے واقف ہو یا نہ ہو کہ اس کے علم کا اصل سرچشمہ درحقیقت کون سی ذات ہے۔ ازل میں بھی یہ علم ان کے نفوس کو علمِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے واسطے اور وسیلے سے عطا ہوا تھا اور اس دنیا میں آنے کے بعد بھی یہ علم ذاتِ انسانِ کامل کے توسط سے ہی انہیں حاصل ہوتا ہے۔

علم کا سرچشمہ ذاتِ انسانِ کامل کے علاوہ ایک اور بھی ہے اور وہ ہے شیطان۔ ہر شیطانی اور خبیث علم کی ایجاد علمِ شیطان کے سرچشمے سے ہوئی۔ یہ فطرتِ انسان پر ہے کہ وہ علمِ شیطان کی طرف رجوع کرتا ہے یا علمِ انسانِ کامل کی طرف۔
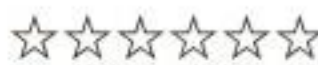
☆☆☆☆☆☆

بَلْ عِلْمُہٗ عِلْمُہٗ وَ ذَاتُہٗ ذَاتُہٗ بِلَا اِتِّحَادٍ مَّعَہٗ وَلَا حُلُوْلٍ فِیْہِ وَلَا صَیْرُوْرَتِہٖ ھُوَ لِاَنَّھَا مُحَالٌ لِاَنَّ الْاِتِّحَادَ یَحْصِلُ مِنَ الْوُجُوْدَیْنِ وَکَذَا الْحُلُوْلُ وَالصَّیْرُوْرَۃُ وَمَا ثَمَّ اِلَّا وُجُوْدٌ وَّاحِدٌ وَّالْاَشْیَآءُ مَوْجُوْدَۃٌ بِہٖ مَعْدُوْمَۃٌ بِنَفْسِھَا فَکَیْفَ یَتَّحِدُ مَنْ ھُوَ مَوْجُوْدٌ بِہٖ وَمَعْدُوْمٌ بِنَفْسِہٖ وَلَوْ تَسْمَعُ الْاِتِّحَادَ مِنْ اَھْلِ اللّٰہِ اَوْ تَجِدَ فِیْ مُصَنَّفَاتِھِمْ فَلَا تَفْھَمْ مَا فَھِمْتَ مِنَ الْاِتِّحَادِ الَّذِیْ قُلْنَا فِیْہِ اِنَّہٗ یَحْصِلُ مِنَ الْوُجُوْدَیْنِ اِذْ لَیْسَ مُرَادُھُمْ بِالْاِتِّحَادِ اِلَّا شُھُوْدُ

الْوُجُوْدِ الْحَقِّ الْوَاحِدِ الْمُطْلَقِ الَّذِیْ اَلْکُلُّ بِہٖ مَوْجُوْدٌ فَیَتَّحِدُ بِہٖ الْکُلُّ مِنْ حَیْثُ کَوْنِ کُلِّ شَیْءٍ مَّوْجُوْدًا بِہٖ وَمَعْدُوْمًا فِیْ نَفْسِہٖ لَا مِنْ حَیْثُ اَنَّ لَہٗ وُجُوْدًا خَاصًّا اِتَّحَدَ بِہِ الْکُلُّ فَاِنَّہٗ مُحَالٌ۔

ترجمہ: بلکہ علمِ انسان علمِ حق ہے اور ذاتِ انسان ذاتِ حق ہے' بغیر اس کے کہ اُس کا اس میں حلول ہے اور بغیر اس کے کہ یہ وہ ہو جائے' اس لیے کہ یہ امر محال ہے۔ اس لیے کہ اتحاد دو وجودوں سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح حلول[1] اور صیرورۃ[2] بھی دو وجود میں پائی جاتی ہے اور یہاں وجودِ واحد کے سوا کچھ نہیں ہے اور وہ ہستی مطلق ہے اور اشیاء اُس سے موجود ہیں اور بذات خود معدوم ہیں۔ پس کیسے متحد ہو سکتا ہے وہ جو اُس سے موجود ہے اور بذات خود معدوم ہے اور اگر تو اہل اللہ سے اسے سنے یا اُن کی تصنیفات میں پائے تو پس تو اسے اپنی سمجھ کے مطابق وہ اتحاد مت سمجھ جس کی نسبت ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ دو وجود سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ اس سے اُن کی مراد اتحاد نہیں بلکہ شہودِ وجودِ واحد مطلق ہے جس سے کُل موجود ہے۔ پس متحد ہے اُس سے کُل اس حیثیت سے کہ ہر شے اس سے موجود ہے اور بذات خود معدوم ہے نہ کہ اس حیثیت سے کہ اس (جز) کے لیے (کوئی) وجودِ خاص ہے جو کُل سے متحد ہو گیا ہے اس لیے کہ یہ محال ہے۔ اتحاد سے مراد (صرف) شہودِ ہستی مطلق ہے۔

شرح: انسانِ کامل کا بشری وجود بھی حقیقت ہے اور باطنی وجود بھی۔ اس کا وجود اول تا آخر ظاہر تا باطن صرف حق ہے۔ اس کی ذات سے مخلوقاتِ عالم کا وہی علم اور وجود ظاہر ہوا جو ذاتِ حق تعالیٰ میں پوشیدہ تھا۔ اس کا نور کہنے اور پہچاننے کے لیے نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے لیکن حقیقتاً نورِ الٰہی کے سوا کچھ نہیں۔ یہ نورِ الٰہی ہی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے توسط سے درجہ بدرجہ نزول کرتے ہوئے تمام مخلوقاتِ عالم میں ظاہر ہوا اور پھیلا اور پھر انسانِ کامل کی ذات میں واپس مجتمع ہو کر مرکوز ہو گیا۔ چنانچہ

---

1 ایک وجود کا دوسرے وجود میں اتر جانا 2 ایک وجود کا دوسرے وجود کی صورت اختیار کر لینا یا بن جانا

اگرچہ اس عالم میں مخلوقات کی شناخت کے لیے انہیں علیحدہ علیحدہ ظاہری لباس عطا کر دیئے گئے لیکن ان سب کی حقیقت ایک ہی ہے یعنی نورِ الٰہی جس کی ظاہری صورت نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے۔ اصل وجود وہی ہے جس سے مختلف صورتیں ظاہر ہوئیں جیسا کہ ایک ہی سیاہی سے مختلف حروف' ایک ہی مٹی سے مختلف کھلونے۔ اجسام وصورتیں مختلف لیکن حقیقت ایک ہی۔

ان اجسام اور صورتوں کو فنا لازم ہے اور یہ صرف وقتی صورتیں ہیں جیسا کہ اللہ نے فرمایا کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ ترجمہ "اللہ کے چہرے کے سوا ہر شے ہلاک (فنا) ہونے والی ہے"۔

اور فرمایا کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ O وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلٰلِ وَ الْاِکْرَامِ O (الرحمٰن 26،27) ترجمہ: "جو کچھ بھی (اس کائنات میں) ہے سب کو فنا (لازم) ہے اور صرف اللہ صاحبِ عظمت وجلال کے چہرے کو بقا ہے"۔

چنانچہ اگرچہ یہ چند لمحوں کے لیے دنیا میں موجود ہوتی ہیں لیکن یہ موجود ہونا نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ تب بھی ان کا موجود ہونا ان کی اپنی ذات کی بدولت نہیں بلکہ ذاتِ حق تعالیٰ کی وجہ سے ہے کہ وہ ہی ان صورتوں کی اصل حقیقت ہے۔ اصل وجود اللہ تعالیٰ کا ہے۔ جب یہ وجود 'م' یعنی نورِ 'محمد' کا نقاب اوڑھتا ہے تو "موجود" ہو جاتا ہے۔ "م" نے 'وجود' کو 'موجود' بنا دیا تو اصل وجود اللہ کا ہے جس کا لباس 'م' ہے جس نے موجودات کو 'موجود' بنایا۔ یوں یہ اجسام موجود ہو کر بھی از خود موجود نہیں اور ان کی صورت میں اصل موجود صرف ذاتِ حق تعالیٰ اور نور و ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے۔ یعنی اللہ اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سوا کچھ بھی حقیقتاً موجود نہیں البتہ اعتباراً[1] موجود ہے۔

---

[1] اعتباری وجود وہ وجود ہے جو صرف دکھائی دے لیکن اصل میں موجود نہ ہو مثال کے طور پر اگر ایک جلتی ہوئی مشعل کو دائرے میں گھمائیں تو آگ کا ایک دائرہ سا بنتا دکھائی دے گا۔ تمام دائرے میں آگ کی روشنی دکھائی دے گی۔ حالانکہ آگ صرف ایک مقام پر جل رہی ہے۔ جہاں آگ حقیقتاً جل رہی ہے وہ حقیقی وجود یعنی انسانِ کامل ہے اور باقی دائرہ اعتباری وجود ہے جو نہ ہو کر بھی دکھائی دے رہا ہے۔ اس اعتباری وجود سے مراد باقی تمام مخلوقات عالم کا ظاہری وجود ہے۔

جب ایک خام انسان کی نظر صرف ان جسموں پر ہوتی ہے تو حقیقت اس کی نظروں سے بالکل اوجھل ہو جاتی ہے۔ ان میں سے اگر کوئی حقیقت جاننا تو چاہتا ہے لیکن حقیقت تک پہنچنے کے لیے صحیح راستے کا انتخاب نہیں کرتا یا اس کے لیے صرف اپنی محدود عقل کا سہارا لیتا ہے تو اس کے غلط زاویہ نگاہ کی وجہ سے اسے بھی حقیقت صحیح دکھائی نہیں دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ''حقیقت'' کے تمام طالب مانتے ہیں کہ یہ تمام عالم صرف ذاتِ حق کا اظہار ہے اور ہر صورت پر ذاتِ حق تعالیٰ ہی ظاہر ہے لیکن نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی روشنی میں نہ دیکھنے والوں کو اصل حقیقت کبھی دکھائی نہیں دے سکتی۔ اسی لیے ہندوؤں اور عیسائیوں نے حلول اور اتحاد کا نظریہ تخلیق کیا۔ حلول یہ کہ اجسامِ عالم بھی اپنا ایک وجود رکھتے ہیں لیکن ان وجودوں کے اندر ذاتِ حق تعالیٰ نے حلول کیا ہوا ہے یعنی وہ ان میں سمایا ہوا ہے۔ اس طرح انہوں نے اجسامِ عالم کو بھی حقیقی اور باقی سمجھا اور ذاتِ حق تعالیٰ کو بھی، حالانکہ ان اجسام کا وجود اعتباری اور فانی ہے۔ یوں وہ شرک کے مرتکب ہوئے۔ ان کے حلول کے عقیدے کے مطابق پہلے اجسام تخلیق کیے جاتے ہیں اور پھر ذاتِ حق تعالیٰ ہر جسم میں حلول کر کے اسے زندگی عطا کرتی ہے۔ حالانکہ جیسا کہ صوفیاء کرام نے تنزلاتِ ستہ کی تفصیل میں بیان کیا کہ ذاتِ حق تعالیٰ خود درجہ بدرجہ نزول کر کے بطون سے ظہور کی طرف آیا اور خود عالمِ اجسام میں ظاہر ہوا جیسا کہ فرمایا گیا کہ

اِنَّہٗ صُوْرَۃُ کُلِّ شیءٍ وَّعَیْنُ کُلِّ شیءٍ

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ہر شے کی صورت اور ہر شے کا عین ہے۔

''اتحاد'' کا نظریہ یہ ہے کہ جب انسانی روح ترقی اور عروج حاصل کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ سے جا ملتی ہے۔ یہ نظریہ بھی غلط ہے اس لحاظ سے کہ یوں روح انسانی کا حق تعالیٰ سے علیحدہ کوئی دوسرا وجود ثابت ہوتا ہے جبکہ حقیقی وجود تو ایک ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ

کُلُّ شیءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ

یعنی سوائے حق تعالیٰ کی ذات کے ہر شے کو فنا ہے۔ اس طرح روحِ انسانی اگر اللہ تعالیٰ

سے علیحدہ کوئی وجود ہے تو پھر تو اسے بھی فنا ہونا ہے اور اگر اسے بھی فنا ہونا ہے تو جزا و سزا کس کے لیے ہے۔ جنت و دوزخ کس کے لیے ہے؟ اس لیے روح انسانی اللہ تعالیٰ سے علیحدہ کوئی وجود نہیں ہے بلکہ

قُلْ رُوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ

ترجمہ: ''کہہ دیجیے کہ روح امرِ ربی ہے''۔ اس روح کی اپنے اصل اور ابتداء تک رسائی، اس کے لیے سکون کا باعث اور ''جنت'' اور جزا ہے اور اپنے اصل سے دوری اس کے لیے جہنم اور سزا ہے۔ روح جب ترقی اور عروج حاصل کرتی ہے تو اللہ سے اتحاد نہیں کرتی بلکہ جس طرح ذاتِ حق تعالیٰ اپنے نزول کے دوران عالمِ لاھوت میں روحِ قدسی کی صورت ظاہر ہوا' عالمِ جبروت میں روح سلطانی' عالمِ ملکوت میں روح سیرانی اور عالمِ ناسوت میں روح جسمانی وحیوانی میں ظاہر ہوا۔ اسی طرح روح کے عروج کے دوران جب وہ عالمِ ناسوت سے واپس عالمِ ملکوت اور پھر عالمِ جبروت و لاھوت تک ترقی کرتا ہے تو اس پر سے روح جسمانی' روح سیرانی اور روح سلطانی کی پرتیں اترتی ہیں اور روح قدسی یعنی اللہ کی ذات ظاہر ہو جاتی ہے۔ روح کی پرتیں اس طرح سے نہیں اترتیں جیسے جسم سے لباس اترتے ہیں بلکہ جیسے جیسے انسان پاکیزگی حاصل کر کے مرشد کی مہربانی اور اسمِ اَللّٰہُ ذات کے ذکر و تصور سے قربِ الٰہی حاصل کرتا ہے تو اس کی روح کی پرتیں لطیف اور شفاف ہوتی جاتی ہیں حتیٰ کہ اتنی لطیف ہو جاتی ہیں کہ قلب میں سے جلوۂ حق واضح نظر آنے لگتا ہے اور اپنی لطافت اور پاکیزگی کی بنا پر انسانی روح روحِ قدسی بن جاتی ہے۔ یہ روح قدسی ہمیشہ سے ہر انسان میں موجود ہے لیکن انسانوں کو اس کا ادراک نہیں کیونکہ یہ روحِ جسمانی' سیرانی' سلطانی اور نفس کے پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اس روح قدسی تک عالمِ لاھوت میں رسائی اور اس کی پہچان ہی اللہ کی پہچان ہے۔ حدیثِ قدسی میں فرمایا گیا فَقَدْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ

ترجمہ: ''جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا''۔ اگر نفس، روح اور اللہ علیحدہ علیحدہ وجود ہوتے تو ان کی پہچان بھی علیحدہ علیحدہ ہوتی۔ اپنے ہی نفس کی پہچان اللہ کی پہچان نہ

ہوتی۔ پس جب خدا سے علیحدہ اور اس کے سوا کوئی وجود ہی نہیں تو پھر کیسا اتحاد اور کیسا حلول؟

فصوص الحکم کی شرح کرتے ہوئے محمد ریاض قادری لکھتے ہیں کہ ''علماء حق یعنی صوفیائے کرام کی تحقیق اور مشاہدہ کے مطابق حق محسوس[1] اور مشہود[2] (ظاہر) ہے اور خلق معقول[3] ہے۔ برعکس علماء ظاہر کے کہ خلق محسوس اور مشہود ہے اور حق معقول ہے۔ چونکہ از روئے حقیقت وجود (صرف) حق تعالیٰ کے لیے ہے پس جو کچھ عالمِ حس وشہادت میں ہے وہ وجودِ حق تعالیٰ ہے۔ خلق اس وجودِ حقیقی کے ظہور کا نام ہے۔ پس موجود تو پھر حق تعالیٰ ہوا جو فی نفسہٖ[4] موجود ہے اور اپنے وجود کے لیے دوسرے کا محتاج نہیں اور خلق اپنے وجود کے لیے حق تعالیٰ کی محتاج ہے یعنی اس کا وجود حقیقی نہیں صرف عقلاً ثابت کیا جا سکتا ہے۔ براہِ راست جو موجود ہے وہ حق تعالیٰ ہے۔ اس کا وجود بلا واسطہ براہِ راست موجود ہے اور خلق بالواسطہ موجود ہے۔''

سلطان العارفین حضرت سخی سلطان باھُوؒ اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

اَلْوَجُوْدُ مَوْجُوْدٌ دَائِمٌ لَا فَنَاءٌ لَهٗ اَبَدًا اَلْمَعْدُوْمُ لَا بَقَاءٌ لَهٗ

ترجمہ: وجود ہمیشہ موجود ہے اس کے لیے فنا نہیں اور معدوم ہمیشہ معدوم ہے اس کے لیے بقا نہیں۔

یقین دانم دریں عالم کہ لا موجود اِلا ھُو
ولا موجود فی الکونین لا مقصود اِلا ھُو

ترجمہ: یقین جان کہ کائنات میں ھُو (ذاتِ حق تعالیٰ) کے سوا کوئی موجود نہیں بلکہ دونوں جہانوں میں ھُو کے سوا کچھ موجود نہیں اور اس کے سوا کوئی مقصود نہیں۔

اور فرماتے ہیں ''ہمہ اوست در مغز و پوست'' یعنی ہر چیز کے ظاہر و باطن میں وہی ایک ذات

---

[1] ایسا وجود جس کو ثابت کرنے کے لیے کسی ٹھوس وجود یا عقلی دلیل کی ضرورت نہ ہو۔ جسے دلیل کے بغیر مانا جائے اور احساسات کے ذریعے محسوس کیا جا سکے باوجود اس کے کہ وہ ٹھوس وجود نہ رکھے۔ [2] جس کا مشاہدہ ہر شے میں کیا جائے۔ [3] ایسی شے جسے صرف عقل کے سہارے ثابت کیا جائے حقیقتاً وہ موجود نہ ہو۔ یا ایسی شے جسے اپنا وجود ثابت کرنے کے لیے عقل کی ضرورت ہو۔ اگر عقل اسے ثابت نہ کرے تو اس کا ہونا ثابت نہ ہو سکے۔ [4] از خود

جلوہ گر ہے۔(عین الفقر)

حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ اپنے طالبِ خاص حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے نام ایک خط میں ایک طویل حدیث بیان کرتے ہیں جس میں اسلام کے پانچ بنیادی ارکان کے وہ اسرار و رموز کھول کر بیان فرمائے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو تلقین کیے تھے۔ حدیث کا تمام متن وحدت الوجود پر دلیل ہے۔ حدیث کے اختتام پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال کیا کہ ''ذاتِ رحمٰن کیا ہے؟ اور دیگر اشیاء کیا ہیں؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جواب دیا کہ ''تمام اشیاء مظہرِ الٰہی ہیں۔ درحقیقت سب ایک ہی ہیں۔ ظہور کی صفات مختلف ہیں جیسا کہ ایک ہی مطلب کو مختلف عبارتوں سے ادا کیا جاتا ہے اسی طرح ذات ایک ہی ہے لیکن اس کے مظاہر مختلف ہیں۔'' (اسرارِ حقیقی)

نظریہ وحدت الوجود کا مطالعہ کرنے والے کے ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر عالم میں صرف ذاتِ حق تعالیٰ ہی موجودِ واحد ہے تو ہر جگہ نظر آنے والی اشیاء کیا ہیں۔ سلطان العارفین حضرت سخی سلطان باھُو رحمۃ اللہ علیہ ایک روایت کے ذریعے اس کو واضح کرتے ہیں کہ ایک روز ایک مرید نے اپنے مرشد سے سوال کیا کہ دنیا کی ہر شے میں خلاصہ قدرت کا ذاتی اثر باقی ہے۔ سوائے اللہ کے کوئی شے اختیار نہیں رکھتی۔ مٹی اور پانی کے اس عالمِ موجودات کی جنبش بھی سوائے خلاصۂ قدرت کے ممکن نہیں۔ اس صورت میں جہان اور اہلِ جہان کی پیدائش کیا حقیقت اور حیثیت رکھتی ہے؟ مرشد نے جواب دیا ''جو شے ابتداء اور انتہا رکھتی ہے وہ درحقیقت ہے ہی نہیں' اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اگر تو پوچھے کہ جو عالم ہمیں نظر آتا ہے اس کی حرکت اور جنبش کیا معنی رکھتی ہے تو یہ جان لے کہ عالم صرف ایک وہمی اور خیالی صورت ہے جو نہ ہو کر بھی نظر آتی ہے جس طرح آئینہ میں صورت نظر تو آتی ہے لیکن حقیقتاً نہیں ہوتی۔ اسی طرح جہان کا وجود انسان کی حقیقتِ وجود سے لاعلمی کے سبب ہے۔ وہ آئینے میں نظر آنے والے وجود کو اصل سمجھتا ہے اور اصل وجود سے لاعلم اور بے خبر ہے۔ اگر وہ اصل وجود پر نظر جما لے تو آئینہ (یعنی عالم) اسے نظر نہ

آئے اور ہر جگہ صرف حقیقی وجود (یعنی حق تعالیٰ دکھائی دے)۔ جیسا کہ طلسمات سے کوئی شے بنائی جائے لیکن طلسم کرنے والا اپنی زبان سے کبھی نہ کہے گا کہ یہ طلسم ہے۔ یونہی دنیاوی اشیاء کے ظاہری وجود میں خلاصۂ قدرت کی آمیزش اور اختلاط اس طرح سے کی گئی ہے کہ اس کی حقیقت لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوگئی ہے اور انہیں ظاہری وجود کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یوں عوام کی نظر میں عالم ایک ایسے وجود کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جو حیات اور موت کی امید پر قائم ہے لیکن درحقیقت یہ صرف خلاصۂ قدرت کا ظہور ہے اور جب (حقیقی روحانی آنکھیں کھلنے پر) خلاصہ بذات خود ظاہر ہوتا ہے تو نہ وجود رہتا ہے، نہ حواس، نہ جہان رہتا ہے اور نہ ہی آدم۔ جیسے آگ لکڑی سے جلتی ہے اور اسی لکڑی کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔'' (کلید جنت، شمس العارفین)

فتاویٰ رضویہ میں ہے کہ جب امام احمد رضا خان بریلوی قدس سرہٗ سے مسئلہ وحدت الوجود کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے اس مسئلے کو ایک مثال کے ذریعے واضح کیا کہ ایک بادشاہِ عالی جاہ ایک آئینہ خانے میں جلوہ فرما ہے جس میں تمام اقسام واوصاف کے آئینے نصب ہیں۔ آئینوں کا تجربہ کرنے والا جانتا ہے کہ ان میں ایک ہی شے کا عکس کس قدر مختلف طریقوں سے متجلی ہوتا ہے۔ بعض میں صورت صاف نظر آتی ہے بعض میں دھندلی' کسی میں سیدھی کسی میں الٹی' ایک میں بڑی ایک میں چھوٹی' بعض میں پتلی بعض میں چوڑی' کسی میں خوشنما کسی میں بھونڈی اور یہ اختلاف ان آئینوں کی قابلیت کا ہوتا ہے۔ ورنہ وہ صورت جس کا اس میں عکس ہے' خود واحد ہے۔ آئینہ میں جو مختلف صورتیں اور حالتیں پیدا ہوئیں متجلی[1] ان سے منزہ ہے۔ ان صورتوں کے الٹے بھونڈے دھندلے ہونے سے اُس میں کوئی قصور نہیں ہوتا۔

والله المثل الاعلیٰ

ترجمہ: اور اللہ (کی شان) سب سے بلند ہے۔

اب اس آئینہ خانہ کو دیکھنے والے تین قسم کے لوگ ہیں۔ اول نا سمجھ بچے جنہوں نے گمان کیا

---

[1] تجلی کرنے والا

کہ جس طرح بادشاہ موجود ہے یہ سب عکس بھی موجود ہیں کہ یہ بھی تو ہمیں ایسے ہی نظر آ رہے ہیں جیسے وہ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ اس کے تابع ہیں۔ جب وہ اٹھتا ہے یہ سب کھڑے ہو جاتے ہیں' وہ چلتا ہے یہ سب چلنے لگتے ہیں' وہ بیٹھتا ہے یہ سب بیٹھ جاتے ہیں' تو یہ بھی موجود ہے اور وہ بھی مگر وہ حاکم ہے یہ محکوم۔ اور اپنی نادانی سے نہ سمجھے کہ وہاں تو بادشاہ ہی بادشاہ ہے۔ یہ سب اسی کے عکس ہیں۔ اگر اُس سے حجاب ہو جائے تو یہ سب عکس صفحۂ ہستی سے معدومِ محض ہو جائیں گے۔ ہو کیا جائیں گے' حقیقی وجود سے تو کوئی حصہ ان میں ہے ہی نہیں۔ حقیقتاً بادشاہ ہی موجود ہے۔ باقی سب تو اس کے پرتو[1] کی نمود[2] ہے۔

دوم اہلِ نظر و عقلِ کامل' وہ اس حقیقت کو پہنچے اور اعتقاد بنایا کہ بے شک وجود ایک بادشاہ کے لیے ہے۔ موجود ایک ہی ہے یہ سب ظل و عکس ہیں کہ اپنی ذات میں اصلاً کوئی وجود نہیں رکھتے۔ اس تجلی سے قطع نظر کر کے دیکھو پھر ان میں کچھ رہتا ہے یا نہیں۔ حاشا عدمِ محض کے سوا کچھ نہیں۔ اور جب یہ اپنی ذات میں معدوم و فانی ہیں اور بادشاہ موجود' یہ اس نمودِ وجود میں اسی کے محتاج ہیں اور وہ سب سے غنی' یہ ناقص ہیں وہ تام۔ یہ ایک ذرہ کے بھی مالک نہیں اور وہ سلطنت کا مالک۔ یہ کوئی کمال نہیں رکھتے' حیات' علم' سمع' بصر' قدرت' ارادہ کلام سب سے خالی ہیں اور وہ سب کا جامع۔ تو یہ اس کا عین کیونکر ہو سکتے ہیں۔ لاجرم یہ نہیں کہ یہ سب وہی ہیں بلکہ وہی وہ ہے اور یہ صرف اس کی تجلی کی نمود۔ یہی حق و حقیقت اور یہی وحدۃ الوجود۔

سوم عقل کے اندھے' سمجھ کے اوندھے ان ناسمجھ بچوں سے بھی گئے گزرے۔ انہوں نے دیکھا کہ جو صورت بادشاہ کی ہے وہی ان کی' جو حرکت وہ کرتا ہے یہ سب بھی کرتے ہیں' تاج جیسا کہ اس کے سر پر ہے بعینہٖ ان کے سروں پر بھی ہے۔ انہوں نے عقل و دانش کو پیٹھ دے کر بکنا شروع کیا کہ یہ سب بھی بادشاہ ہیں اور اپنی حماقت سے وہ تمام عیوب و نقائص جو نقصانِ قوابل[3] کے باعث ان آئینوں میں تھے، خود بادشاہ کو ان کا مورد ٹھہرا دیا کہ جب یہ وہی ہیں تو ناقص' عاجز'

---

[1] عکس [2] اظہار [3] قابلیت کی جمع

محتاج، الٹے بھونڈے، بدنما، دھندلے کا جو عین ہے وہ بھی قطعاً انہی ذمائم سے متصف ہے۔ تعالٰی اللّٰہِ عَمَّا الظّٰلِمُوْنَ عُلُوًّا کَبِیْرًا O ترجمہ: ظالم جو کچھ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند و بالا ہے۔

انسان عکس ڈالنے میں آئینے کا محتاج ہے اور وجودِ حقیقی احتیاج سے پاک۔ وہاں جس کو آئینہ کہیں وہ خود ہی ایک ظل ہے۔ پھر آئینے میں انسان کی صرف مقابل (سامنے کی) سطح کا عکس پڑتا ہے جس میں انسان کی صفات مثلِ کلام و سمع و بصر و علم و ارادہ و حیات سے اصلاً نام کو بھی کچھ نہیں دکھائی دیتا (یعنی انسان کے عکس میں صرف انسان کی ظاہری صورت دکھائی دیتی ہے اور صفات نظر نہیں آتیں) لیکن وجودِ حقیقی اللہ عزوجل کے مجلیٰ نے اپنے ظلال[1] پر نفسِ ہستی کے سوا اپنی صفات کا بھی پرتو ڈالا۔ یہ وجہ اور بھی ان بچوں کی نافہمی اور ان اندھوں کی گمراہی کا باعث ہوئی اور جن کو ہدایتِ حق ہوئی وہ سمجھ گئے کہ:

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

ترجمہ: ''اس گھر میں ایک چراغ ہے اس کی روشنی سے ہی ہر جگہ بارونق ہے''۔ (فتاویٰ رضویہ۔ اقتباس از شمس الفقرا)

پس جن اشیاء کا ذاتی کوئی وجود ہی نہیں ان کا ذاتِ حق تعالیٰ سے اتحاد ممکن ہی کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ فانی ہیں، وہ باقی ہے۔ یہ محتاج ہیں اپنے وجود کے لیے بھی اور وہ بے نیاز ہے ہر احتیاج سے۔ ہستی مطلق یعنی ذات حق تعالیٰ کا مخلوق سے اتحاد ممکن ہی نہیں۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر اولیاء اللہ کی تصنیفات میں حق اور خلق کے اتحاد کا تذکرہ کیا بھی جائے تو اس سے وہ اتحاد مراد نہ لیا جائے جو دو جداگانہ وجودوں کے آپس میں مل جانے سے ہوتا ہے بلکہ خلق حق تعالیٰ سے اس طرح متحد یعنی جڑی ہوئی ہے کہ اس کا وجود ہے ہی حق تعالیٰ سے۔ یہ اتحاد وہی ہے

---

[1] ظل کی جمع۔ سایہ یا عکس

جو جُز کا کُل سے ہوتا ہے' جو قطرے کا سمندر سے ہوتا ہے کہ قطرے کا وجود بھی سمندر سے ہے اور اسی میں فنا ہو کر وہ واپس اپنے اصل سے متحد ہو گیا۔ قطرے کا اپنا ذاتی کوئی وجود نہیں' اس کا وجود سمندر سے ہی ہے اور جب وہ سمندر میں فنا ہو کر اس سے متحد ہوا تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دو وجود متحد ہوئے بلکہ یہ کہا جائے گا کہ قطرے نے اپنے ''اصل'' وجود کی طرف رجوع کیا' یا اپنی ابتدا کی طرف لوٹ گیا کہ کُلُّ شَیءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ ''ہر شے اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔'' (حدیث)

☆☆☆☆☆☆

وَلِھٰذَا الْوُجُوْدِ الْوَاحِدِ ظُھُوْرٌ وَّھُوَ الْعَالَمُ وَبُطُوْنٌ وَّھُوَ الْاَسْمَآءُ وَبَرْزَخٌ جَامِعٌ فَاصِلٌ بَیْنَھُمَا لِیَتَمَیَّزَ بِهِ الظُّھُوْرُ عَنِ الْبُطُوْنِ وَھُوَ الْاِنْسَانُ الْکَامِلُ فَالظُّھُوْرُ مِرْاٰةُ الظُّھُوْرِ وَالْبُطُوْنُ مِرْاٰةُ الْبُطُوْنِ وَمَا کَانَ بَیْنَھُمَا فَھُوَ مِرْاٰةٌ جَمْعًا وَّ تَفْصِیْلًا۔

ترجمہ: اس واحد وجود کے لیے ظہور ہے اور وہ عالم ہے' اور بطون ہے وہ اسماء ہیں' اور ایک برزخ ہے جو جامع اور دونوں میں فاصل ہے تاکہ اس کی وجہ سے ظہور بطون سے متمیز ہو اور وہ انسانِ کامل ہے۔ پس ظہور آئینہ ہے ظہور کا اور بطون آئینہ ہے بطون کا اور جو مرتبہ ان دو کے درمیان ہے وہ آئینۂ جامع اور فاصل ہے۔

شرح: چنانچہ عالم میں جو کچھ بظاہر دکھائی دیتا ہے وہ ذاتِ حق تعالیٰ کے ظہور کے سوا کچھ نہیں اور ہر شے کا باطن بھی ذاتِ حق تعالیٰ کے اسماء و صفات کے انوار کے سوا کچھ نہیں۔ اسماء و صفات کے انوار سے مراد ہر مخلوق کی اندرونی قوتیں ہیں جن کی وجہ سے وہ حیات' سمع' بصر' علم وغیرہ کی صفات رکھتی ہے۔ واضح ہو کہ کائنات کی کوئی شے بھی ''بے جان'' کے زمرے میں نہیں آتی۔ ہر شے کا وجود ذاتِ حق تعالیٰ کا ظہور ہے اور اللہ تعالیٰ حیّ و قیوم ہے۔ جانوروں اور پودوں کو تو ہم زندہ مانتے ہی ہیں لیکن سائنسی نقطۂ نگاہ سے جن جمادات کو ''بے جان'' قرار دیا جاتا ہے ان کے مادے کو بھی

خوردبین سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ جن ایٹموں سے مل کر بنے ہیں وہ ایٹم مسلسل حرکت کر رہے ہیں۔ ان کے نیوکلیئس کے گرد الیکٹران مسلسل اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔ بعض عناصر (Elements) کے ایٹم بے پناہ قوت کے حامل ہیں جن سے ایٹم بم تیار ہوتے ہیں۔ تمام عناصر قوت کو خارج بھی کرتے ہیں اور جذب بھی کرتے ہیں۔ آپس میں جوڑے (Bonds) بھی بناتے ہیں، پرانے ایٹم مرتے بھی ہیں اور نئے پیدا بھی ہوتے ہیں (اسی وجہ سے اشیاء گلتی، سڑتی، گھستی اور پرانی ہوتی ہیں) ایک سے دوسرے کو حرارت اور بجلی منتقل بھی کرتے ہیں۔ ان سب افعال کے لیے انہیں ''قوت'' درکار ہے۔ دنیا کی کوئی بھی شے خود ''قوت'' کو پیدا نہیں کر سکتی کیونکہ طبعیات (Physics) کا ایک قانون ہے کہ

"Eneryg can neither be created nor destroyed. It can only be transformed from one form to another."

ترجمہ: ''قوت کو نہ تخلیق کیا جا سکتا ہے نہ تباہ کیا جا سکتا ہے۔ اسے صرف ایک قسم سے دوسری قسم میں تبدیل کیا جا سکتا ہے''۔ یعنی 'قوت' کا ماخذ دنیا کی کوئی شے نہیں تو پھر اشیاء کو اپنے افعال کے لیے قوت کہاں سے حاصل ہوتی ہے؟ بے شک کائنات کی ہر شے کی قوت کا باعث اس شے کے اندر ہی موجود نورِ حق تعالیٰ[1] ہے جو تمام قوتوں کا مالک، ان کا پیدا کرنے والا، ان کا منبع، مصدر اور سرچشمہ ہے جیسا کہ اللہ نے خود قرآن میں واضح فرما دیا اَنَّ الْقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا (البقرہ۔165) ترجمہ: بے شک تمام قوتوں کا مالک اللہ ہے''۔ اسی نور کی قوت کے باعث یہ حرکت کرتی، بڑھتی، پھلتی پھولتی ہیں۔ یہی نور سورج کی حرارت، چاند کی روشنی، پانی کی روانی، پھول کی خوشبو، تتلی کی اڑان میں ہے۔ یہی نور ایک 'نطفے' کو 'انسان' بننے کی قوت دیتا ہے۔ اسی نور کی موجودگی کی بنا پر ہم کائنات کی کسی بھی شے کو 'بے جان' نہیں کہہ سکتے۔ ذاتِ حق تعالیٰ کے اسماء وصفات کے انوار

---

[1] حال ہی میں سائنسدانوں نے ایٹم میں موجود ایک ''خدائی ذرہ'' (یعنی نورِ حق) دریافت کیا ہے اُن کے مطابق ایٹم یا مادے میں اسی ''خدائی ذرہ'' (نورِ حق) سے حیات ہے۔

ان اشیاء کی تمام باطنی قوتوں کا باعث ہیں اور ان کو عطا کی جانے والی تمام صفات ذاتِ حق تعالیٰ کے اسماء کی بدولت ہیں کہ اسی واحد ذات کا نزول اشیائے عالم کے ظہور کا باعث بنا۔ ہر جا وہی ذات جلوہ گر ہے خواہ ظاہر ہو یا باطن۔

لیکن ''انسان'' کے سوا باقی تمام مخلوقاتِ عالم میں ظہورِ ذات اور اسماء وصفات کے انوار اور قوتیں کامل طور پر موجود ہونے کے باوجود مکمل طور پر جلوہ گر نہیں۔ ذات تو ہر جگہ موجود بھی ہے اور کامل ومکمل بھی ہے لیکن اس کے تمام اسماء اور صفات ہر شے میں مکمل طور پر اجاگر نہیں بلکہ ہر شے کے اس دنیا میں مقصد اور ضرورت کے مطابق اس میں صفات واسماء کی قوتیں اور انوار ظاہر ہوتے ہیں۔ جن صفات کی اس شے کو ضرورت نہیں' ان کے انوار ان میں ظاہر نہیں ہوتے۔ البتہ اس کے باطن میں موجود اور قائم رہتے ہیں۔ اسی بنا پر کائنات کی ہر شے روزِ قیامت بولے گی اور جو کچھ اس سے پوچھا جائے گا اس کے متعلق گواہی دے گی۔ جیسا کہ فرمایا گیا ترجمہ: ''آج ہم اُن کے مونہوں پر چپ کی مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے اور ان کے پاؤں ان کے اعمال کی گواہی دیں گے جو وہ کمایا کرتے تھے''۔ (سورۃ یٰسین۔ 65)۔ گواہی دینے کے لیے حیات' سمع بصر' علیم' خبیر کی صفات کا موجود ہونا لازمی ہے۔ ہر شے میں ذاتِ حق تعالیٰ مکمل صفات کے ساتھ موجود تو ہے لیکن دنیا میں ان تمام صفات کا اظہار اس شے کی دنیا میں ضرورت اور ''قدر'' (value) کے مطابق ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مچھلی کو جس قدر 'علم' کی ضرورت ہے اسی قدر صفتِ علیم کے انوار اس میں ظاہر ہوں گے' اسی طرح پتھروں میں سننے' دیکھنے' بولنے کی تمام قوتیں موجود ہیں تبھی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دست مبارک میں چند سنگریزوں نے صاف کلمہ پڑھا اور لوگوں نے سنا بھی' اور حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑ بھی تسبیح میں شامل ہوتے تھے۔ اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام تمام مخلوقات کی زبان سمجھتے اور ان سے انہی کی زبان میں بات کرتے تھے۔ قرآن کریم میں بھی اللہ فرماتا ہے کہ ''زمین اور آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اللہ کی تسبیح کرتے ہیں مگر تمہیں اس کا شعور نہیں۔'' یعنی تمام مخلوقات میں اللہ کی ذات تمام صفات سمیت

موجود ہے کہ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لیکن ذات کی یہ قوتیں صرف اتنی ہی مقدار میں اور تب ہی ان سے ظاہر ہوئیں جتنا اور جب حکمِ الٰہی ہوا ورنہ عموماً یہ تمام قوتیں باطنی طور پر موجود ہوتے ہوئے بھی دنیا میں ظاہر نہیں ہوتیں۔ اسی طرح دیگر تمام اشیاء کے لیے ہے کہ باطنی طور پر تمام اسماء وصفات کے انوار موجود ہوتے ہوئے بھی ظاہر صرف وہی ہوتے ہیں جن کی ضرورت اس شے کی اس دنیا میں حیات کے لیے لازمی ہے اور دیگر صفات چھپی رہتی ہیں۔

انسان دیگر مخلوقات سے اشرف اس لیے ہے کہ دنیا میں جس مخلوق میں سب سے زیادہ اسماء وصفاتِ الٰہیہ کے انوار ظاہر ہوئے وہ انسان ہے اور جس کو ان صفات سے متصف ہونے کی سب سے زیادہ صلاحیت عطا کی گئی وہ بھی انسان ہی ہے۔ یعنی ذاتِ حق تعالیٰ جس قدر کامل طور پر ذاتِ انسان میں ظاہر ہوسکتی ہے کسی اور شے میں نہیں۔ جیسا کہ رسالہ الغوثیہ میں اللہ تعالیٰ حضور غوث الاعظم رضی اللہ عنہ سے فرماتا ہے کہ ''میں جیسا انسان میں ظاہر ہوا کسی اور میں ظاہر نہیں ہوا۔'' لیکن ان صفات سے متصف ہونے اور ذاتِ انسان میں ذاتِ حق تعالیٰ کے مکمل طور پر ظاہر ہونے کے لیے انسان کو بشری صفات یعنی شر کی صفات کو مکمل طور پر مغلوب کر کے ذاتِ حق تعالیٰ کا انتہائی قرب حاصل کرنا ہوگا۔ اللہ کی ذات اور اسماء کے انوار کی موجودگی کی وجہ سے ہی انسانوں میں حیات' سمع' بصر' علم' رحمت' مغفرت' رزاقیت وغیرہ کی صفات دیگر مخلوقات سے زیادہ ظاہر ہیں۔ قربِ الٰہی کے حصول کے ساتھ ساتھ نہ صرف ان صفات کے انوار زیادہ سے زیادہ ظاہر ہوتے جاتے ہیں بلکہ دیگر اسماء وصفات بھی ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ تمام انسانوں میں اللہ کی ذات اور تمام صفات کی استعداد کی موجودگی کے باوجود یہ تمام انسانوں میں بھی مکمل ظاہر نہیں ہوتی بلکہ ان کے مقامِ قربِ الٰہی کے مطابق ہی ظاہر ہوتی ہے اور جس انسان میں ذاتِ حق تعالیٰ مکمل و کامل ترین صفات کے ساتھ ظاہر ہے وہ ازل سے ابد تک صرف ایک ہی ذات ہے یعنی انسانِ کامل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جو ہر زمانے میں لباس بدل کر اس زمانے کے انسانِ کامل کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ حضرت ابراہیم الجیلی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تصنیف ''انسان کامل'' میں فرماتے ہیں: ''انسانِ کامل

وہ قطب ہے جس پر اول سے آخر تک وجود کے فلک گردش کرتے ہیں اور وہ جب وجود کی ابتدا ہوئی اس وقت سے لے کر ابدالآباد تک ایک ہی شے ہے۔ پھر اس کے لیے رنگا رنگ لباس ہیں اور باعتبار لباس اس کا ایک نام رکھا جاتا ہے کہ دوسرے لباس کے اعتبار سے اس کا وہ نام نہیں رکھا جاتا۔ اس کا اصلی نام محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے اس کی کنیت ابوالقاسم اور وصف عبداللہ اور اس کا لقب شمس الدین ہے۔ پھر باعتبار دوسرے لباسوں کے اس کے نام ہیں۔ پھر ہر زمانے میں اس کا ایک نام ہے جو اس زمانے کے لباس کے لائق ہوتا ہے۔''

چنانچہ انسانِ کامل کی ذات ازل سے ابد تک وہی ذات ہے جس سے ''وجود'' کی ابتدا ہوئی' جس میں ذات حق تعالیٰ ظاہر ہوئی، جو مراۃِ الٰہی اور ذات کا اظہار ہے' جس کے سوا ذات حق تعالیٰ کہیں بھی مکمل جلوہ گر نہیں ہے۔ انسانِ کامل اگر ایک طرف ذاتِ حق تعالیٰ کا مکمل اور واحد اظہار ہے تو دوسری طرف اس میں انسانوں کے تمام جسمانی اوصاف بھی موجود ہیں۔ وہ انسانوں میں انسانوں کی طرح بھی رہتا ہے اور حضرتِ باری کی کامل جلوہ گاہ بھی ہے۔ اس کا ایک رخ اگر بشریت اور عبودیت ہے تو دوسرا رخ ربوبیت ہے۔ اس لحاظ سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ انسانِ کامل کو ''برزخ'' کے اسم سے موسوم کر رہے ہیں۔ برزخ کے لفظی معنی حاجز[1] اور فاصل[2] کے ہیں۔ دو حالتوں اور دو چیزوں کے درمیان جو چیز فاصل ہو اسے برزخ کہتے ہیں۔ اسی لیے موت کے بعد قیامت اور حشر تک کے زمانے کو عالمِ برزخ کہا جاتا ہے جو حیاتِ دنیوی اور حیاتِ اخروی کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ برزخ سے مراد وہ شے ہے جو دو چیزوں کے درمیان موجود ہو، جس کا ایک رخ ایک طرف ہو تو دوسرا رخ دوسری طرف اور جس کا تعلق دونوں طرف کی حالتوں سے ایک جیسا برابر ہو۔ اگر ایک طرف سے دیکھیں تو لگے کہ اس کا رُخ ادھر ہی ہے اور دوسری طرف سے دیکھیں تو لگے کہ نہیں اس کا رخ تو ادھر ہے۔ یعنی وہ دونوں اطراف میں کامل و مکمل طور پر ظاہر ہو۔ اس لحاظ سے انسانِ کامل برزخ ہوا جیسا کہ سلطان العارفین حضرت سخی سلطان باھُو رحمۃ اللہ علیہ رسالہ روحی شریف

---

[1] حائل۔ پردہ۔ آڑ۔ روک [2] جدا کرنے والا، فرق کرنے والا

میں فرماتے ہیں کہ:

''اگر آنہارا خدا خوانی بجا واگر بندۂ خدا دانی روا''

ترجمہ: اگر تو انہیں خدا کہے تو بجا اور اگر بندۂ خدا جانے تو روا۔

پس انسانِ کامل نہ صرف ربوبیت اور عبودیت کا جامع ہے بلکہ ان دونوں یعنی خالق ومخلوق کے درمیان حدِ فاصل بھی ہے' واسطہ بھی ہے' رابطہ بھی ہے اور حجاب بھی ہے کہ برزخ کے ایک معنی پردے اور حجاب کے بھی ہیں جیسا کہ قرآن میں ہے کہ:

وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا (الفرقان:53)

ترجمہ: اور وہی (اللہ) ہے جس نے دو دریاؤں کو ملا دیا۔ یہ (ایک) میٹھا نہایت شیریں ہے اور یہ (دوسرا) کھاری نہایت تلخ ہے اور اس نے ان دونوں کے درمیان ایک پردہ اور مضبوط حجاب بنا دیا ہے۔

اس آیت کریمہ میں دو دریاؤں سے مراد دنیا اور آخرت لیا جا سکتا ہے۔ جس کی دنیا تلخ اس کی آخرت میٹھی اور جس کی دنیا میٹھی اس کی آخرت تلخ اور ان دونوں کے درمیان حجاب انسان کا اپنا وجود ہے۔ جیسے ہی انسان اپنے بشری وجود کے حجاب سے مر کر یا روحانی حیات پا کر آزاد ہو جاتا ہے دنیا اور آخرت کی سب حقیقتیں اس کے سامنے کھل جاتی ہیں۔ پس اس آیت کریمہ کے مطابق برزخ کے معنی پردے یا حجاب کے ہوئے۔

انسانِ کامل کی بشریت بھی دیگر تمام انسانوں کے لیے حجاب ہے کہ اس کا باطن تمام تر ذاتِ حق تعالیٰ ہے' اس کا ظاہر تمام تر مظہرِ الٰہی ہے لیکن اس کا دیگر انسانوں جیسا جسمانی وجود ان لوگوں کے لیے حقیقت سے ایک مضبوط حجاب ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرمایا کہ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ترجمہ ''کہہ دیجیے کہ ''میں بھی تمہاری مثل ایک بشر ہی ہوں''۔ جبکہ دوسری طرف فرمایا:

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال۔17)

ترجمہ: (اے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) جب آپ نے (ان کافروں پر) پتھر مارے تھے تو (وہ) آپ نے نہیں بلکہ اللہ نے مارے تھے۔

اور فرمایا کہ

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ (الفتح۔10)

ترجمہ: (اے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) بے شک جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ (درحقیقت) اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔

ان آیات میں ایک طرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جہتِ بشریت کی بات کی جا رہی ہے دوسری طرف جہتِ ربوبیت کی بات ہو رہی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات دونوں لحاظ سے مکمل اور جامع ہے اور اس لیے بھی برزخ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بشریت ان لوگوں کے لیے حجاب ہے جن کی نظر آپ کی حقیقت پر نہیں، جن کے متعلق اللہ نے فرمایا:

وَتَرٰاهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (الاعراف۔198)

ترجمہ: اے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تو دیکھے کہ تیری (بشریت کی) طرف تکتے ہیں اور (تیری حقیقت میں سے) کچھ نہیں دیکھتے۔

سورہ رحمٰن میں اللہ فرماتا ہے:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝ (الرحمٰن:19-20)

ترجمہ: ''اسی نے دو سمندر رواں کیے جو باہم مل جاتے ہیں۔ ان کے درمیان ایک آڑ (برزخ) ہے، (وہ اپنی اپنی) حد سے تجاوز نہیں کر سکتے۔'' اس آیت مبارکہ میں دو سمندروں سے مراد انسان کا ظاہر اور باطن ہے جو باہم ملے ہوئے ہیں کہ ایک ہی انسانی وجود میں اس کا ظاہر بھی موجود ہے اور باطن بھی پنہاں ہے لیکن باہم ملے ہونے کے باوجود انسان کا ظاہر علیحدہ ہے اور باطن علیحدہ البتہ انسانِ کامل کا ظاہر ہی اس کا باطن اور اس کا باطن ہی اس کا ظاہر ہے کہ یہاں کوئی دوئی نہیں

بلکہ یکجائی ہے۔اس لحاظ سے وہ برزخ ہے کہ صرف اسی کا وجود ہے جہاں ظاہر و باطن علیحدہ علیحدہ نہیں بلکہ ایک ہی ہیں جبکہ باقی تمام مخلوق میں ظاہر کے وجود کا سمندر اور ہے اور باطن کے وجود کا سمندر اور، اور انسانِ کامل وہ مقام ہے جہاں یہ سمندر یکجا ہیں۔اس کے سوا نہ کسی مخلوق میں ربوبیت کے آثار پیدا ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ربّ تعالیٰ میں عبودیت کے آثار پیدا ہو سکتے ہیں۔رب رب ہی ہے اور مخلوق مخلوق ہی ہے۔اسی لیے مندرجہ بالا آیت میں فرمایا کہ ''وہ اپنی اپنی حد سے تجاوز نہیں کر سکتے۔'' صرف انسانِ کامل ہی ربوبیت وعبودیت کا جامع ہے اسی لیے برزخ اور خالق و خلق کے درمیان فاصل ہے۔ نہ وہ صرف ''عبد'' ہے اور نہ صرف ''ھُو'' بلکہ وہ دونوں کا جامع ''عبدہٗ'' ہے جس کے متعلق اقبال رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا:

عبدہٗ از فہمِ تو بالا تر است
زاں کہ اوہم آدم و ہم جوہر است[1]

ترجمہ: عبدہٗ تیری عقل وفہم سے بالاتر ہے کیونکہ وہ بشر بھی ہے اور جوہر (نور) بھی۔

انسانِ کامل پردہ ہے ظاہر اور باطن، خالق اور خلق کے درمیان اس لیے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ فرماتے ہیں کہ ''اس کی وجہ سے ظہور (ظاہر کی جمع) بطون (باطن کی جمع) سے متمیز ہوا۔'' انسانِ کامل تمام عالم کا آئینہ ہے اس لیے اس کا ظاہر ہر ظاہر کے لیے آئینہ ہے اور اس کا باطن تمام بطون کا آئینہ ہے۔وہ حق اور خلق کے درمیان پردہ کی طرح ہے لیکن یہ پردہ اپنی لطافت اور شفافیت کے باعث دونوں کے لیے آئینے کی طرح ہے۔ایک طرف سے وہ ذاتِ حق تعالیٰ کا آئینہ ہے تو دوسری طرف تمام مخلوق کی اصل صورتیں بھی اس میں واضح نظر آتی ہیں۔اللہ تعالیٰ تو اس مرآۃِ کامل کے سوا کسی میں خود کو دیکھنا پسند نہیں فرماتا لیکن مخلوق اس آئینہ کی حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر اس میں نظر آنے والی اپنی ہی صورتوں کو پہچان بھی نہیں پاتی۔حدیثِ مبارکہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ''میں ذات کا شفاف آئینہ ہوں۔حقائق کی صورتیں، مظاہرِ صفاتِ جلالیہ و

---

[1] جاوید نامہ

جمالیہ مجھ میں روشن ہیں۔ ہر مظہر مجھ میں وہی دیکھتا ہے جو اس میں ظاہر ہے پس ابوبکر (رضی اللہ عنہ) مجھ میں وہی دیکھتا ہے جو اس میں ظاہر ہے (یعنی حسن و جمال، لطف اور کمال) اسی لیے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ وماراَیت احسن صور صورۃ منک ترجمہ: ''میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عمدہ صورت میں کسی کو نہیں دیکھا'' اور ابوجہل لعین کو مجھ میں وہی کچھ دکھلائی دیتا ہے جو اس میں ظاہر ہے (یعنی قہر اور انکار اور ضلال) پس اپنے حق میں کہتا ہے:

فاراَیت اقبح صورۃ منه

ترجمہ: ''میں نے اُس سے زیادہ قبیح صورت نہیں دیکھی''۔ پس ابوبکر (رضی اللہ عنہ) نے مجھ میں اپنے آپ کو دیکھا اور اپنے حسن و جمال کا وصف بیان کیا اور ابوجہل نے مجھ میں اپنے آپ کو دیکھا تو اسے اس کی اپنی زشتی اور روسیاہی دکھائی دی۔ مگر میں نہ یہ ہوں اور نہ وہ اور نیز ہر شان میں تمام کے ساتھ ہوں۔''

جیسا کہ آئینہ خود تو بے رنگ ہے نہ اس میں نظر آنے والا سرخ رنگ اسے سرخ بنا سکتا ہے نہ سیاہ رنگ اسے سیاہ کر سکتا ہے۔ پس خود تو نہ وہ سرخ ہے نہ سیاہ لیکن سب کو ان کے اصل رنگ سے آشنا کر دیتا ہے۔ نہ ان میں سے ہے نہ ان سے جدا۔ پس انسانِ کامل مظہر عجائب الغرائب ہے اور اس کا وجود طلسمات کا گنج معمہ ہے۔

☆☆☆☆☆☆

وَاِذَا تَقَرَّرَ هٰذَا فَلْنَرْجِعْ اِلٰى مَا كُنَّا بِسَبِيْلِهٖ فَنَقُوْلُ كَمَآ اَنَّ بَيْنَ ذَاتِ الْحَقِّ وَذَاتِ الْاِنْسَانِ الْكَامِلِ وَعِلْمَ الْحَقِّ وَعِلْمِهٖ مُضَاهَاةٌ وَّ اَنَّ كُلَّ مَافِيْهَا مُجْمَلٌ فَهُوَ فِيْهَا مُجْمَلٌ وَّكُلُّ مَا فِيْهِ مُفَصَّلٌ فَهُوَ فِيْهِ مُفَصَّلٌ كَذٰلِكَ بَيْنَ الْقَلَمِ وَ رُوْحِ الْاِنْسَانِ وَاللَّوْحِ وَقَلْبِ الْاِنْسَانِ وَالْعَرْشِ وَجِسْمِ الْاِنْسَانِ وَالْكُرْسِيِ وَنَفْسِ الْاِنْسَانِ

مُضَاهَاةٌ وَكُلٌّ وَاحِدٍ مِنْهَا مِرْاٰةٌ لِّمَا يُضَاهِيهِ فَكُلُّ مَا فِي الْقَلَمِ مُجْمَلٌ فَهُوَ فِيْ رُوحِهِ مُجْمَلٌ وَ كُلُّ مَا فِي اللَّوْحِ مُفَصَّلٌ فَهُوَ فِي قَلْبِهِ مُفَصَّلٌ وَكُلُّ مَا فِي الْعَرْشِ مُجْمَلٌ فَهُوَ فِي جِسْمِهِ مُجْمَلٌ وَكُلُّ مَا فِي الْكُرْسِيِّ مُفَصَّلٌ فَهُوَ فِيْ نَفْسِهِ مُفَصَّلٌ فَالْاِنْسَانُ كِتَابٌ جَامِعٌ لِّجَمِيعِ الْكُتُبِ الْاِلٰهِيَّةِ وَ الْكَوْنِيَّةِ۔

ترجمہ: جب یہ ثابت ہو چکا (کہ تمام عالم آئینہ حق کے سوا کچھ نہیں) تو ہم اس بیان کی طرف واپس رجوع کرتے ہیں جس میں ہم پہلے تھے کہ ذات حق تعالیٰ اور ذاتِ انسانِ کامل اور علمِ اللہ اور علمِ انسانِ کامل میں مشابہت ہے اور ہر وہ چیز جو اس (ذات حق تعالیٰ) میں مجمل ہے وہی اس (انسانِ کامل) میں مجمل ہے اور ہر وہ چیز جو اس میں مفصل ہے وہی قلبِ انسان میں مفصل ہے اور ہر وہ چیز کہ عرش میں مجمل ہے وہی اس کے جسم میں مجمل ہے اور ہر وہ چیز کہ کرسی میں مفصل ہے وہی انسان کے نفس میں مفصل ہے پس انسان کتابِ جامع ہے واسطے تمام کتبِ الٰہیہ اور کونیہ کے۔

شرح: جیسا کہ شرح مرآۃ العارفین میں بیان کیا جا چکا ہے کہ انسان مظہرِ ذات حق تعالیٰ ہے کہ اللہ کی ذات اپنی تمام تر جزئیات وتفصیلات' اسماء اور صفات سمیت ذاتِ انسان میں موجود ہے۔ اور ہر انسان میں موجود ہے بصورت ایک بیج کے جس میں تمام تر درخت اپنی تمام جزئیات و تفصیلات کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ نظریہ وحدت الوجود کے مطابق تمام اشیاء اپنا ظاہری وجود حاصل کرنے سے قبل علمی صورت میں ذات حق تعالیٰ میں مجمل طور پر موجود تھیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے اظہار کا ارادہ فرمایا تو سب سے پہلے اپنے نور سے قلم یا نورِ محمدی کو پیدا فرمایا۔ قلم میں بھی تمام اشیاء کا علم مجمل صورت میں موجود تھا اور نورِ محمدی میں بھی۔ ''قلم'' کو پیدا کرنے سے مراد نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کرنا ہے۔

جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا گیا کہ انسانِ کامل برزخ ہے اور برزخ سے مراد ایک ایسا مقام ہے

جو دو مقامات کے درمیان ہو اور جس کا تعلق دونوں مقامات سے یکساں ہو یا دو حالتوں کے درمیان پایا جانے والا ایسا پردہ ہے جس کا ایک رخ ایک حالت کی طرف ہو اور دوسرا رخ دوسری حالت کی طرف۔ پس انسانِ کامل کو اگر ''قلم'' کہا جائے تو یہ اس کا رخِ ربوبیت ہے اور اگر نور کہا جائے تو یہ اس کا رخِ بشریت ہے۔ اسی طرح قلم کا لوح' عرش اور کرسی کی صورتوں میں حالت اجمال سے حالتِ تفصیل کی طرف سفر کرنا درحقیقت ذاتِ حق تعالیٰ کا نزول کی طرف سفر کرنا ہے تو یوں یہ نزول انسانِ کامل کے رخِ ربوبیت کا نزول ہے اور اسی نزول کے دوران نور سے روحِ قدسی اور اس سے قلب، نفس اور جسم کا تخلیق ہونا انسانِ کامل کے رخِ بشریت کی تکمیل ہے۔ عرش انسانِ کامل کا رخِ ربوبیت ہے تو قلب اس کا رخِ بشریت ہے، کرسی اس کا رخِ ربوبیت ہے تو نفس اس کا رخِ بشریت ہے حالانکہ ذات ایک ہی ہے۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب

یوں انسانِ کامل ازل سے ابد تک برزخ ہے۔ آغازِ حیات سے ہی وہ ربوبیت و عبودیت کا جامع اور دونوں کے درمیان پردہ ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل نقشہ سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے:۔

عالم		مرتبہ	نزول کے مراتب
عالمِ امر	ھاھویت	احدیت	نورِ الٰہی قلم ← لوح ← عرش ← کرسی ← کائنات (رخِ ربوبیت) انسانِ کامل نورِ محمدی ﷺ ← روحِ قدسی ← قلب (روحِ انسانی کی تخلیق کا آغاز) ← نفس ← جسم (رخِ بشریت)
	یاھوت	وحدت	
	لاھوت	واحدیت	
عالمِ خلق	جبروت	عالمِ ارواح	
	ملکوت	عالمِ مثال	
	ناسوت	عالمِ اجسام	

نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور قلم کا ظہور ایک ہی وقت ہوا اور یہ دونوں دو علیحدہ وجود نہیں بلکہ ایک ہی وجود کے دورخ ہیں۔ اسی ایک وجود میں ایک طرف تمام حقائقِ الٰہیہ جمع ہیں اور دوسری طرف تمام حقائقِ کونیہ۔ البتہ اجمال اور تفصیل کے لحاظ سے یہ ایک ہی ہیں یعنی جس طرح قلم میں تمام اشیائے عالم اجمالاً (خلاصہ مگر جامع) حالت میں موجود ہیں اسی طرح نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں بھی اجمالاً موجود ہیں۔ اگلے مرتبے پر قلم سے لوح پر تمام حقائق (الٰہیہ وکونیہ) تفصیلاً ظاہر ہوئے اور اسی مرتبے میں نورِ محمد اجمال سے تفصیل کی طرف سفر کرتے ہوئے روحِ قدسی میں ڈھلا۔ نور و قلم اگر اجمال ہے تو لوح یا روحِ قدسی تفصیل ہے۔

روحِ قدسی اگر وہ شے ہیں جہاں نور مرکوز و مجتمع ہے تو قلب وہ مقام ہے جہاں نور کو وسعت و پھیلاؤ حاصل ہوا۔ قلب کی وسعت کے متعلق سلطان العارفین رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اے میرے عزیز! منتہی کامل (انسانِ کامل) کا دل حق تعالیٰ کی ذات کے لیے فراخ اور وسیع ہوتا ہے اور تجلّیٔ حق اس میں سما جاتی ہے لیکن رحمتِ خدا میں نہیں سما سکتی۔ اگر رحمتِ حق کو رَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ (الاعراف۔ 156) ''میری رحمت ہر شے سے وسیع ہے'' کے مطابق وسعت دی جائے تو پھر بھی انسانِ کامل کے قلب کے مشابہ نہیں ہو سکتی کیونکہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ''میں زمین و آسمان میں نہیں سما سکتا لیکن مومن کے قلب میں سما جاتا ہوں۔'' (سلطان الوھم)

نزول کے جس درجے پر قلم سے علمِ حق لوحِ محفوظ پر منتقل ہوا اسی مرتبے پر نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم روحِ قدسی میں ڈھلا۔ اس طرح ''لوح'' انسانِ کامل کا رخ ربوبیت ہے اور روحِ قدسی اس کا رخِ بشریت۔ حالانکہ یہ دونوں ایک ہی مقام ہیں لیکن دونوں کے رخ ایک دوسرے سے متضاد طرف ہیں۔ اور وہ واحد وجود جو دونوں طرف کامل طور پر جلوہ گر بھی ہوتا جا رہا ہے اور اپنے وجود کے اظہار کی تکمیل بھی پا رہا ہے ''انسانِ کامل'' ہے جس کے رخِ ربوبیت و بشریت کی نمود کے لیے ہی ذات حق تعالیٰ نے یہ تمام نزول کے مراتب طے کیے۔ ''اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نہ ہوتے تو میں اپنا رب ہونا ظاہر نہ کرتا۔''

عرش عالمِ اجسام کی تخلیق کا پہلا مرتبہ ہے اس لیے مندرجہ بالا عبارت میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ عرش کو جسمِ انسان سے مشابہ قرار دے رہے ہیں۔ انسان کا حیوانی اور مادی جسم عالمِ ناسوت یعنی اس دنیا میں تخلیق ہوتا ہے اس لیے عرش کے مقام پر جس جسم کی بات کی جارہی ہے وہ گوشت پوست کا بنا یہ فانی جسم نہیں بلکہ اس سے مراد انسان کا حقیقی باطنی وجود یعنی قلب ہے جو اصل انسان ہے۔ یہ انسان کا وہ جسم ہے جسے فنا نہیں۔ جو ازل میں بھی تھا اور ابد میں بھی ہوگا۔ عرش ظہورِ ربوبیت کا اگلا مرتبہ ہے اور یہاں انسان کے باطنی وجود یعنی قلب کا ظاہر ہونا بشریت کی تکمیل کی طرف اگلا قدم ہے۔ ان دونوں کی مشابہت ان دونوں کے درمیان موجود ذات انسانِ کامل کے آئینہ کی وجہ سے ہے جس میں ربوبیت و بشریت کی دونوں صفات ایک ہی وقت میں تکمیل پا رہی ہیں۔

بالکل یہی کلیہ کرسی اور نفسِ انسان پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ نفس انسان کے حقیقی باطنی وجود اور ظاہری جسمانی وجود کے درمیان موجود وہ پردہ ہے جو شفاف و پاک ہو تو باطنی وجود یعنی قلب و روح میں موجود نورِ حقیقی واضح دکھائی دیتا ہے۔ نفس کی حیثیت وجودِ انسان میں حاکم کی ہے۔ امارہ ہو تو بھی حاکم ہے کہ برائی کا حکم دیتا ہے اور انسان اس کی ماننے پر مجبور ہوتا ہے۔ لوامہ اور ملہمہ کے درجات طے کر کے مطمئنہ بن جائے تو بھی حاکم ہے کہ تمام اعضاء اس کے تابع فرمان بن جاتے ہیں۔ انسان کی تمام تر زندگی اس کے نفس کے زیرِ اثر گزرتی ہے۔ خواہ وہ بہترین حالت میں ہو یا بدترین حالت میں۔ نفس ہی وجودِ انسان میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ نفس کی حالت کے مطابق ہی انسان کے قربِ الٰہی کے درجات کے متعلق فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر نفس کو ''کرسی'' سے مشابہ قرار دیا گیا کیونکہ 'کرسی' بھی حاکمیت کا نشان ہے اور نفس میں بھی حاکمیت ہے اور اس بنا پر بھی کہ جس طرح ''کرسی'' تمام کائنات کا احاطہ کیے ہے بالکل اسی طرح وجود انسان کی کائنات کا احاطہ نفس کیے ہوئے ہے۔ کرسی اور نفس کا مقامِ تخلیق ایک ہی ہے۔ کرسی ربوبیت کے اگلے مرتبے کا ظہور ہے اور نفس تکمیلِ بشریت کا اگلا مرحلہ ہے۔ یہ دونوں مرحلے ایک ہی ذات یعنی انسانِ کامل کی ذات میں تکمیل پا رہے ہیں اور اسی کی ذات کے دو رخ ہیں۔ یوں نفس اور کرسی علیحدہ علیحدہ

وجود نہیں بلکہ ایک ہی وجود کے دو رُخ ہیں۔ایک رخِ ربوبیت اور دوسرا رخِ بشریت۔نفس کو وجود انسان کی کائنات میں وہی مقام حاصل ہے جو کرسی کو تمام کائنات میں۔انسانِ کامل کی ذات میں نفس ہی کرسی ہے۔جو شے یا مقام اس کی بشریت کے لحاظ سے نفس کہلاتا ہے وہی اس کی ربوبیت کے رخ سے کرسی کہلاتا ہے اور خود اس کی ذات ان دونوں کی جامع ہے۔

ذاتِ حق تعالیٰ کا کامل و مکمل نزول اور وجودِ انسان کی تکمیل انسانِ کامل کے بشری صورت میں دنیا میں ظاہر ہو جانے پر مکمل ہو جاتی ہے۔یہ وہ عبد ہے جس میں عبد اور ھو کی تمام صفات مکمل جلوہ گر ہو چکی ہیں پس یہ عبدہٗ ہے۔نور، روح، قلب اور نفس ہو یا قلم، لوح، عرش اور کرسی ہو تمام مراتب اور مقامات انسان کے جسمانی بشری وجود میں جمع کر دیئے گئے۔

جب ایک انسان بشری جسم کے ساتھ اس دنیا میں بچہ کی صورت میں وارد ہوتا ہے تو یہ تمام مقامات اس کی ذات میں ہی جمع ہوتے ہیں۔ایک طرف وہ بشر ہوتا ہے دوسری طرف اللہ فرماتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَۃِ الرَّحْمٰنِ ترجمہ: بے شک اللہ نے آدم (انسان) کو رحمٰن (اللہ) کی صورت پر تخلیق کیا"۔ ہر عالم، ہر علم، ہر مرتبے اور ہر مقام کی تفصیل اس ایک وجود میں جمع ہے۔اب انسان کو ہر عالم، ہر مرتبے اور مقام کے متعلق ہر علم اپنی ہی ذات کے اندر سے حاصل ہونا ہے۔اگرچہ اس کے لیے ظاہری اسباب بھی ضروری ہیں لیکن علم انسان کے وجود کے باہر نہیں بلکہ اندر موجود ہے۔وہ علم اللہ تعالیٰ کے متعلق ہو یا اشیاء کے متعلق، تمام حقائقِ کونیہ والٰہیہ اسی کی ذات میں جمع ہیں۔اس لحاظ سے انسان "کتاب جامع" ہے۔وہ جس قدر اپنی ذات میں غور و تفکر کے ذریعے سفر کرے گا اسی قدر "علم" حاصل کرے گا، خالق کے متعلق بھی اور مخلوق کے متعلق بھی۔ہر شے کا علمی وجود اس کی ذات میں پنہاں ہے کیونکہ اسی کی ذات میں قلم اور لوح، نور اور روحِ قدسی کی صورت میں موجود ہیں۔قلم میں ہر شے کا جامع علم موجود ہے اور لوح میں تفصیلی علم موجود ہے۔ البتہ اس علم تک رسائی کے لیے نفس کے پردے کا شفاف اور لطیف ترین ہونا ضروری ہے۔جس قدر نفس شفاف اور لطیف ہوگا اسی قدر علمِ حق علمِ انسان بنتا جائے گا۔اس شفاف لطیف پردے

سے جب نورِ حق اور نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم واضح دکھائی دے گا تب ہی لوح اور قلم میں موجود علم (حقائقِ الٰہیہ اور کونیہ) واضح طور پر پڑھا جا سکے گا۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے فرمایا:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

عام انسانوں میں علمِ حق وخلق موجود تو اپنی اصل صورت میں ہی ہوتا ہے لیکن نفس کے پردے کے شفاف نہ ہونے کے باعث انہیں اشیاء اور حق تعالیٰ کا حقیقی صحیح علم حاصل نہیں ہوتا بلکہ جیسا ان کا نفس انہیں دکھائے گا ویسا ہی علم حاصل ہوگا۔

انسانِ کامل وہ ہے جس کے نفس کا پردہ شفاف اور لطیف ترین ہے اور جس کو تمام علمِ حق اور علمِ خلق مکمل طور پر اور حقیقی صورت میں حاصل ہے پس وہ جامع ترین کتاب ہے۔ اُم الکتاب بھی اور کتاب مبین بھی جس میں تمام علمِ حق وخلق مکمل ظاہر ہے اور اسی بنا پر علمِ الٰہی اور علمِ انسان میں مشابہت ہے کہ جیسا علم ذاتِ حق تعالیٰ میں موجود ہے بعینہٖ ذاتِ انسانِ کامل میں ظاہر ہے۔ ذاتِ حق تعالیٰ اور ذاتِ انسان کامل میں بھی مشابہت ہے۔ جیسے جیسے ذات حق تعالیٰ نے نزول کیا ویسے ویسے ذاتِ انسان کامل نے تکمیل پائی۔ نزولِ حق تعالیٰ ہی وجودِ انسانِ کامل ہے۔ انسان کامل کی ذات میں ہی ظہور اور نزول کے مراتب مکمل ہوئے۔ اس لیے ذاتِ انسانِ کامل ذاتِ حق تعالیٰ کی مشابہ اور اس کا آئینہ ہے۔

☆☆☆☆☆☆

كَمَا قُلْنَا فِيْ حَقِّ الْحَقِّ اِنَّ عِلْمَهٗ بِذَاتِهٖ مُسْتَلْزِمٌ لِّعِلْمِهٖ بِجَمِيْعِ الْاَشْيَآءِ وَاِنَّهٗ يَعْلَمُ جَمِيْعَ الْاَشْيَآءِ مِنْ عِلْمِهٖ بِذَاتِهٖ كَذٰلِكَ نَقُوْلُ فِيْ حَقِّ الْاِنْسَانِ الْكَامِلِ اِنَّ عِلْمَهٗ بِذَاتِهٖ مُسْتَلْزِمٌ لِّعِلْمِهٖ بِجَمِيْعِ

الْاَشْیَآءَ وَاِنَّہٗ یَعْلَمُ جَمِیْعُ الْاَشْیَآءَ مِنْ عِلْمِہٖ بِذَاتِہٖ لِاَنَّہٗ ھُوَ جَمِیْعُ الْاَشْیَآءَ اِجْمَالًا وَ تَفْصِیْلًا فَمَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ وَ عَرَفَ جَمِیْعَ الْاَشْیَآءَ فَفِکْرُکَ یَا وَلَدِیْ فِیْکَ یَکْفِیْکَ فَلَیْسَ شَیْئٌ خَارِجًا مِّنْکَ۔

ترجمہ: جیسا کہ ہم حق تعالیٰ کی نسبت کہہ چکے ہیں کہ اس کا اپنی ذات کو جاننا تمام اشیاء کے علم کو مستلزم ہے اور وہ خود کو جاننے سے تمام اشیاء کو جانتا ہے اسی طرح ہم انسانِ کامل کی نسبت کہتے ہیں کہ اس کا اپنی ہی ذات کو جاننا تمام اشیاء کے علم کو مستلزم ہے اور وہ اپنی ذات کو جاننے سے تمام اشیاء کو جانتا ہے اس لیے کہ اجمال اور تفصیل کی رو سے وہی جمیع اشیاء ہے۔ پس جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا اور تمام اشیاء کو جان لیا۔ پس اے میرے بیٹے تمہارا اپنے آپ میں تفکر ہی تمہارے لیے کافی ہے کہ کوئی شے تجھ سے باہر نہیں۔

شرح: جیسا کہ مرآۃ العارفین کی اب تک کی شرح میں یہ بات تفصیلاً بیان کر دی گئی کہ ذاتِ حق تعالیٰ نے اپنی ذات کے اظہار کے لیے درجہ بدرجہ نزول کیا۔ ذاتِ حق تعالیٰ کے نزول کے ساتھ ساتھ انسان کے بشری وجود کی تکمیل بھی ہوتی گئی اور ذاتِ حق تعالیٰ کا مکمل ظہور اور نزول انسانِ کامل کی ذات میں ظاہر ہو گیا۔ ظہور اور نزول کی یہ ترکیب اور نمونہ ہر انسان کے لیے ایک جیسا ہے۔ ہر انسان کی ابتداء نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے جو قلمِ الٰہی کے مشابہ ہے جس میں تمام مخلوقاتِ عالم کا علمی وجود مجملاً موجود ہے۔ جس سے روحِ قدسی تخلیق ہوئی جو لوح کے مشابہ ہے جس میں مخلوقاتِ عالم کے علمی وجود کی تفصیل موجود ہے۔ پھر روحِ قدسی کو قلب کا لباس پہنایا گیا جو عرش کے مشابہ ہے جہاں مخلوقاتِ عالم کے علمی وجود کو پہلی مرتبہ مخلوق صورت عطا کی گئی۔ پھر انسان کے اس باطنی حقیقی جسم یعنی قلب کو نفس کے پردے میں لپیٹا گیا جو کرسی سے مشابہ ہے۔ پھر نور، روح، قلب اور نفس کو عالمِ ناسوت میں ظاہری جسم میں چھپا کر تخلیقِ انسان مکمل ہوئی۔ اللہ نے تمام انسانوں کو برابر بنایا۔ چنانچہ ہر انسان میں ہر عالم کی مخلوقات کا علم اور ان کا علمی وجود حقائقِ کونیہ کی

صورت میں موجود ہے اور ذاتِ حق تعالیٰ اور اس کا تمام علم حقائقِ الٰہیہ کی صورت میں موجود ہے۔ انسان کی ظاہری و باطنی استعداد بڑھنے اور زمانے کے لحاظ سے انسان کی ضرورت اور کوشش کے مطابق اللہ یہ علم اس پر کھولتا جاتا ہے۔

نظریہ وحدت الوجود کے مطابق ہر شے کا حقیقی وجود چونکہ ذات حق تعالیٰ ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کا کسی بھی شے کے متعلق علم درحقیقت اللہ کی اپنی ہی ذات کا علم ہے۔ علمِ الٰہی تمام مخلوقات کے علم کو احاطہ کیے ہے۔ کسی شے کی ظاہری باطنی حالت' یا اس کے ماضی حال یا مستقبل کے متعلق ہر علم پہلے سے علمِ الٰہی میں موجود ہے اور اللہ تعالیٰ اس علم کو ان اشیاء پر نظر ڈال کر یا ان کے متعلق جان کر حاصل نہیں کرتا بلکہ اللہ کا اپنی ذات کے متعلق جاننا ہی ان اشیاء کو جاننا ہے اور وہ خود کو جاننے سے ان تمام مخلوقاتِ عالم کو جانتا ہے۔ اور اس کا یہ ''جاننا'' ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہے کہ وہ پہلے کسی بات کو نہ جانتا تھا اور پھر اس نے علم کے حصول کے بعد جان لیا جیسا کہ ہم انسان کسی شے کو پہلے نہیں جانتے اور پھر اس کے متعلق علم حاصل ہونے پر جان لیتے ہیں۔ اللہ ہر شے کی ہر حقیقت کو ہمیشہ سے جانتا ہے۔ وہ کسی بھی شے کے علم کو دوسرے اسباب کے ذریعے ہرگز حاصل نہیں کرتا بلکہ وہ خود علم ہے۔ وہ خود کو جان کر ہر شے کو جانتا ہے اور اس کا یہ جاننا، جب سے وہ ہے تب سے ہی کامل اور ایک جیسا ہے۔ نہ اس میں وقت و حالات کچھ اضافہ کر سکتے ہیں نہ کمی۔

چونکہ انسانِ کامل ذات حق تعالیٰ کا عین آئینہ ہے اس لیے علمِ حق و علمِ خلق اس میں بھی بالکل اسی طرح موجود ہے جس طرح حق تعالیٰ میں۔ ہر شے اور عالم کا ہر علم اس کی اپنی ہی ذات میں موجود ہے اور اسے جاننے کے لیے اسے ان اشیاء یا عالموں کی طرف رجوع نہیں کرنا پڑتا بلکہ اس کی اپنی ہی ذات کا علمِ کامل اسے تمام اشیائے عالم کا علم عطا کر دیتا ہے۔ علم اس کی ذات میں قلم ولوح یعنی نور روحِ قدسی میں موجود ہے جس پر نفس کا باریک پردہ ہے۔ عام انسان جب اس دنیا میں وارد ہوتے ہیں تو اگرچہ ابتدا میں ان کا نفس بھی شفاف اور لطیف ہوتا ہے اور تمام علمِ حق و خلق ان میں بھی مکمل و جامع صورت میں موجود ہوتا ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کے نفس کے

پردے کو نفسانی خواہشوں کی گرد اور شیطانی صفات کی سیاہی میلا اور موٹا کرنے لگتی ہے پس تمام علمِ حق وخلق ان سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ البتہ علم کے جس شعبے میں وہ کوشش اور جدوجہد کرتے ہیں، اللہ وہ علم ان پر کھول دیتا ہے۔ جو لوگ انسانی جسم کے متعلق علم کے حصول کے لیے تگ ودو کرتے ہیں اللہ وہ علم ان کے دماغ کے ذریعے ان پر ظاہر کر دیتا ہے، جو لوگ کائنات کے متعلق تحقیق وجستجو کرتے ہیں اللہ اس کا علم انہیں عطا کر دیتا ہے، لیکن جو لوگ علمِ الٰہی کے متعلق جستجو کرتے ہیں اللہ ان پر تمام علوم کھول دیتا ہے کیونکہ اللہ کی ذات تمام علوم کا منبع، مصدر اور جامع ہے۔ لیکن اس کے لیے نفس کی پاکیزگی کی ضرورت ہے۔ البتہ ظاہری دنیا کے علوم کے حصول کے لیے نفس کی پاکیزگی ضروری نہیں۔ وہ صرف دماغ کے استعمال سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

انسانِ کامل کا نفس نہ کبھی میلا ہوتا ہے نہ سیاہ اور موٹا، البتہ ایک باریک خوبصورت حجاب ضرور بنا رہتا ہے۔ اللہ جب اپنے علم کو انسانِ کامل پر کھولنا چاہتا ہے تو اس حجاب کو بیچ سے ہٹانا شروع کرتا ہے یا یہ کہا جائے کہ انسان کامل پر وہ علمِ حق وخلق کھولنا شروع کر دیتا ہے جو اگرچہ اس کی ذات میں ازل سے ہی موجود تھا لیکن حکمِ الٰہی سے اس کی نظروں سے اوجھل تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو چالیس سال کی عمر میں نبوت عطا کرنے کے بعد اس علم کو ان پر کھولنا شروع کر دیا۔ اللہ اور انسانِ کامل کا علم اگرچہ ایک ہی علم ہے کیونکہ علم حقیقی ہے ہی ایک، لیکن اللہ اور انسانِ کامل کے علم میں فرق یہ ہے کہ اللہ از خود ہر علم کا عالم ہے اور اسے کسی سے حاصل نہیں کرتا لیکن انسانِ کامل ہر علم کو بلا واسطہ اللہ تعالیٰ سے حاصل کرتا ہے۔ جیسا کہ اللہ فرماتا ہے کہ

وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا

ترجمہ: اور اسے علم لدنی عطا فرمایا (الکہف۔65)

اور فرمایا

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى

ترجمہ: اور اسے شدید قوت والے نے علم سکھایا۔ (النجم۔5)

جب اللہ تعالیٰ انسانِ کامل پر تمام علم کھول دیتا ہے تو اب کائنات کی ہر شے کا علم اس کی اپنی ذات کے اندر سے اسے حاصل ہو جاتا ہے۔ اور کسی بھی شے کے متعلق جاننے کے لیے اسے اس شے کی طرف رجوع نہیں کرنا پڑتا۔ اب وہ خود کو جاننے سے تمام مخلوقاتِ عالم کو جان لیتا ہے اور خود کو جاننے سے ہی حق تعالیٰ کو جان لیتا ہے کیونکہ تمام حقائقِ الٰہیہ وکونیہ اسی کی ذات میں جمع ہیں۔ جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ''میں تمام کائنات کو اپنی ہتھیلی کی پشت پر دیکھتا ہوں''۔ اور اولیاء کاملین کے سامنے بھی تمام کائنات رائی کے دانے کے برابر حقیقت رکھتی ہے جس کا تماشا وہ اپنی ہتھیلی پر دیکھتے ہیں۔

پس کسی بھی انسان کے لیے علمِ حق وخلق کو جاننے کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے نفس کے پردے کے پیچھے چھپی ہوئی روحِ قدسی اور نورِ محمدی یعنی لوح وقلم پر موجود علم تک رسائی حاصل کرے۔ جس قدر اس کے نفس کا پردہ صاف وشفاف ہوگا اسی قدر علمِ حق وخلق اس پر ظاہر ہوگا۔ حقیقت اور حق تک رسائی نفس تک رسائی کے بغیر ممکن نہیں۔ جب انسان اپنے نفس پر پڑی خواہشاتِ نفسانی وشیطانی کی گرد وسیاہی کو دور کر کے اس کی اصل شفاف ولطیف حالت حاصل کر لیتا ہے تو ہی حقیقت اور حق کو پہچان پاتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ''جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو بھی پہچان لیا اور تمام اشیاء کی حقیقت کو جان لیا۔''

جب نفس آئینے کی مانند شفاف ہو جاتا ہے اور انسان اس کے توسط سے لوحِ قلب پر لکھی حقیقت پر نظر جماتا ہے تو آہستہ آہستہ انسان کی نظر سے نفس کا یہ آئینہ اوجھل ہونے لگتا ہے اور پھر اس کی نظر کے سامنے صرف حقیقت رہ جاتی ہے اور اپنے نفس سے وہ غائب ہو جاتا ہے۔ یعنی نفس موجود ہو کر بھی نہیں رہتا اور یہ حالت صرف انسانِ کامل کے لطیف نفس کی ہے۔ نفس وہ شے ہے جو انسان اور رب کے درمیان حائل ہے لیکن انسانِ کامل کا نفس اپنی لطافت کی بنا پر ہو کر بھی نہیں رہتا۔ چنانچہ انسانِ کامل میں صرف حق رہ جاتا ہے۔

کوئی بھی انسان اپنی حقیقت سے کبھی آشنا نہیں ہو سکتا جب تک وہ نفس کے پردے کے

پیچھے قلب پر لکھی تمام مخلوقاتِ عالم کی تفصیل نہیں جان لیتا۔ چونکہ وہ خود بھی مخلوقاتِ عالم میں سے ہے اس لیے اس کی اپنی ذات کی حقیقت کیا ہے یہ بھی قلب پر ہی لکھا ہے۔ جب تک وہ نفس کو آئینے کی طرح شفاف بنا کر قلب پر لکھی تحریر کو پڑھ نہیں لیتا نہ خود کو جان سکتا ہے' نہ ذاتِ حق تعالیٰ کو' نہ اپنے اردگرد موجود دوسرے انسانوں کی حقیقت کو اور نہ ہی اشیاءِ عالم کی اصل حقیقت کو۔

مولانا رومؒ انسان کے اندر چھپے اس علمِ عالمِ کُل کے متعلق فرماتے ہیں:

بس بصورت عالم صغریٰ توئی
پس بمعنی عالم کبریٰ توئی

ترجمہ: (اے انسان) صورت سے تو ایک چھوٹا سا جہان ہے لیکن حقیقت میں تو اس تمام عالم سے بڑا عالم ہے۔

آدمی را ہست حس تن سقیم
لیک در باطن یکے خلق عظیم

ترجمہ: انسان جسمانی حواس کے نظریہ سے حقیر و ہیچ ہے مگر باطن میں عالمِ عظیم ہے۔

جس وجود میں حقائقِ الٰہیہ و کونیہ دونوں جمع ہوں اس سے بڑا عالم کون سا ہو سکتا ہے۔ اقبالؒ فرماتے ہیں:

بجاں پوشیدہ رمزِ کائنات است
بدن حالے زاحوالِ حیات است

ترجمہ: کائنات کا تمام علم اور راز تیرے اندر پوشیدہ ہے۔ تیرا ظاہری وجود تو ازل سے ابد تک جاری رہنے والی تیری حیات کے بہت سے احوال میں سے ایک (عارضی) حال ہے۔

تمام حقائقِ الٰہیہ اور کونیہ انسان کی باطنی عظیم الشان کائنات یعنی اس کے اندر موجود عرش و لوح و قلم میں محفوظ کرنے کے بعد جب اللہ نے اپنی پہچان کی آزمائش کے لیے انسان کو اس دنیا یعنی عالمِ ناسوت کی طرف بھیجا تو انسان سے اس کی حقیقت کو چھپا لیا تاکہ وہ جدوجہد اور کوشش

کرے خود کو پہچاننے اور اپنی پہچان سے اپنے اللہ کو پہچاننے کی۔ انسان کو اپنی اور اپنے رب کی پہچان سے اتنا ہی حصہ ملے گا جتنا وہ کوشش کرے گا کیونکہ

لَيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم۔39)

''انسان کے لیے اتنا ہی ہے جتنی وہ کوشش کرے گا۔''

انسان کی حقیقت انسان سے پوشیدہ رکھنے کے لیے اور اس لیے بھی کہ اس کا باطنی وجود جو کہ انتہائی لطیف ہے اس عالمِ ناسوت میں محفوظ رہ سکے' اللہ نے عالمِ لاھوت میں تخلیق کی گئی حقیقی انسانی روح یعنی روحِ قدسی کو اسفل السافلین کی طرف اتارتے ہوئے ہر عالم یعنی عالمِ ملکوت' جبروت و ناسوت کے مطابق لباس عطا کیے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے جب روحِ قدسی کو عالمِ لاھوت میں عمدہ اور حسین صورت میں تخلیق فرمایا تو ساتھ ہی انسان کا ارادہ بھی کرلیا کہ اسے اسفل السافلین کی طرف پھیرا جائے گا تاکہ غلبہ انسیت ومحبت کے باعث اسے صدق کے اس مرتبہ عظیم تک پہنچایا جاسکے جو اللہ تعالیٰ کے قرب کا ماحصل ہو۔ یہ مقامِ خاص انبیاء اور اولیاء کرام کا ہے۔ ہر روحِ قدسی کو پہلے تخمِ توحیدی کے ساتھ عالمِ جبروت میں پہنچایا جاتا ہے۔ پھر عالمِ ملکوت سے ناسوت (عالمِ خلق) کے لیے محفوظ رکھا جاتا ہے اور اسے اس ملک کا جامہ (لباس) پہنایا جاتا ہے اور پھر اسے عالمِ ناسوت کی طرف بھیجا جاتا ہے اور اس کے لیے جامہ عنصری تیار کیا جاتا ہے (یعنی ہوا پانی مٹی اور آگ' اربعہ عناصر سے بنا جسم)۔ اس لیے کہ روح عالمِ ناسوت' ملک یا عالمِ خلق میں جلنے نہ پائے' تو

- اصل روح' روحِ قدسی ہے۔
- بلحاظ لباسِ جبروتی اس کا نام روحِ سلطانی ہے۔
- بلحاظ لباسِ ملکوتی اس کا نام روحِ سیرانی یا روانی ہے۔
- بلحاظِ ملکی یا بشری اس کا نام روحِ جسمانی یا حیوانی ہے۔

انسانی کامیابی یہ ہے کہ وہ منازل ومقامات کو طے کرتا ہوا عالمِ لاھوت میں پہنچ جائے

(یعنی اپنی اصل روحِ قدسی تک پہنچ جائے)۔'' (سرّ الاسرار)

حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ روحِ قدسی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''روح (قدسی) ایک جوہرِ مجرد ہے جو بذاتِ خود قائم ہے۔ نہ مکان میں متمکن (رہتی) ہے اور نہ جہت اور زمان سے مقید ہے اور نہ بدن اور عالم سے متصل (جڑی ہوئی) ہے اور نہ اس سے خارج ہے بلکہ روح (قدسی) ایک ذات ہے جو اوصافِ ربوبیت سے موصوف ہے اور مقامِ الوہیت میں تمام اشیاء سے اقرب ہے۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو نااہلوں سے روح کی حقیقت بیان کرنے کا حکم نہیں کیا۔'' (کیمیائے سعادت)

روحِ قدسی کی طرح انسان کے قلب کو بھی نفس، خناس[1] و خرطوم[2] کے پردوں میں چھپا دیا گیا ہے، حضرت سخی سلطان باھو رحمتہ اللہ علیہ قلب کی صورت کے متعلق فرماتے ہیں: ''یہ فقیر باھُوؒ کہتا ہے کہ دل کی صورت نیلوفر کے پھول جیسی ہے۔ اس کے پہلو میں چار خانے ہیں۔ ہر خانے میں زمین و آسمان کے چودہ طبقات سے وسیع تر ولایت ہے۔ ہر ایک خانہ نشیبِ دل میں ہے۔ جس میں سرّ لامکان پایا جاتا ہے۔ ہر خانے میں خزانہ الٰہی بھرا ہوا ہے۔ ہر خانے پر ایک پردہ ہے اور ہر پردے پر ایک شیطان مؤکل ہے۔ پہلا پردہ غفلت کا ہے جس کی بنا پر انسان موت کو بھلائے رکھتا ہے۔ دوسرا پردہ حرص کا ہے، تیسرا پردہ حسد کا ہے اور چوتھا پردہ کبر کا ہے۔ ان سب سے متفق ہیں خناس، خرطوم، خطرات اور وسوسہ۔ قلب کے ہر خانے میں خزانہ الٰہی ہے۔ پہلا خزانہ علم ہے، دوسرا خزانہ ذکر اللہ ہے، تیسرا خزانہ معرفت الٰہی ہے اور چوتھا خزانہ فقر فنا فی اللہ بقا باللہ ہے۔ (عین الفقر)

قلب کی یہ صورت ہر انسان میں ایک سی ہے۔ اللہ سے محبت رکھنے والے غفلت، حسد، کبر، حرص کے پردے ہٹا کر ان خزائنِ الٰہی کو حاصل کر لیتے اور عام لوگ ان پردوں میں ہی الجھے، ان کی دوسری طرف موجود خزانوں سے بے خبر تمام عمر گزار دیتے ہیں۔ سلطان العارفین حضرت سخی

---

[1] شیطان خواہ وہ انسانی صورت میں ہو یا جن کی صورت میں۔ [2] خواہشاتِ دنیا کی ایسی لت یا نشہ جن میں پڑ کر انسان اللہ سے غافل ہو جاتا ہے۔

سلطان باھو رحمتہ اللہ علیہ قلب کی مختلف حالتوں کے متعلق بیان فرماتے ہیں:

❁ قلب تین قسم کا ہے۔ایک قلب اللہ والوں کا ہے جو ہر وقت ذکرِ اللہ کے نور سے جگمگا تا رہتا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کے عشق و محبت و شوق کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔اس میں سوائے طلبِ الٰہی کے کوئی طلب نہیں ہوتی۔ دوسرا قلب[1] کافروں کا ہے جس میں حُبِ دنیا کی ظلمت بھری رہتی ہے۔ایسے دل والے بظاہر مومن لیکن بباطن کافر، ریا کار اور اہلِ دنیا امراء کے تابعدار ہوتے ہیں۔ تیسرا قلب اہلِ دنیا کا سلب شدہ دل ہے۔اس دل کے مالک معرفتِ الٰہی سے محروم و خوار، باطن سے بے خبر گدھے کی طرح بار بردار جانور ہیں۔'' (عین الفقر)

جب ایک انسان مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ ''جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا'' کے روحانی سفر پر گامزن ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس کے نفس کے پردے کا تزکیہ ہوتا ہے۔نفس گناہوں اور خواہشات کی گرد پڑ پڑ کر نفس امارہ کے مقام تک پہنچ چکا ہوتا ہے جو قلب میں موجود نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چھپ جانے اور اس نور سے دوری کے باعث ہمیشہ انسان کو برائی اور گناہ کی طرف ہی مائل کرتا ہے۔اس دنیا میں انبیاء اور اللہ کے خاص چنے ہوئے برگزیدہ اولیاء وصدیقین کے سوا عموماً ہر انسان کا نفس 'نفسِ امارہ' کے کسی نہ کسی انتہائی یا ابتدائی مقام پر ہوتا ہے۔نفس کے تزکیہ کے لیے انسان کو کسی ولی کامل مرشد کامل کی لازماً ضرورت ہے جو روحانی طبیب بن کر نفس کو ''امارہ'' کے انتہائی پست مقام سے نکالتا ہے۔ ولیٔ کامل کی نگاہ کے ساتھ ساتھ انسان پر خود بھی لازم ہے کہ اگر وہ اپنے اللہ کا قرب اور پہچان چاہتا ہے تو گناہوں اور نفسانی خواہشات سے اجتناب کرے۔ ولیٔ کامل کا فیض اور انسان کی اپنی سعی و کوشش نفس کو امارہ سے لوامہ کے مقام پر لے آتی ہے جو انسان کو گناہ کے ارتکاب پر ملامت کرتا ہے اور یوں وہ گناہوں سے اجتناب کی طرف پہلا قدم اٹھاتا ہے۔ پھر نفس کا مزید تزکیہ ہوتا ہے۔ نفس کا پردہ

---

[1] یہاں قلب سے مراد انسان کا باطنی وجود ہے یعنی نفس و روحِ حیوانی نہ کہ قلبِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

مزید شفاف ہوتا ہے اور نفس 'نفسِ ملہمہ' کے مقام پر پہنچتا ہے جو انسان کو گناہ سے پہلے ہی الہاماً روک دیتا ہے۔ اور پھر شفافیت کی انتہا پر پہنچ کر نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس میں ظاہر ہو جاتا ہے اور نفس 'نفسِ مطمئنہ' کے مقام پر پہنچ جاتا ہے جو انسان کو گناہ کی طرف مائل ہی نہیں ہونے دیتا۔ جیسے جیسے انسان کا نفس ترقی کرتا اور اس کا تزکیہ ہوتا ہے ویسے ویسے ساتھ ہی اس کے قلب کا تصفیہ بھی ہوتا جاتا ہے اور اس پر پڑے خناس، خرطوم، کبر، حسد وغیرہ کے پردے ہٹتے جاتے ہیں۔ قلب کا تصفیہ تجلیہ روح کا راستہ کھولتا ہے اور روح بھی ساتھ ساتھ ترقی کرتے ہوئے روحِ حیوانی سے روحِ نورانی پھر روحِ سلطانی سے روحِ قدسی کے مقام پر جا پہنچتی ہے جہاں اس کے رب اور اس کے درمیان کوئی حجاب نہیں رہتا اور یوں انسان اپنی ہی ذات میں موجود علمِ حق و خلق کے تمام اسرار تک رسائی بھی حاصل کرتا ہے اور اپنی ابتدا یعنی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جو روحِ قدسی کی صورت میں ظاہر ہوا تھا، کی طرف بھی لوٹ جاتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا کہ ''انتہا ابتدا کی طرف لوٹ جانا ہے۔'' روح اپنے عروج کی انتہا پر اپنی ابتدا کی طرف یعنی ذاتِ حق تعالیٰ کی طرف لوٹ جاتی ہے۔

تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح ساتھ ساتھ بالکل متوازی چلنے والے عمل ہیں جن میں سے ہر ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتا ہے۔ جیسے ہی نفس مطمئنہ کے مقام پر پہنچتا ہے، روح روحِ قدسی کے مقام پر پہنچتی ہے اور قلب میں ذاتِ حق تعالیٰ ظاہر ہو جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انسان کا حقیقی علم اور عقل بھی ترقی کرتی ہے۔ جب وہ عالمِ ناسوت کی قید کو توڑ کر عالمِ ملکوت اور جبروت سے گزر کر عالمِ لاھُوت تک پہنچتا ہے اس کی عقل اور علم بھی اپنے اسی ابتدائی مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں عقل و علم ''کُل'' کی صورت میں تھا جس میں تمام حقائقِ الٰہیہ اور کونیہ مجملاً موجود تھے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے روح کے اس سفر کو سرّ الاسرار میں تفصیلاً بیان فرمایا ہے جس کو ایک نقشہ کے ذریعے واضح کیا جاتا ہے:

	عالم	متعلقہ علم	روح	تجلی	عقل
1	عالمِ ناسوت (ملک)	علمِ شریعت	روحِ جسمانی	تجلیٔ آثار	عقلِ معاش
2	عالمِ ملکوت	علمِ طریقت	روحِ نورانی	تجلیٔ افعال	عقلِ معاد
3	عالمِ جبروت	علمِ معرفت	روحِ سلطانی	تجلیٔ صفات	عقلِ روحانی
4	عالمِ لاہوت (یا حقیقت)	علمِ حقیقت	روحِ قدسی	تجلیٔ ذات	عقلِ کل

ان تمام عالموں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی روح، عقل، علم اور نفس کا تعلق بھی اسی عالم سے ہے مثلاً عالمِ ناسوت میں پھنسے ہوئے لوگوں کی روح حیوانی، علم صرف شریعت تک محدود، نفس امارہ کے درجے پر اور عقل فکرِ معاش میں پھنسی ہوئی۔ ترقی ہونے پر عالمِ ملکوت میں وہ روحِ نورانی حاصل کرتے ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علمِ طریقت سے حصہ حاصل کرتے اور نفس لوامہ اور عقلِ معاد[1] پاتے ہیں۔ اور اسی طرح باقی عالموں کے لیے ہے۔

پس ہر انسان جب تک خود کے متعلق نہ جانے گا کہ وہ کس مقام پر ہے وہ کسی بھی شے کے متعلق یا ذاتِ حق تعالیٰ کے بارے میں نہ جان پائے گا۔ عالمِ ناسوت میں تو ہر شے پر ایک ظاہری پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ یہاں قید رہ کر انسان نہ اپنے بارے میں حقیقت جان سکتا ہے نہ دوسری اشیاء اور مخلوق یا حق کے بارے میں۔ صرف عالمِ لاہوت میں موجود روحِ قدسی ہی ہے جو انسان اور حق تعالیٰ کی اصل حقیقت سے واقف ہے۔

☆☆☆☆☆☆

---

[1] عقبیٰ۔ آخرت۔ ایسی عقل جو عقبیٰ کے متعلق غور و تفکر کرے اور پھر عمل کے فیصلے کرے۔
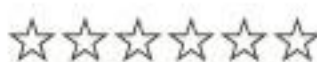
كَمَا قَالَ اَبِیْ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلِیُّ ابْنِ اَبِیْ طَالِب كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ

۱) دَآءُكَ فِیْكَ وَمَا تَشْعَرُ
دَوَآءُكَ مِنْكَ وَمَا تُبْصِرُ

۲) وَتَزْعَمُ اَنَّكَ جِرْمٌ صَغِیْرٌ
وَفِیْكَ انْطَوَی الْعَالَمُ الْاَكْبَرُ

۳) وَاَنْتَ الْكِتَابُ الْمُبِیْنُ الَّذِیْ
بِاَحْرُفِهٖ یَظْهَرُ الْمُضْمَرُ

۴) فَلَا حَاجَةَ لَكَ مِنْ خَارِجٍ
وَفِكْرُكَ فِیْكَ وَمَا تَفَكَّرُ

ترجمہ: جیسا کہ میرے والد امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے فرمایا:

۱) درد تیرا تیرے بیچ ہے اور تو نہیں جانتا۔ دوا بھی تیری تجھ سے ہے اور تو نہیں دیکھتا۔

۲) اور تو گمان کرتا ہے کہ تو چھوٹا سا جسم ہے حالانکہ تیرے بیچ ایک جہانِ عظیم سمٹا ہے۔

۳) اور تو وہ کتابِ روشن ہے کہ جس کے حرفوں سے ظاہر ہوتی ہے ہر پوشیدہ چیز۔

۴) پس تجھے باہر تلاش کرنے کی کوئی حاجت نہیں اور تیرا فکر تیرے اندر ہے حالانکہ تو فکر نہیں کرتا۔

شرح: پس جب کائنات کی ہر شے اور اس کا علم انسان کی ذات کے اندر ہی موجود ہے تو اس کے حصول کے لیے بھی اسے اپنے ہی اندر جستجو کرنا ہوگی۔ حضرت سخی سلطان باھو رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

زمین و آسمان و عرش و کرسی
ہمہ در تست تو از کے بہ پرسی

ترجمہ: ''زمین وآسمان وکرسی سب کچھ تو تیرے اندر ہے، تو دوسروں سے کیا پوچھتا ہے۔''

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اپنے فرزند حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کو اپنے والد حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے اشعار کے ذریعے ہر شے کی حقیقت، علمِ حق وخلق وکائنات اور اپنی ذات کی حقیقت پہچاننے کے لیے اپنی ہی ذات میں تفکر کرنے کی نصیحت کرتے ہیں کہ اللہ اور اس کی مخلوق اور اپنے متعلق ہر علم تجھے اپنی ہی ذات کے اندر سے ملے گا کیونکہ تجھ سے باہر کچھ ہے ہی نہیں۔ تیرے اندر ہی وہ سیاہی ہے جس سے کائنات کی کتاب کے تمام حروف لکھے گئے بلکہ حروف کی یہ کتاب بھی تیری ہی ذات کے اندر موجود ہے، اسے پڑھ اور ہر علم حاصل کرلے۔ اپنے جسم کو دیکھ کر یہ گمان نہ کر کہ تو بس یہی ہے بلکہ اس جسم میں پوشیدہ حقیقت تک رسائی حاصل کر اور تمام خزائنِ الٰہی پالے۔

باشعور انسان ہمیشہ اپنی حقیقت، اپنی ابتداء اپنی انتہا، اپنے خالق ومالک کی حقیقت اور اس کائنات میں رچائے گئے کھیل کی حقیقت، اس کی اشیاء کی اصل صورت، اپنی تقدیر کی حقیقت سب کچھ جاننے کی خواہش وجستجو کرتا ہے۔ اللہ کے جن بندوں نے اپنی ہی ذات میں تفکر کر کے ان تمام حقائق کو جان لیا وہ حقیقت کے تمام طالبوں کو اپنی ہی ذات میں غور کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اپنی ہی ذات میں غور کرنے کی پہلی تلقین خود اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں کی۔

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ

ترجمہ: اور میں تمہارے اندر ہوں کیا تم غور نہیں کرتے۔ (الذّٰریٰت۔ 21)

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ

ترجمہ: کیا وہ اپنے اندر فکر نہیں کرتے۔ (الروم۔ 8)

انہی آیات کی بنیاد پر تمام اولیاء کرام بھی ہمیں اپنی ذات میں تفکر کر کے ذاتِ حق تعالیٰ کو پہچاننے کی تلقین کرتے ہیں۔

خواجہ حافظ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

یار باماست روز و شب حافظ
ہمچوں جانے کہ ہست در رگ وپے

ترجمہ: اے حافظ! یار دن رات ہمارے ساتھ ہے جیسے زندگی ہماری رگ وپے میں ہے۔

❁ حضرت بوعلی شاہ قلندر رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

یار در تو پس چرائی بے خبر

ترجمہ: یار تیرے اندر ہے تو کیوں بے خبر ہے۔

❁ حضرت معین الدین چشتی اجمیری رحمتہ اللہ علیہ بھی جستجوئے باطنی کی اہمیت نمایاں کرتے ہوئے انسان کو مخاطب کرتے ہیں:

آبِ حیات است اندر ظلمتِ ہستی تو
ماہی شو خویش را در آبِ حیات فگن

ترجمہ: ''تیری ہستی کی تاریکی میں آبِ حیات موجود ہے۔ تو مچھلی بن جا اور خود کو اس آبِ حیات میں ڈال دے۔

ایک اور جگہ آپ نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں

بامعین گُفت ہر سُو تابہ کے خواہی دَوید
ہم زَخود جو' ہر چہ خواہی تابدانی کیستی

ترجمہ: ''اس نے معین الدین سے کہا کہ تو کب تک ہر طرف دوڑتا پھرے گا تجھے جو بھی چاہیے اسے اپنے اندر تلاش کر تا کہ تجھے پتہ چلے کہ تو کون ہے''

❁ حضرت بلھے شاہؒ کے مطابق جس نے رازِ حق پایا ہے' راہِ باطن تلاش کر کے ہی پایا ہے اور جس نے یہ راز پالیا وہ آخر سکونِ حقیقی کا حقدار بن گیا اور خوشی وغم' گناہ وثواب' حیات وموت اور ہر طرح کے امتیاز سے آزاد ہو گیا۔

جس پایا بھید قلندر دا
راہ کھوجیا اپنے اندر دا
اوہ واسی ہے سُکھ مندر دا
جتھے چڑھدی اے نہ لہندی اے
ایہہ تلکن بازی ویہڑا اے
تھم تھم کے ٹُرو اندھیرا اے
وڑ اندر ویکھو کیہڑا اے
کیوں خلقت باہر ڈھونڈیندی اے
منہ آئی بات نہ رہندی اے

❁ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ کی شرح میں فرماتے ہیں:

''اے انسان! تجھ سے قریب ترین اگر کوئی چیز ہے تو تیری اپنی ہی ذات ہے اس لیے اگر تو اپنے آپ کو نہیں پہچانتا تو کسی دوسرے کو کیوں کر پہچان سکے گا؟ فقط یہ جان لینا کہ ''یہ میرے ہاتھ ہیں، یہ میرے پاؤں ہیں، یہ میری ہڈیاں ہیں اور یہ میرا جسم ہے'' اپنی ذات کی شناخت تو نہیں ہے' اتنی شناخت تو اپنے لیے دیگر جانور بھی رکھتے ہیں۔ یا فقط یہ جان لینا کہ بھوک لگے تو کچھ کھا لینا چاہیے، غصہ آجائے تو جھگڑا کر لینا چاہیے، شہوت کا غلبہ ہو جائے تو جماع کر لینا چاہیے، یہ تمام باتیں تو جانوروں میں بھی تیرے برابر ہیں پھر تو ان سے اشرف و افضل کیوں کر ہوا؟ تیری اپنی ذات کی معرفت و پہچان کا تقاضا یہ ہے کہ تو جانے کہ تو خود کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا؟ اور جو تو آیا ہے تو کس کام کے لئے آیا ہے؟ تجھے پیدا کیا گیا ہے تو کس غرض کے لئے پیدا کیا گیا؟ تیری نیک بختی و سعادت کیا ہے؟ اور کس چیز میں ہے؟ تیری بدبختی و شقاوت کیا ہے اور کس چیز میں ہے؟ اور یہ صفات جو تیرے اندر جمع کر دی گئی ہیں اور ان میں سے بعض صفات حیوانی ہیں، بعض وحشی درندوں کی۔ بعض شیطانی بعض جناتی اور بعض ملکوتی ہیں' تو ذرا غور تو کر کہ تو ان میں سے کون

سی صفات کا حامل ہے؟ تو ان میں سے کون ہے؟ تیری حقیقت ان میں سے کس کے قریب تر ہے؟ اور وہ کون کون سی صفات ہیں جن کی حیثیت تیرے باطن میں غریب واجنبی اور عارضی ہے؟ جب تک تو ان حقائق کو نہیں پہچانے گا اپنی ذات کی شناخت سے محروم رہے گا۔اور اپنی نیک بختی وسعادت کا طلب گار نہیں بنے گا کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی غذا علیحدہ علیحدہ ہے اور سعادت بھی الگ الگ ہے۔ چوپایوں کی غذا اور سعادت یہ ہے کہ کھائیں' پئیں' سوئیں اور مجامعت میں مشغول رہیں۔ اگر تو بھی یہی کچھ ہے تو دن رات اسی کوشش میں لگا رہ کہ تیرا پیٹ بھرتا رہے اور تیری شہوت کی تسکین ہوتی رہے۔ درندوں کی غذا اور سعادت لڑنے بھڑنے، مرنے مارنے اور غیظ وغضب میں ہے' شیطانوں کی غذا اور سعادت شر انگیزی اور مکر وحیلہ سازی میں ہے۔ اگر تو ان میں سے ہے تو ان ہی جیسے مشاغل اختیار کر لے تاکہ تو اپنی مطلوبہ راحت و نیک بختی حاصل کر لے۔ فرشتوں کی غذا اور سعادت ذکر وتسبیح وطواف میں ہے۔ جب کہ انسان کی غذا اور سعادت قربِ الٰہی میں اللہ تعالیٰ کے انوارِ جمال کا مشاہدہ ہے۔ اگر تو انسان ہے تو کوشش کر کہ تو ذاتِ باری تعالیٰ کو پہچان سکے اور اس کے انوار و جمال کا مشاہدہ کر سکے اور اپنے آپ کو غصہ اور شہوت کے ہاتھ سے رہائی دلا سکے۔ اور تو طلب کرے تو اس ذاتِ یکتا کو کرے تاکہ تجھے معلوم ہو جائے کہ تیرے اندر ان حیوانی و بہیمی صفات کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ اور تجھ پر یہ حقیقت بھی منکشف ہو جائے کہ پیدا کرنے والے نے ان صفات کو تیرے اندر جو پیدا کیا ہے تو کیا اس لیے کہ وہ تجھے اپنا اسیر بنا لیں اور تجھ پر غلبہ حاصل کر کے خود فاتح بن جائیں؟ یا اس لیے کہ تو ان کو اپنا اسیر و مسخر بنا لے اور خود ان پر غالب آ جائے اور اپنے ان اسیروں اور مفتوحین میں سے کسی کو اپنے سفر کا گھوڑا بنا لے اور کسی کو اپنا اسلحہ بنا لے تاکہ یہ چند دن جو تجھے اس منزل گاہِ فانی میں گزارنا ہیں ان میں سے اپنے ان غلاموں سے کام لے کر اپنی سعادت کا بیج حاصل کر سکے اور جب سعادت کا بیج تیرے ہاتھ آ جائے تو تو ان کو اپنے پاؤں تلے روندتا ہوا اپنی اس قرار گاہِ سعادت میں داخل ہو سکے جسے خواص کی زبان میں ''حضورِ حق'' کہا جاتا ہے۔ یہ تمام باتیں تیرے جاننے کی ہیں۔ جس نے ان کو نہ جانا

وہ راہِ دین سے دور رہا اور لامحالہ دین کی حقیقت سے حجاب میں رہا''۔ (کیمیائے سعادت)

❁ شیخِ اکبر محی الدین ابنِ عربی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اے طالب تو پہچان اپنی ذات کو کہ کون ہے تو اور کیا ہے حقیقت تیری اور کیا ہے تیری نسبت حق تعالیٰ کی طرف اور کس وجہ سے تو حق ہے اور کس وجہ سے تو عالم (جہان) ہے''۔ (شرح فصوص الحکم والایقان)

☆☆☆☆☆☆

اَمَّا تَسمَعُ کَیفَ یَقُولُ الْحَقُّ عَزَّوَجَلَّ "اِقْرَاْ کِتٰبَکَ ط کَفٰی بِنَفْسِکَ الْیَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیْباً ط" فَمَنْ قَرَأَ ھٰذَا الْکِتَابَ فَقَدْ عَلِمَ مَا کَانَ وَمَا ھُوَ کَائِنٌ وَمَا ھُوَ یَکُوْنُ فَاِنْ لَّمْ تَقْرَءْ بِتَمَامِہٖ فَاقْرَءْ مَاتَیَسَّرَ مِنْہُ اَلَا تَرٰی کَیفَ یَقُوْلُ الْحَقُّ سُبْحَانَہٗ "سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ" وَ کَیفَ یَقُوْلُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی "وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ"۔

ترجمہ: کیا تو نہیں سنتا کہ کس طرح کہتا ہے اللہ غالب اور بزرگ: ترجمہ ''پڑھ تُو کتاب اپنی۔ کافی ہے تیرا نفس آج تیرے اوپر تیرا حساب کرنے والا'' پس جس نے پڑھا اس کتاب کو اس نے معلوم کیا اس چیز کو جو ہو چکی ہے اور جو ہونے والی ہے اور وہ جو ہوگی۔ پس اگر نہ پڑھ سکے اکٹھے ہی تو پڑھ جس قدر آسان ہو اس میں سے۔ کیا نہیں دیکھتا تُو کہ کس طرح کہتا ہے اللہ جو پاک ہے: ترجمہ ''جلدی دکھائیں گے ہم اُن کو اپنی نشانیاں اس جہان میں اور ان کے نفسوں میں تا کہ ظاہر ہو جائے ان پر کہ وہ حق ہے'' اور کس طرح کہتا ہے وہ جو پاک اور بلند ہے: ترجمہ ''اور میں تمہارے نفسوں میں ہوں کیا تم نہیں دیکھتے۔''

شرح: بقول شاعر

نظری بسوئے خود کن کہ جان دلربائی

مفگن بخاک خود راکہ تو از بلند جائی

تو زچشمِ خود نہانی تو کمالِ خود چہ دانی

خود از صدف بروں آ کہ تو بس گراں بہائی

ترجمہ: خود کو غور سے دیکھ تُو ہی جانِ دلربا ہے۔ خود کو خاک میں نہ ڈال تُو بہت بلند مرتبہ ہے۔ تُو اپنے سے پوشیدہ ہے پھر تجھے اپنا کمال کیسے معلوم ہو۔ تُو صدف سے باہر نکل کر دیکھ کہ تُو بیش بہا قیمتی ہے۔

انسان کی حقیقی ذات ایک قیمتی موتی کی طرح اس کے نفس کی صدف میں پوشیدہ ہے اور وہ حقیقی ذات وہ روحِ قدسی ہے جسے ازل میں حق تعالیٰ نے خود سے جدا کیا اور پھر نزول کے مراتب طے کرتے ہوئے ذاتِ انسان میں چھپایا۔ ذات سے مراد نفس ہی ہے۔ نفس کی حقیقت حاصل کرنا ذات کی حقیقت حاصل کرنا ہے۔ نفس کی پہچان نفس کی زندگی کا باعث ہے کیونکہ جس نے اپنے نفس کی حالت کو نہ پہچانا اس نے اس کی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش نہ کی، جس نے نفس کی حقیقت کو نہ سمجھا اس نے اسے قابو میں لا کر سدھارنے اور نفسِ امارہ سے نفسِ مطمئنہ بنانے کی کوشش نہ کی۔ نتیجہ یہ کہ یہ نفس انسان کے اندر کبھی اپنی اصل پاکیزہ حالت کو نہ پا سکا یعنی مردہ ہو گیا۔ علامہ ابنِ عربیؒ فرماتے ہیں ''نفوس یعنی ارواح جہالت کے سبب مردہ ہوتی ہیں اور علم سے زندہ ہو جاتی ہیں'' (فصوص الحکم والایقان)۔ نفس کا علم نفس کی حیات اور پاکیزگی کا باعث ہے۔ نفس کا علم ذریعہ ہے نفس کی پاکیزگی اور لطافت کے حصول کا جس کا لازمی نتیجہ ہے اس تمام علمِ الٰہی کا حصول جو انسانی قلب میں پوشیدہ ہے۔ پس جن پاکیزہ ہستیوں نے اپنے نفس کا علم اور اس کی پاکیزگی حاصل کر لی انہوں نے تمام علمِ حق اور خلق حاصل کر لیا۔ منقول ہے کہ ایک بار حضرت غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے اپنے وعظ کے دوران فرمایا: ترجمہ: ''تمہارے دل میرے نزدیک شیشہ کی طرح ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں جو کچھ تمہارے پیٹ میں ہے اور پشت میں ہے۔ اگر لگام

شریعت نہ ہوتی تو میں تم کو بتا دیتا جو کچھ تم کھا کر آئے ہو اور جو کچھ تم اپنے گھروں میں ذخیرہ رکھتے ہو۔ مجھ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔'' اسی اثنا میں بارش شروع ہو گئی۔ ایک شخص نے از روئے امتحان سوال کیا کہ جب حق سبحانہٗ نے بلا ریب آپؓ کو غیب پر واقف کیا ہے تو آپ ہمارے اطمینان اور تسلی کے لیے اس بارش کے قطروں کی تعداد بیان فرما دیں۔ اس پر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا ''اس بارش کے قطرات کی تعداد پوچھتے ہو یا اُن قطرات کی جو ابتداء پیدائش سے قیامت تک ہوں گے''۔ اس شخص نے کہا کہ یہ بہتر رہے گا (آپ ابتداء زمانہ سے قیامت تک ہونے والی بارش کے قطرات کی تعداد بتا دیں)۔ حضور غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے فرمایا ''آگے آؤ''۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھا، فوراً اس شخص کو اللہ کی مہربانی سے اپنے قلب مبارک کے ذریعے تمام قطراتِ باراں سے واقف کرا دیا۔ اس کا حال متغیر ہو گیا تب آپؓ نے فرمایا کہ ''گو تیرا سوال از راہِ صدق اور عقیدت نہ تھا مگر جب ہم نے تیرا ہاتھ پکڑا ہے (تجھے اپنی شاگردی میں لیا ہے) تو ہم نہیں چاہتے کہ تُو نیچے گرے۔'' آپؓ نے اس پر خاص توجہ فرما کر اسے تمام شبہات سے فارغ کر دیا۔

پس ایسے پاکیزہ نفوس کتابِ حق کی حقیقی صورت ہیں۔ جو علم قرآن کریم میں الفاظ کی صورت میں درج ہے وہ ان کے قلوب میں اپنی اصل صورت میں جلوہ گر ہے۔ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو کسی جگہ کا والی بنا کر بھیجا تو ان سے پوچھا کہ وہ مسائل کے حل کے لیے کیا تدبیر اختیار کریں گے تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ قرآن سے مدد لیں گے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوچھا کہ اگر قرآن سے مدد نہ ملی تو کیا کریں گے۔ حضرت معاذؓ نے جواب دیا کہ سنت سے مدد لیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ اگر سنت سے بھی مدد نہ ملی تو کیا کریں گے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ''پھر میں اجتہاد کروں گا'' یعنی خود کوشش کروں گا اور غور و تفکر کر کے اپنی ہی ذات کے اندر سے مسئلے کا وہ حل نکالوں گا جو قرآن و سنت میں بھی بیان نہیں کیا گیا۔ یہ متفقہ علیہ حدیث اس بات کا ثبوت ہے کہ علم کی وہ صورت جو قرآن و حدیث میں ظاہری

الفاظ کی صورت میں بیان نہیں کی گئی وہ پاکیزہ نفس رکھنے والے انسان کے سینے کی کتاب میں موجود ہے، جس سے وہ جب چاہے رہنمائی لے سکتا ہے۔ انسان کے سینے میں موجود حقیقی علمِ قرآن کی کتاب کے متعلق ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ط اِنَّ ذٰلِکَ فِیْ کِتٰبٍ ط اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ (الحج۔70)

ترجمہ: ''بے شک اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ بے شک یہ سب ''ایک کتاب'' میں ہے۔ بے شک یہ اللہ پر آسان ہے۔''

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ط اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ (الحدید۔22)

ترجمہ: ''نہیں پہنچتی کوئی مصیبت زمین پر اور نہ تمہاری جانوں میں، مگر وہ ایک کتاب میں، اس سے قبل کہ ہم اسے پیدا کریں (موجود) ہوتی ہے۔ بے شک یہ اللہ پر آسان ہے۔'' بے شک یہ کتاب قلبِ انسانِ کامل ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وَ کُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰہُ فِیْٓ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ (یٰسین۔12) ترجمہ: ''اور ہر امر کو جمع کر رکھا ہے ہم نے امامِ مبین میں''۔

اقبال رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

پس اللہ تعالیٰ انسان کو اسی حقیقی قرآن کو پڑھنے کا حکم دیتا ہے کہ اِقْرَاْ کِتٰبَکَ ترجمہ: ''پڑھ اپنی کتاب کو۔'' یعنی جو علم تیری ذات میں نفس کے پردے میں پوشیدہ ہے اس تک رسائی حاصل کر۔ امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''میں نے حق سبحانہ تعالیٰ کو سو مرتبہ خواب میں دیکھا۔ میں نے عرض کی کہ ''کون سی عبادت تیرے نزدیک افضل ہے''۔ فرمایا ''تلاوتِ قرآن''۔ پس جس نے اس کتابِ حقیقت کو پڑھا اس نے جان لیا جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ ہوگا۔ اس کے نزدیک ماضی، حال اور مستقبل یکساں ہے کیونکہ ازل سے ابد کا تمام

دائرہ اس کی نظروں پر عیاں ہے۔ وہ اپنے باطن پر ایک نگاہ ڈالتے ہی ازل سے ابد تک کا تمام علم دہرا لیتے ہیں جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے متعلق فرمان ہے کہ وہ گھوڑے کی ایک رکاب سے دوسری رکاب میں پاؤں رکھنے تک قرآن ختم کر لیتے تھے۔ وہ فرقانِ جامع اپنی تلاوت آپ ہی کرتے تھے، پس ان کے چہرہ کا دیدار بھی عبادت میں شمار ہوتا تھا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ اپنے فرزند امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کو بھی اور ان کے توسط سے تمام اُمت کو بھی تلقین کرتے ہیں کہ اپنی ذات کی کتاب کو پڑھو یعنی اپنے اندر غور و فکر کرو۔ اگر اس کتاب کو ایک دم پورا نہ پڑھ سکو تو ٹھہر ٹھہر کر درجہ بدرجہ اتنا اتنا پڑھو جتنا آسان ہو جیسا کہ اللہ بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم دیتا ہے وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًاo (سورۃ مزمل۔4) ترجمہ: اور قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کریں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے توسط سے یہ حکم تمام اُمت کو ہے کہ وہ اپنی ذات میں مخفی علم کو درجہ بدرجہ حاصل کریں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ''(قیامت کے دن) صاحبِ قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن پڑھتا جا اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تُو دنیا میں پڑھا کرتا تھا۔ پس تیرا مرتبہ وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے۔'' (احمد، نسائی، ترمذی) یعنی جس قدر انسان کا نفس شفاف ہوگا اسی قدر اس پر اپنی ذات میں موجود علمِ حق ظاہر ہوگا اور جس قدر اس پر یہ علم ظاہر ہوا ہوگا اُسی قدر اسے معرفت اور قربِ الٰہی حاصل ہوا ہوگا اور روزِ قیامت بھی اس کا درجہ اِسی بنا پر طے کیا جائے گا۔ جس انسان نے اپنے نفس کے موٹے میلے گندے پردے کی وجہ سے اپنی ذات میں چھپے قرآنِ حقیقی کا کبھی مطالعہ ہی نہ کیا ہو گا، جسے معرفتِ الٰہی میں سے ایک ذرہ بھی حاصل نہ ہوا ہوگا اسے قربِ الٰہی کا کیا مقام حاصل ہو گا؟ جن لوگوں پر اپنی ہی ذات میں چھپا تمام علم ظاہر ہے انہیں ظاہری کتابیں، تفسیر، فقہ پڑھنے کی حاجت نہیں اور جن پر ان کی ذات کا علم ظاہر نہیں انہیں کتابیں پڑھنے سے ہی فرصت نہیں۔ اتنی کتابیں پڑھ کر بھی انہیں حقیقی علم حاصل نہیں ہوتا جیسا کہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

تجھے کتاب کے مطالعہ سے فرصت نہیں کہ تو

کتاب خواں ہے صاحبِ کتاب نہیں ہے

روزِ قیامت ہر انسان کے نفس کی حالت ہی کی بنیاد پر اس کا حساب ہوگا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ ''تمام انسان سو رہے ہیں موت آنے پر سب جاگ اُٹھتے ہیں۔'' روح کا جسم سے تعلق ٹوٹ جانے پر انسان کی اس دنیا میں حیات اور آزمائش کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی روح، قلب اور نفس کی جو حقیقتیں اس سے پوشیدہ رکھی گئی تھیں وہ سب اس پر کھول دی جاتی ہیں۔ اس وقت وہ جان جاتا ہے کہ اس کے قلب میں کون کون سے علمِ حق و خلق کے خزانے پوشیدہ تھے لیکن اپنے نفس کو اس کی اصل نورانی شفاف حالت میں برقرار نہ رکھنے کے باعث وہ ان سے بے خبر رہا۔ یوں نہ صرف اس نے اپنی قیمتی زندگی ضائع کی بلکہ ان خزانوں کی نعمت سے بھی نفس کی آلائشوں کے باعث مستفید نہ ہو سکا۔ اس وقت اس کی پشیمانی ہی اس کی سزا ہوگی۔ روزِ قیامت اس کے حساب کتاب کے لیے اس کو اپنے زندگی بھر کے اعمال نامے کو پڑھنا نہ پڑے گا بلکہ اپنے نفس کی حالت دیکھتے ہی اس کے کرتوت اس پر ظاہر ہو جائیں گے اور اللہ فرمائے گا کہ ''اب پڑھ اپنی کتاب کو آج تیرا نفس ہی تیرے حساب کے لیے کافی ہے'' اس وقت اللہ تعالیٰ ان کے نفس میں اور تمام دنیا میں موجود اپنی ذات کی تمام نشانیاں ان پر ظاہر فرما دے گا کہ میں تو تمہاری ذات میں ہی موجود تھا لیکن تم اپنی غفلت، دنیا سے محبت اور میری ذات سے لاتعلقی کے باعث اپنے اور میرے درمیان نفس کے حجاب کو گہرا اور سیاہ کرتے گئے۔ میں تم سے دور نہ تھا، شہ رگ سے بھی نزدیک تھا البتہ تم میری طرف کبھی صدقِ دل سے متوجہ ہی نہ ہوئے۔

اس روز جب اللہ اپنے خاص بندوں کو جنہوں نے اپنے نفس کو اس کی اصل شفاف حالت میں برقرار رکھا تھا، اپنے قرب کی جنت میں داخل کرے گا اور بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرمائے گا اس وقت کسی کو اپنے مقام پر کوئی اعتراض کرنے کی گنجائش ہوگی نہ کسی اور کے، کیونکہ سب کے نفوس کی حالت سب پر ظاہر ہوگی اور اس حالت کی بنا پر از خود ہر انسان کے جنت و جہنم کے مقام کا فیصلہ ہو

جائے گا اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''آج تو خود اپنا حساب کرنے کے لیے کافی ہے۔'' اللہ کی اس پر مہربانیاں اور اس کی اللہ تعالیٰ کے احکام سے نافرمانیاں سب اس کے سامنے ہوگا۔ ہر گناہ کے نتیجے میں نفس کے آئینے پر پڑنے والا سیاہ نقطہ اس کے گناہ کا گواہ اور ثبوت ہوگا۔ اپنا حساب کرنے کے لیے اسے کسی فرشتے کی ضرورت نہ ہوگی۔

☆☆☆☆☆☆

وَ کَیْفَ یَقُوْلُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی "الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْہِ" اَلْاَلِفُ یُشَارُبِہٖ اِلَی الْاَحدِیَّۃِ الذَّاتِیَّۃِ اَیِ الْحَقِ مِنْ حَیْثُ ھُوَ اَوَّلُ الْاَشْیَآءِ فِیْ اَزَلِ الْاَزَالِ وَاللَّامُ یُشَارُبِہٖ اِلَی الْوُجُوْدِ الْمُنْبَسِطِ عَلَی الْاَعْیَانِ فَاِنَّ اللَّامَ لَہٗ قَاۤئِمَۃٌ وَّ ھِیَ الْاَلِفُ وَلَہٗ ذَیْلٌوَّھِیَ دَاۤئِرَۃُ النُّوْنِ۔ وَالنُّوْنُ عِبَارَۃٌ عَنْ دَاۤئِرَۃِ الْكَوْنِ فَاِتِّصَالُ الْقَاۤئِمَۃِ بِالذَّیْلِ دَلِیْلُ انْبِسَطِ الْوُجُوْدِ عَلَی الْكَوْنِ الْجَامِعِ۔ وَالْمِیْمُ یُشَارُبِہٖ اَلَی الْكَوْنِ الْجَامِعِ وَھُوَ الْاِنْسَانُ الْكَامِلُ فَالْحَقُّ وَالْعَالَمُ وَالْاِنْسَانُ الْكَامِلُ كِتَابٌ لَّا رَیْبَ فِیْہِ۔

ترجمہ: اور کیسے فرماتا ہے اللہ تعالیٰ کہ الٓمّٓ۔ اس کتاب میں کوئی شک نہیں۔ (الٓمّٓ کے) الف سے مراد احدیت ذاتِ حق تعالیٰ ہے یعنی حق تعالیٰ کی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ہر شے کا اول اور ازل الازال (یعنی وقت کی ابتداء) سے بھی اول ہے اور 'ل' اشارہ کرتا ہے اس وجود کی طرف جو اعیان پر منبسط ہے اس لئے کہ 'ل' کا ایک قائمہ 'ا' ہے اور ایک ذیل ہے جو دائرہ 'ن' ہے۔ 'ن' سے مراد کون (عالم) ہے۔ پس قائمہ 'ا' کا ذیل 'ن' سے جڑنا اس بات کی دلیل ہے کہ ''وجود'' ''عالم'' پر منبسط ہے۔ میم سے تمام عالموں (کون ومکاں) کے جامع یعنی انسانِ کامل کی طرف اشارہ ہے پس حق اور عالم اور انسانِ کامل ایک کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔

شرح: حضرت امام حسینؓ انسانِ کامل ہیں اس لیے آپؓ پر وہ علم بھی عیاں ہے جو عام انسانوں سے مخفی ہے۔قرآن کریم میں کئی سورتوں کے آغاز میں موجود حروفِ مقطعات کو علماء ومفسرین حروفِ متشابہات قرار دیتے ہیں اور مسلمانوں کو ان کے متعلق غور وفکر کرنے سے منع کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ان الفاظ کا حقیقی علم صرف اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ہے۔لیکن حضرت امام حسینؓ اپنے علمِ حقیقی کی بناپر سورۃ البقرہ کے ابتدائی حروف الٓمّٓ کی حقیقت بیان کرتے ہیں کہ الف 'ا' سے واضح طور پر اور بلاشک وشبہ اللہ تعالیٰ کی ذات مراد ہے جو ہر اول کا اول، ازل کا ازل، احد، ابتداء، انتہاء، اِلٰہ اور ہر ابد کا ابد ہے۔الٓمّٓ کے الف سے مراد مقامِ احدیت ہے جہاں ابھی مخلوقاتِ عالم کا ظہور نہیں ہوا اور ان کا علمی وجود یعنی اعیان ثابتہ[1] ابھی ذاتِ حق تعالیٰ میں ہی مخفی ہیں۔یوں وہ ذات ہر شے کا اول ہے۔چونکہ ابھی ''وقت'' کا بھی آغاز نہیں ہوا اور ''ازل'' ہر شے کے وجود، خواہ وہ علمی وجود ہی کیوں نہ ہو، کے آغاز کے وقت کا نام ہے، اس لئے اللہ ہر ازل کا ازل ہے۔پس وہ الف یعنی آغاز، ابتداء اور اول ہے۔حضرت ابراہیم الجیلی رحمتہ اللہ علیہ ''احدیت'' کا مفہوم اس مثال کے ذریعے واضح کرتے ہیں: ''احدیت کی مثال اس دیوار کی سی ہے جسے کوئی دور سے دیکھے۔وہ دیوار مٹی، اینٹ، چونا اور لکڑی سے بنائی گئی ہو لیکن دیکھنے والا ان چیزوں میں سے کسی چیز کو نہیں دیکھتا وہ صرف دیوار کو دیکھتا ہے۔پس احدیت تو یہ دیوار ہے جو مٹی، چونے اور ریت کا مجموعہ ہے۔اس وجہ سے نہیں کہ وہ ان سب چیزوں کا مجموعہ ہے بلکہ ''دیوار'' اس کی ایک خاص ہیئت (صورت) کا نام ہے۔'' (انسانِ کامل) ورنہ اینٹ، چونے اور ریت کے مجموعے کو اگر دیوار کی صورت دینے کی بجائے کوئی اور صورت دے دی جائے تو وہ دیوار نہ کہلائے گی۔

احدیت ذاتِ حق تعالیٰ کی الوہیت ہے جس کی مثال کسی بھی شے سے نہیں دی جا سکتی۔اگرچہ اس میں تمام خلق 'اور کُن سے تخلیق کی گئی ہر شے کا علمی وجود موجود ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ

---

[1] مخلوقاتِ عالم کے مادی جسمانی وجود ظاہر ہونے سے قبل ان کی جو صورت علمِ الٰہی میں تھی۔

وہ ہر شے کا اول ہے لیکن یہ اس کی احدیت کی وجہ نہیں ہے۔ اگر وہ عالموں کو تخلیق کرنے کا ارادہ نہ کرتا اور اس کی ذات میں اشیاءِ عالم کا علمی وجود نہ ہوتا تو بھی اس کی احدیت اور الوہیت یوں ہی ہوتی۔ اس کا وجود لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ موجود ہوتا۔ لیکن اللہ نے مخلوق کو تخلیق کرنے کا ارادہ کیا چنانچہ تخلیق کے اس عمل کے آغاز سے قبل کی حالت یا مقام ''احدیت'' کے نام سے موسوم ہے جو تمام عالموں، اشیاء، مخلوقات کا جامع مقام بھی ہے اور اس سے بلند اور بالاتر بھی ہے۔

الٓمٓ میں موجود 'ل' کے متعلق حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ فرماتے ہیں کہ یہ 'ل' دو مقامات کا جامع یا دو مقامات کے درمیان پُل کی طرح ہے۔ لام کی ظاہری صورت 'ل' دو حروف 'ا' اور 'ں' کو ملا کر بنتی ہے۔ 'ا' پہلے اوپر لکھا جاتا ہے اور 'ں' 'ا' کے آخر میں جوڑ دیا جاتا ہے تو 'ل' بن جاتا ہے۔ مندرجہ بالا شرح طلب عبارت میں حضرت امام حسینؑ 'ا' کو قائمہ اور 'ں' کو ذیل فرما رہے ہیں جو آپس میں جڑ کر 'ل' بناتے ہیں۔ 'ا' سے مراد ذاتِ حق تعالیٰ ہی ہے اور 'ں' سے مراد وجودِ عالم کا دائرہ ہے جس نے ذاتِ حق تعالیٰ سے وجود پایا اور یہ 'ا' سے ہمہ وقت متصل (جڑی) رہتی ہے۔ 'ا' سے مراد حقائقِ الٰہیہ اور 'ں' سے مراد حقائقِ کونیہ یعنی کُن سے تخلیق کردہ تمام اشیاء کے حقائق ہیں۔ 'ا' اپنے مقامِ تنزل پر 'ں' سے جڑا تو 'ل' تخلیق ہوا یعنی الف (اللہ) نے نزول کرتے ہوئے 'ں' کی صورت میں عالم کو تخلیق کیا۔ 'ا' سے 'ں' میں نزول کی یہ صورت اس قدر جامع ہے کہ جب مکمل ہو کر 'ل' کی صورت اختیار کرتی ہے تو کوئی بھی اسے 'ا' اور 'ں' کا مل کر 'ل' کی صورت بنانا نہیں سمجھتا بلکہ دیکھنے والے کو یہی محسوس ہوتا ہے کہ 'ل' ایک ہی حرف ہے اور 'ا' اور 'ں' سے مل کر نہیں بنا۔ بالکل یہی صورتحال عالم کی ہے کہ اگرچہ وہ 'ا' اللہ کا 'ں' عالم کی صورت میں نزول اور ظہور ہے لیکن یہ اس قدر جامع ہے کہ اس کی اصل حقیقت سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے اور وہ عالم کو صرف عالم ہی سمجھتے ہیں اور یہ نہیں سمجھ پاتے کہ یہ اللہ کا نزول اور ظہور ہے۔ اگر 'ل' کے نچلے حصے پر ہاتھ رکھ کر اسے چھپا دیں تو صرف 'ا' دکھائی دے گا۔ یہ ان مجذوب الحال لوگوں کی حالت ہے جن کی نظروں سے عالم اور اس کی مخلوق اوجھل ہے اور صرف اللہ انہیں دکھائی دیتا ہے۔ اور اگر 'ل' کے اوپر والے

حصے پر ہاتھ رکھ دیں تو صرف 'ں' دکھائی دے گا۔ یہ ان دنیادار لوگوں کی حالت ہے جنہیں صرف عالم دکھائی دیتا ہے اور اللہ ان کی نظروں سے اوجھل ہے۔ عالم اور اس کی ہر شے اللہ کے اظہار کا ذریعہ ہے اس لیے بہت اہم ہے۔ یہ عالم نہ ہوتا تو اللہ کا اظہار کیسے ہوتا اس لیے 'ل' میں موجود 'ں' بھی اہم ہے کہ اس کے بغیر 'ا' کے اظہار کی تکمیل نہ ہوتی۔ یوں نہ 'ا' کے بغیر 'ں' کا کوئی وجود ہوتا اور نہ 'ں' کے بغیر 'ا' کا اظہار ہوتا۔ اس لیے 'ل' کے دونوں حصے برابر اہم ہیں۔ ان دونوں کو ان کی اصل حقیقت سمجھ کر دیکھنے سے ہی 'ل' یعنی 'ا' اللہ اور 'ں' عالم کی سمجھ آ سکتی ہے۔

الٓمٓ کے 'م' سے مراد انسانِ کامل یا ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے جس میں 'ا' کے تمام حقائق یعنی حقائقِ الٰہیہ اور 'ں' کے تمام حقائق یعنی حقائقِ کونیہ جمع ہیں۔ اللہ نے 'ا' یعنی احدیت سے 'ل' یعنی عالم میں نزول کر کے تمام مراتب طے کیے جن کی انتہائی صورت 'م' محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے۔ 'ل' عالمِ امر اور عالمِ خلق کا جامع ہے جس میں 'ا' عالمِ امر یعنی باطنی وجود کی طرف اشارہ ہے۔ اور ''ں'' عالمِ خلق یعنی اشیاء کے ظاہری جسموں کی طرف اشارہ ہے اور ہر شے کا پورا وجود ''ا'' اور ''ں'' کو ملا کر یعنی ظاہر اور باطن کو ملا کر بنتا ہے یوں ''ل'' ہر شے کے ظاہری و باطنی وجود کی طرف اشارہ ہے۔ 'ل' میں 'ا' پہلے اور 'ں' کا دائرہ بعد میں ہے جبکہ 'م' میں دائرہ اوپر اور 'ا' نیچے کی طرف ہے جس میں اشارہ یہ ہے کہ 'ل' عالم کی ابتداء 'ا' اللہ ہے جبکہ 'م' محمد کی انتہا 'ا' اللہ کی ذات ہے۔ 'ل' کا 'ں' عالم کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن یہاں عالم کا دائرہ نامکمل حالت 'ں' میں ہے جبکہ 'م' کے اوپر بنا دائرہ مکمل 'o' حالت میں ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وجود کا دائرہ انسانِ کامل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں آ کر مکمل ہوتا ہے۔ اس کے بغیر عالم کا 'ں' ادھورا اور نامکمل ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عالم میں ہر وقت ایک انسانِ کامل موجود ہے جو قدمِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہے۔ اس کی موجودگی کی وجہ سے ہی کائنات کا دائرہ موجود ہے۔ وہ نہ ہو تو کائنات کا توازن قائم نہ رہے اور یہ تمام نظام بے توازن ہو کر درہم برہم ہو جائے۔ وجود کی قوسین (ایک ظاہری وجود کی قوس اور دوسری باطنی وجود کی قوس) ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آ کر مل جاتی ہیں اور وجود

کا دائرہ مکمل ہوتا ہے اور پھر یہ ذات احدیت یعنی 'ا' کی طرف لوٹ جاتی ہے یوں الٓمٓ کی ابتداء بھی قائمہ 'ا' ہے اور انتہا میں 'م' کے نچلے حصے میں بھی قائمہ 'ا' موجود ہے یوں ابتداء بھی 'ا' اللہ اور انتہا بھی 'ا' اللہ۔ ال م کے ابتدائی 'ا' سے انتہائی 'ا' کے درمیان موجود 'م' کا اوپر والا دائرہ ایک مکمل جامع صورت ہے۔ یعنی ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی 'ا' اور 'ل' کے تمام حقائق کا جامع ہے۔ پس یوں ا، ل اور م وجود کے دائرے کی کتاب ہیں جس کی ابتدا 'ا' یعنی ذاتِ حق تعالیٰ ہے اور جس کی انتہا ذاتِ انسان کامل 'م' ہے جس میں آ کر ظہورِ ذات کے تمام مراتب مکمل ہو گئے اور یہ بات ہر شے سے بالا تر ہے کہ انسانِ کامل میں نا صرف ذاتِ حق تعالیٰ مکمل طور پر جلوہ گر ہے بلکہ تمام عالم بھی اسی کی ذات میں جمع اور موجود ہیں۔

☆☆☆☆☆☆
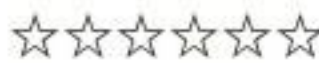
وَلِذٰلِكَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى "قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِىْ وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ"

ترجمہ: اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "اے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کہہ دیجئے کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ ہی گواہ کافی ہے اور وہ شخص جس کے پاس کتاب کا علم ہے"۔

شرح: سورۃ الرعد کی یہ آخری آیت اس وقت نازل ہوئی جب کفار نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت کا انکار کیا۔ اگرچہ کفار حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ان کی بشریت کے لحاظ سے صادق اور امین مانتے تھے اور ان کے تمام کمالات کا اقرار کرتے تھے لیکن رسالت کا تعلق ان کی جہتِ ربوبیت سے ہے جس کا انہیں انکار تھا۔ رسالت کا تعلق علمِ غیب سے ہے کیونکہ "رسول" ذاتِ حق تعالیٰ کے اُس وجود کی حقیقت لوگوں پر ظاہر کرتا ہے جو لوگوں کی نظروں سے مخفی اور غائب ہے اور اس علم اور پیغام کو لوگوں تک پہنچاتا ہے جو کسی اور ذریعے اور وسیلے سے ان لوگوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ یعنی وہ ذاتِ حق تعالیٰ کے وجود، جو کہ غیب ہے، کی بھی خبر دیتا ہے اور اس کا پیغام بھی لوگوں

تک پہنچاتا ہے۔ یہ پیغام بھی غیب ہے کہ سوائے رسول کی ذات کے کہیں اور نہیں لکھا ہوا۔ جو اس نے قربِ حق کے انتہائی مقام پر پہنچ کر اس کی ذات سے بلاواسطہ حاصل کیا۔ رسول بطور بشر اعلانِ نبوت سے پہلے بھی ہمیشہ تمام لوگوں کے درمیان اپنے اعلیٰ کمالات کی وجہ سے ممتاز جانا جاتا ہے لیکن جیسے ہی وہ اپنے علمِ غیب کا اظہار لوگوں پر کرتا ہے لوگ تین حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اول وہ لوگ جن کا نفس کافی حد تک صاف ہے، یہ حق پرست لوگ اپنے نفس کی شفافیت کے باعث رسول کے علمِ غیب کا عکس اپنے باطن میں موجود علم کی صورت سے ملتا جلتا ہونے کے باعث فوراً اسے قبول کر لیتے ہیں۔ دوم وہ لوگ جن کا نفس کچھ دھندلا ہے، انہیں کبھی یہ عکس دکھائی دیتا ہے کبھی نہیں۔ اگر دکھائی دیتا بھی ہے تو واضح نہیں ہوتا۔ ان لوگوں پر جب رسول (انسانِ کامل) کے چند معجزات کی نورانی کرنیں پڑتی ہیں تو ان کے نفس کی دھندلاہٹ دور ہو جاتی ہے اور اپنے اندر اور باہر حق کی صورت کا ایک ہی عکس انہیں صاف دکھائی دینے لگتا ہے جس کے بعد یہ بھی انسانِ کامل کی جہتِ ربوبیت کا اقرار کرنے لگتے ہیں۔ لیکن جن کا نفس بالکل سیاہ ہوا نہیں انسانِ کامل کے علمِ غیب، اس کی رسالت اور اس کی جہتِ ربوبیت کا کبھی یقین نہیں آتا۔ ان کی اپنی ذات میں موجود علمِ حق سے دوری انہیں ذاتِ حق سے بھی دور کر دیتی ہے۔ چنانچہ جس نے رسول کی رسالت کا، انسانِ کامل کی جہتِ ربوبیت کا اقرار کیا، اس نے اپنی ہی ذات میں موجود علمِ حق کی نورانی شعاعوں یعنی ذاتِ حق تعالیٰ کی موجودگی کے باعث کیا اور جس نے انکار کیا اس نے اپنی ذات میں موجود ذاتِ حق تعالیٰ کے نور سے دوری کے باعث کیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرمایا کہ ''اے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہٖ آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔'' یعنی ہدایت کا تعلق ظاہری وجود، ظاہری عمل یا ظاہری علم سے ہرگز نہیں بلکہ ہدایت کا سرچشمہ انسانی باطن میں موجود ذاتِ حق تعالیٰ سے اس انسان کا قرب یا دوری ہے، جس کا انحصار اس کے نفس کی شفافیت پر ہے۔ اس لحاظ سے اللہ کی ذات ہی گواہ ہے رسول کی رسالت اور اس کی جہتِ ربوبیت کی۔ اس کی جہتِ بشریت کے ظاہری کمالات سے تو

کسی کو انکار نہیں لیکن اس کے مظہرِ ذاتِ الٰہی اور مظہرِ علمِ الٰہی ہونے کو تسلیم کرنے کا انحصار ہر انسان میں موجود ذاتِ حق تعالیٰ سے قرب یا دوری پر ہے۔ جو انسان حق سے جتنا قریب وہ اتنی ہی جلد رسول یا انسانِ کامل کے علمِ غیب اور اس کی ربوبیت کو تسلیم کر لے گا۔ اس کے اندر موجود ذاتِ حق تعالیٰ ہی گواہی دے گی انسانِ کامل یا رسول کی رسالت کی۔ جب رسول اللہ کا پیغام علم کی صورت ان لوگوں تک پہنچائے گا تو یہ علم ان کی ذات کے اندر موجود علم کا عین، ہو بہو ہوگا اور انہیں اس علم اور پیغام کو تسلیم کرنے میں ذرہ بھر تامل نہ ہوگا۔ ان کے برعکس وہ لوگ جو ذاتِ حق تعالیٰ سے دور اور شیطان سے قریب ہیں انہیں اس کی بات اور پیغام پر کبھی یقین نہ آئے گا۔

جب کفار حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پیغام اور انہیں اللہ کے عطا کردہ علم کا انکار کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم رنجیدہ خاطر ہو جاتے جس پر اللہ تعالیٰ ان کی تسلی کے لیے فرماتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ان کفار کے ایمان لانے کی ہرگز فکر نہ کرنی چاہیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت، کاملیت، مظہرِ ذاتِ حق تعالیٰ ہونے کی گواہی دنیا میں بھی اللہ ان لوگوں کی زبان سے دے گا جنہوں نے اپنے اندر موجود کتاب کے علم تک رسائی حاصل کر لی۔ اور آخرت میں بھی دے گا جب عالم کی ہر شے سے ظاہری لباس کے پردے اتار دیئے جائیں گے، اللہ کے سوا ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ تب تو ان لوگوں کے نفس کے پردے بھی چاک ہو چکے ہوں گے جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت کا دنیا میں انکار کیا تھا۔ اس روز ذاتِ حق تعالیٰ کی موجودگی کی نشانیاں ہر انسان کے نفس کے اندر سے اور آفاق کی ہر شے میں سے ظاہر ہو جائیں گی اور خود انسانِ کامل کی جہتِ ربوبیت کے کمال کی گواہی دیں گی اور اس لیے ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو نہ دنیا میں کسی انسان کی گواہی کی حاجت ہے اور نہ آخرت میں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر کے کہ ''آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور ان کفار کے درمیان صرف اللہ ہی گواہ کافی ہے اور وہ جسے کتاب کا علم ہے'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یعنی انسانِ کامل کو اپنی ہی ذات کی طرح ہر شے کی طلب سے بے نیاز کر دیا ہے اور اس فکر سے بھی آزاد کر دیا کہ کوئی ان پر ایمان لاتا ہے یا نہیں۔

حاصلِ بحث یہ کہ اللہ اور اس کے رسول (انسانِ کامل) کو اس بات کی قطعاً حاجت نہیں کہ کوئی ان پر ایمان لاتا ہے یا نہیں۔ یہ ضرورت مخلوق کی ہے۔ ایمان کا تعلق بھی لوگوں کے نفس کی حالت پر ہے، جس کا نفس جتنا شفاف، اس پر حق اتنا ہی ظاہر اور اس کا ایمان ویقین اسی قدر پختہ، اور سب سے پختہ یقین وایمان اس کا جس کے پاس ''کتاب'' یعنی انسانِ کامل کی ذات کا علم موجود ہے اور یہ علم اس نے اپنی ہی ذات کے اندر سے اس وقت ٹھہر ٹھہر کر درجہ بدرجہ حاصل کیا جب انسانِ کامل کے قرب اور اس کی نگاہ کی بدولت اس کا نفس شفاف سے شفاف تر ہوتا گیا حتیٰ کہ شفاف ترین حالت کو پہنچ کر اس میں روحِ قدسی ظاہر ہوگئی۔ یہ وہی روح ہے جو تمام علمِ حق و خلق کی کتاب کی جامع ہے۔ جس میں تمام حقائقِ الٰہیہ وکونیہ جامع حالت میں موجود ہیں۔ پس جس نے اس کتاب کے مطالعے سے بھی اور خود روحِ قدسی کے مقام پر پہنچ کر بھی یہ بات حق الیقین سے جان لی کہ انسانِ کامل ہی ذاتِ حق تعالیٰ کا مظہر ہے اور اس کی اگر ایک جہت بشریت ہے تو دوسری ربوبیت ہے، وہ بشریت میں بھی کامل ہے اور ربوبیت میں بھی' وہی انسانِ کامل کی کاملیت کا گواہ ہے کیونکہ اس کے پاس کتاب کا اصل اور حقیقی علم ہے۔ چنانچہ انسانِ کامل کی رسالت کی گواہی ذاتِ حق تعالیٰ کے علاوہ اگر بطورِ بشر کوئی دے گا تو وہ دے گا جس نے اپنی ذات کی کتاب کو پڑھا ہوگا جو بعینہٖ وہی ہے جو انسانِ کامل کی ذات میں موجود ہے، کہ علمِ حق ازل تا ابد ایک ہی ہے اور ہر انسان میں ایک ہی جامع صورت میں موجود ہے۔ کتاب کا علم حاصل کرنے والا خواہ انسانِ کامل کے وجود کی کتاب کو پڑھے یا اپنی ذات کی کتاب کو، اسکو ایک ہی علم حاصل ہوگا بلکہ اسے اپنی ذات میں کتاب کا جو علم حاصل ہوگا وہ انسانِ کامل کی کتاب کا ہی عکس ہوگا اور وہ یہ علم انسانِ کامل کے قلب کے توسط سے ہی حاصل کرے گا اور اسی بنا پر اس کا ایمان و یقین کاملیت کی انتہا پر ہوگا اور اس کی گواہی ہر دوسری شے کی گواہی سے زیادہ مستند ہوگی کیونکہ اس کا علم سب سے مستند ہوگا۔

☆☆☆☆☆☆

فَھٰذَا یَا وَلَدِیْ ھُوَالْکِتَابُ وَعِلْمُ الْکِتَابِ وَاَنْتَ الْکِتَابُ کَمَاقُلْتُ وَعِلْمُکَ بِکَ عِلْمُ الْکِتَابِ وَلَارَطْبٍ اَیْ عَالَمُ الْمُلْکِ وَلَایَابِسٍ وَھُوَ عَالَمُ الْمَلَکُوْتِ وَلَآ اَعْلٰی مِنْہُ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ وَّھُوَ اَنْتَ۔

ترجمہ: ''پس اے بیٹے یہی کتاب ہے اور یہی علمِ کتاب ہے اور تُو خود کتاب ہے جیسا کہ بیان کیا ہم نے اور تیرا اپنے آپ کو جاننا علمِ کتاب ہی ہے اور نہ کوئی تر حصۂ زمین یعنی عالمِ مِلک اور نہ کوئی خشک حصۂ زمین یعنی عالمِ ملکوت اور نہ کچھ اس سے اعلیٰ مگر سب کچھ کتابِ مبین میں ہے اور وہ تُو ہی ہے۔''

شرح: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اپنے فرزند اور ان کے توسط سے تمام امت کو حق اور حقیقت کی پہچان اور تمام علمِ حق وخلق کے حصول کے لیے اپنی ذات کی کتاب پڑھنے کی تلقین کرتے ہیں۔

''مرآۃ العارفین'' حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہٗ کے اپنے والدِ محترم حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ سے سورۃ فاتحہ کی شرح کے متعلق سوال کا جواب ہے۔ امام عالی مقام رضی اللہ عنہٗ نے آغاز میں اُم الکتاب سورۃ فاتحہ کی شرح بیان کی اور اسی دوران اپنے فرزند ارجمند پر یہ بھی واضح کر دیا کہ قرآن کا تمام علم ان کی اپنی ہی ذات میں موجود ہے۔ اس کے لیے انہیں کسی سے سوال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کتاب کے تمام علم کی حقیقی صورت کا حصول ظاہری علم اور سوال و جواب کی بجائے اپنے قلب میں پوشیدہ علمِ حق تک رسائی سے ممکن ہے جس کے لیے شفاف نفس کی ضرورت ہے جیسا کہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ نے بھی فرمایا:

جب تک تیرے ضمیر پر نہ ہو نزولِ قرآن
گرہ کُشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

یعنی جب تک قلب میں موجود کتابِ حق نہ پڑھی جائے ظاہری علم کی گتھیاں بھی نہیں سلجھ سکتیں بلکہ حقیقت سے دوری کے باعث یہ ظاہری علم مزید الجھنوں کا باعث بنے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے

علماء کسی ولی کامل کی بارگاہ سے فیض حاصل کیے بغیر اور اپنے باطن کی صفائی حاصل کیے بغیر جب قرآن کا ترجمہ وتفسیر کرتے ہیں تو ان تمام تفاسیر میں تضاد ہوتا ہے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی حقیقت اور حق کے قریب نہیں ہوتا اور امت بھی ان کے اس تضاد کی وجہ سے الجھاؤ کا شکار ہو کر فرقوں میں بٹ جاتی ہے۔ جسے جس عالم کی بات کچھ مناسب لگتی ہے اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں کیونکہ ان کا اپنا باطن تو نفس کے میلے ہونے کے باعث اس لائق ہی نہیں ہوتا کہ ان کی صحیح راستے پر راہنمائی کر سکے۔ میلا نفس جو بھی راہ دکھائے گا وہ غلط ہی ہوگی، بگڑا ہوا باطن علم کی بگڑی ہوئی صورت ہی دکھائے گا۔ حقیقی علمِ کتاب کے حصول کے لیے باطن باصفا ہونا لازم ہے۔ جس کے لیے کسی ولی کامل کی نگاہ کے فیض کا حصول ضروری ہے۔ مرشد کامل جب اپنی نگاہوں کی نورانیت سے طالبِ حق کے نفس کا تزکیہ اور قلب کا تصفیہ کرتا ہے تب ہی اسے اپنے اندر چھپے تمام عالم، ہر خشک وتر کا علم اور اللہ کا علم حاصل ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

وَاَمَّا الْكِتَابُ الَّذِیْ اُنْزِلَ عَلَى الْاِنْسَانِ الْكَامِلِ فَهُوَ بَیَانُ الْمَرَاتِبِ الْكُلِّیَّةِ الْجُمْلِیَّةِ وَالْجُزْئِیَّةِ التَّفْصِیْلِیَّةِ الْاِنْسَانِیَّةِ فَهُوَ بَیَانُ الْكِتَابِ وَالْاِنْسَانُ الْكَامِلِ مَرْتَبَةُ وَحْدَتِهٖ وَجَمْعِیَّتِهٖ وَقَدْ فَصَّلَ مَرَاتِبَ تَفْصِیْلِهٖ لِاَنَّهٗ بَیْنَ الْفَرْقِ بَیْنَ مَقَامَاتِهٖ وَمَرَاتِبِهٖ وَاَطْوَارِهٖ وَاَدْوَارِهٖ وَذَاتِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَاَفْعَالِهٖ لِاَنَّهٗ یَحْكِیْ عَنِ الذَّاتِ وَالْاَسْمَآءِ وَالصِّفَاتِ وَالْاَفْعَالِ وَعَنِ الْعَوَالِمِ وَاَهْلِهَا وَمَرَاتِبِ الْعَوَالِمِ وَاَهْلِهَا وَاَحْوَالِ الْعَوٰلِمِ وَاَهْلِهَا فِیْ كُلِّ مَوْطِنٍ مِنَ الْمَوَاطِنِ وَعَنِ اقْتِضَآءِ اَهْلِهَا اِجْمَالًا وَّتَفْصِیْلًا وَّهٰذِهٖ تَفَاصِیْلُ

مَرَاتِبِ الْاِنْسَانِ وَھُوَ مَجْمُوْعٌ جَمِیْعِھَا فَثَبَتَ اَنَّ ھٰذَا الْکِتَابَ مُعَرِّفُ الْاِنْسَانِ وَمُبَیِّنُ مَرَاتِبَۃِ الْکُلِّیَّۃِ وَالْجُزْئِیَّۃِ۔

ترجمہ: لیکن جو کتاب انسانِ کامل پر نازل کی گئی وہ انسان کے مراتبِ کلیہ جملیہ اور جزئیہ تفصیلیہ کا بیان ہے۔ پس وہ بیانِ کتاب ہے اور انسانِ کامل اس کی وحدت اور جمعیت کا مرتبہ ہے۔ (اس کتاب میں) انسان کی تفصیل کے مراتب مفصلاً بیان کر دیئے گئے اس لیے کہ اُس (قرآن) نے اس (انسان) کے مقامات و مراتب اور اطوار اور ادوار اور اس کی ذات اور صفات اور افعال کے درمیان فرق کو بیان کر دیا۔ اس لیے کہ وہ (قرآن) بیان کرتا ہے انسان کی ذات اور صفات اور اسماء اور افعال کو، عوالم[1] اور اہلِ عوالم کے حوالے سے، عوالم اور اہلِ عوالم کے مراتب کے حوالے سے، عوالم اور اہلِ عوالم کے احوال کے حوالے سے، مکانوں میں سے ہر مکان کے حوالے سے، خواہشات اور اہلِ خواہشات کے حوالے سے، اجمالاً بھی اور تفصیلاً بھی۔ اور یہ تمام تفصیلات مراتبِ انسان کی ہیں اور وہ (قرآن) مجموعہ ہے ان سب کا۔ پس ثابت ہوا کہ یہ کتاب تعریف کرنے والی ہے انسان کی اور بیان کرنے والی ہے اس کے تمام کُلی اور اجمالی مراتب کی تفصیل کو۔

شرح: انسانِ کامل خود تمام علوم کا جامع ہے۔ اس کی ذات میں جمع ہے ہر مخلوق کی ابتداء سے اس کی انتہا تک اس کی ہر حالت کا علم کہ وہ کس طرح کس ذریعے سے تخلیق ہوگی، کس صورت میں اور کس طریقے سے اس عالمِ ناسوت میں ظاہر ہوگی، اس کی روزی کے ذرائع کیا کیا ہوں گے، وہ کون کون سے اعمال سرانجام دے گی اور اس کی حیات کا اختتام کیسے ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ اسی کے علم میں حق تعالیٰ کی معرفتِ ذات وصفات کے وہ تمام علوم ہیں جن کا دنیا کی کسی کتاب میں کوئی تذکرہ ظاہری الفاظ کی صورت میں نہیں ہے۔ البتہ قرآنی آیات کے الفاظ کی روح میں وہ معرفت پنہاں ہے جس تک رسائی بھی انسانِ کامل کے قلب کے توسط سے ہی ممکن ہے۔ ایسی صورت میں اصل جامع اُم الکتاب اور کتابِ مبین تو انسانِ کامل کی ذات ہی ہے لیکن ان علوم کو ظاہری آیات کی

---

[1] عالم کی جمع

صورت دے کر قرآنِ مجید فرقانِ حمید کی شکل میں مخلوق کی رہنمائی کے لیے ظاہر کر دیا گیا۔ قرآن کی آیات کے ''نازل'' ہونے سے مراد ہے کہ جو علوم انسانِ کامل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے باطن میں جامع اور تفصیلی حالت میں موجود تھے انہیں الفاظ کے روپ میں ڈھال کر ظاہر کر دیا جائے جن میں معانی ومفاہیم کا ایک جہان سمٹا ہوتا کہ وہ علم جو انسانِ کامل کے سینے میں سمندر سے بھی گہری اور وسیع حالت میں موجود ہے اسے ایک جامع روپ دے دیا جائے۔ لیکن ظاہری قرآن کی اصل حقیقت اور تفصیل و معانی قلبِ انسانی میں ہی موجود ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر تمام علمِ قرآن شبِ معراج ہی کھول دیا گیا تھا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو کامل قربِ الٰہی حاصل ہوا تو کامل علمِ الٰہی بھی حاصل ہو گیا۔ المواہب میں حدیث پاک بیان کی گئی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ''شبِ معراج مجھے اللہ تعالیٰ نے (پورا) قرآن بھی تعلیم کر دیا۔'' جس کی آیات بعد میں وقت اور حالات کی مناسبت سے ظاہر ہوتی رہیں۔ یعنی قرآن کا نزول درحقیقت علمِ انسانِ کامل کا ظاہری صورت اختیار کرنا ہے۔

قرآن کا موضوع ''انسان'' ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے انسان کے لیے پیغام ہے اس لیے اس کی تمام آیات کا تعلق انسان کی ذات کے ہی مختلف حالات سے ہے۔ جن آیات کا تعلق معرفتِ الٰہی سے ہے یا جن میں کائنات کی دیگر نشانیوں کا ذکر ہے وہ بھی صرف انسان کی تعلیم ہی کے لیے ہے۔ یعنی قرآن کے تمام علوم ذاتِ انسان کے لیے ہیں اور اسی کے گرد گھومتے ہیں۔ قرآن میں اگرچہ دیگر مخلوقات کا بھی ذکر ہے لیکن ان کے متعلق جامع یا تفصیلی علوم موجود نہیں اس کے برعکس انسانِ کامل کا علم ذاتِ حق کا آئینہ ہے اس لیے وہ تمام مخلوقات کے تمام علوم کا جامع ہے۔

قرآن میں انسان کی ذات اور روح سے متعلق تمام علوم کو سمو دیا گیا ہے۔ قرآن بیان کرتا ہے انسان کی ذات کی تمام صفات، احوال اور افعال مختلف عالموں کے حوالے سے۔ انسان اس عالمِ ناسوت میں آ کر جن صفات کا حامل بنتا ہے اور جو افعال سرانجام دیتا ہے وہ درحقیقت عالمِ ملکوت و عالمِ مثال میں اس کے افعال، احوال اور صفات کا عکس ہوتا ہے۔ قرآن کی آیات جب

انسان کی صفات یا احوال و افعال کے متعلق کچھ بیان کرتی ہیں تو ان کا تعلق تمام عالموں سے ہوتا ہے مثلاً جب اللہ فرماتا ہے کہ ''انسان بڑا ناشکرا ہے'' تو انسان کی اس حالت، صفت اور فعل کا تعلق تمام عالموں سے ہے۔ جس انسان کی روح عالمِ ملکوت میں اس صفت سے متصف ہوئی وہ عالمِ ناسوت یعنی اس دنیا میں بھی یہی صفت اختیار کرے گا اور آخرت میں بھی اسی حالت میں ہوگا جیسا کہ اللہ نے فرمایا کہ: ترجمہ ''جیسے مریں گے ویسے ہی جمع کیے جائیں گے، جیسے جمع ہوں گے ویسے ہی اُٹھائے جائیں گے۔'' اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک چھوٹی سی آیت ''انسان بڑا ناشکرا ہے'' میں انسان کی اس صفت کو تمام عالموں کے حوالے سے بیان کر دیا۔ ''مکانوں میں سے ہر مکان کے حوالے سے'' سے یہی مراد ہے کہ وہ عالمِ مکان یعنی یہ دنیا ہو یا عالمِ ملکوت و جبروت یا عالمِ لامکان ہو، ہر حوالے سے انسان کے اطوار یعنی طور طریقے اور صفات کا بیان قرآن میں موجود ہے۔

قرآن کی کئی آیات کا تعلق صرف عالمِ ملکوت اور اس میں کیے گئے انسان کے اعمال، احوال اور صفات سے ہے مثلاً عالمِ ملکوت میں کیے گئے اللہ سے وعدہ ''قالو بلیٰ'' کا ذکر یا اس امانتِ الٰہیہ کے اٹھا لینے کا ذکر جسے اُٹھانے سے آسمان، زمین اور پہاڑوں نے عاجزی ظاہر کر دی تھی۔ ایسی ہی بے شمار آیات اس عالمِ ناسوت میں انسان کے وارد ہونے سے پہلے کے اعمال، احوال اور صفات کو بیان کرتی ہیں۔ پھر سب سے زیادہ آیات اس عالمِ ناسوت میں انسان کے اچھے بُرے تمام اعمال، اچھی بُری تمام صفات اور احوال کے ذکر میں ہیں اور ان اعمال، احوال و صفات کو اچھا بنانے کے لیے رہنمائی کرنے کے لیے ہیں۔ آیات میں اس کے بے صبرے پن، اس کے لالچ، اس کے کینے کا بھی ذکر ہے، ایسے اعمال سے بچنے کا حکم اور سزا کا ذکر بھی ہے، مومنوں کی اچھی صفات، اللہ سے ان کے خوبصورت تعلق اور اس کے حوالے سے کئے گئے اعمال اور ان کی اللہ کے ہاں قدر و منزلت کا ذکر بھی ہے۔ انسان کے آپس کے تعلقات کے حوالے سے بھی ان کے افعال، احوال اور صفات کا ذکر ہے اور انہیں بہتر بنانے کی تلقین بھی ہے۔ اور پھر موت کے بعد کے انسان کے حالات، روزِ جزا ہونے والے حساب کتاب اور انسانوں کے افعال و صفات کے

حوالے سے ان کے اس عالمِ ناسوت سے رخصت ہونے کے بعد ان کے مقامات، درجات اور احوال کا ذکر بھی ہے۔ غرضیکہ قرآن کی تمام آیات انسان ہی کے ہر عالم میں احوال، صفات، افعال، مراتب و درجات کا بیان ہیں۔ ہر آیت کا مدعا و مقصد انسان کو اُس کی ذات کے ہی متعلق اور اس کے رب تعالیٰ کے متعلق آگاہی دینا ہے۔ اللہ بندے سے کیا چاہتا ہے اور بندے کے دل میں کیا کیا خواہشات بھری ہیں سب کی تفصیل اس نازل کردہ یعنی ظاہر کردہ کتاب میں ہے۔ چنانچہ قرآن انسان کے تمام عوالم میں، تمام مراتب میں اور تمام حالات میں اسکی ذات، صفات اور افعال کا کُلی یعنی مکمل، اجمالی یعنی چند الفاظ میں سمٹا ہوا جامع، جزئی یعنی اس کی ظاہری و باطنی حیات کے ایک ایک جز اور مخلوقِ انسانی کے ایک ایک جز یعنی فرد کے متعلق تفصیلی بیان ہے۔ جبکہ انسانِ کامل کی ذات ان تمام مراتب، عوالم، احوال وصفات کے ہر طرح کے کُلی، اجمالی، جزئی، تفصیلی بیان کی جامع ہے۔ اس کی ذات میں یہ تمام تفصیل اپنی اصل حقیقی صورت میں موجود ہے اس لیے وہ اس کتاب یعنی قرآن کا جامع ہے اور چونکہ تمام کی تمام آیات جو قرآن میں پھیلی ہوئی ہیں، قلبِ انسانِ کامل میں ایک جگہ سمٹ گئی ہیں اس لیے انسانِ کامل قرآنی تفصیل کا مرتبہ وحدت بھی ہے۔

اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ جس طرح طب کی بے شمار کتابوں کا تمام ظاہری علم ایک طبیب کے سینے میں جمع ہوتا ہے اس لیے طبیب کا مرتبہ طب کی تمام کتب سے اعلیٰ ہے بلکہ اس کا شعور اور تجربہ اسے اکثر وہ علم بھی عطا کر دیتا ہے جو کتب میں موجود نہیں اسی طرح انسانِ کامل کے سینے میں تمام علومِ قرآن جمع ہیں اس لیے اس کی ذات اصل جامع القرآن ہے۔

☆☆☆☆☆☆

وَاِذَا تَقَرَّرَ هٰذَا فَاعْلَمْ اَنَّ لِهٰذَا الْكِتَابِ الْمُنَزَّلَ عَلَى الْاِنْسَانِ الْكَامِلِ فَاتِحَةٌ مُسَمًّى بِاُمِّ الْكِتَابِ وَ جَمِيْعُ مَافِى الْكِتَابِ مُفَصَّلٌ

فِيْهَا مُجْمَلٌ وَ مَافِيْهَا مُجْمَلٌ فَهُوَ فِي الْكِتَابِ مُفَصَّلٌ وَالْفَاتِحَةُ فِي
الْبِسْمِلَةِ وَ الْبِسْمِلَةُ فِي الْبَآءِ وَالْبَآءُ فِي النُّقْطَةِ مُنْدَرِجَةٌ فَهِيَ اُمُّ
الْكِتَابِ وَ جَمِيْعُ الْكِتَابِ كَائِنٌ فِيْهِ اَلْحُرُوْفُ الْمُقَطَّعَاتُ
وَالْمُتَّصِلَاتُ وَالْاَلْفَاظُ وَالْكَلِمَاتُ وَالسُّوَرُ وَالْاٰيَاتُ وَالْكِتَابُ
عِبَارَةٌ عَنْ اِنْبِسَاطِهَا وَتَعَيُّنِهَا بِجَمِيْعِهَا وَاِنْدِرَاجُ الْكُلِّ فِيْهَا
عِبَارَةٌ عَنْ عَدَمِ اِنْبِسَاطِهَا اِذْ مَا ثَمَّہٗ شَيْءٌ غَيْرُ۔

ترجمہ: اور جب یہ ثابت ہو چکا تو معلوم کر کہ اس کتاب (قرآنِ کریم) جو نازل کی گئی انسانِ کامل پر، کے واسطے فاتحہ ہے جس کا نام اُم الکتاب ہے اور تمام وہ چیز کہ بیچ کتاب کے مفصل ہے بیچ اس کے مجمل ہے اور وہ چیز کہ بیچ اس کے مفصل ہے کتاب (قرآن) میں مجمل ہے۔ اور وہ فاتحہ بیچ بسم اللہ کے ہے اور بسم اللہ باء میں اور باء نقطہ میں داخل ہے پس یہ ام الکتاب ہے اور جمیع الکتاب ہے کہ ہونے والے ہیں اس میں حروفِ مقطعات اور متصلات اور الفاظ اور کلمات اور سورتیں اور آیتیں۔ اور کتاب مراد ہے فراخی اس کی سے اور تعین اس کے سے بہ تمام ہا اور داخل ہونا کُل کا اس میں مراد ہے عدم فراخی اس کی سے اس لیے کہ نہیں اس جگہ کوئی چیز اس کے علاوہ۔

شرح: بخاری شریف میں ہے کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت ابوسعید بن معلیؓ سے فرمایا کہ "کیا میں تمہیں ایسی سورت نہ بتاؤں جو قرآنِ کریم کی تمام سورتوں کی سردار ہے۔ وہ الحمد شریف ہے۔ یہی سبع ثانی (سات آیتوں والی) اور قرآنِ عظیم ہے جو مجھے عطا فرمائی گئی۔"

جس طرح انسانِ کامل میں تمام مخلوقات کا علم تفصیلاً اور مجملاً موجود ہے اسی طرح سورۃ فاتحہ میں تمام قرآن کا علم جمع ہے۔ قرآن کریم کی سورتوں کی ترتیب نزولی نہیں توقیفی ہے یعنی جس ترتیب میں یہ نازل ہوئیں قرآن میں اس ترتیب سے نہیں رکھی گئیں بلکہ جو بھی آیت نازل ہوتی حضرت جبرائیل قرآن مجید میں اس کی جگہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بتا دیتے چنانچہ قرآن کی ترتیب حکم الٰہی

کے مطابق رکھی گئی اور حکمِ الٰہی سے ہی سورۃ فاتحہ کو قرآن پاک کے آغاز میں رکھا گیا۔ کیونکہ سورۃ الفاتحہ تمام قرآن کریم کا خلاصہ اور دیباچہ ہے۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں بیان فرمانے والا ہے وہ تمام کا تمام اپنی انتہائی جامع صورت میں سورۃ الفاتحہ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ قرآن ذکر ہے تمام جہانوں کے رب کا، جس میں ذاتِ حق تعالیٰ کی تعریف و معرفت بیان کی گئی ہے اور سورۃ فاتحہ میں یہ تعریف اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کے جامع الفاظ میں بیان کر دی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ اللہ تمام عالموں کا رب ہے جس سے بندوں کے علم میں یہ بات لانا مقصود ہے کہ عالم صرف یہی ایک نہیں جو بندوں کو ظاہراً نظر آتا ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی کئی عالم ہیں جن کی حقیقت بندوں کی نظر سے اوجھل ہے۔ یوں بندوں پر اللہ تعالیٰ کی برتری بھی ثابت ہو گئی اور بندوں کا ناقص العلم اور ناقص العقل ہونا بھی ظاہر ہو گیا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ ارض و سماوات کو بنانے کے متعلق آیات بھی بیان فرماتا ہے اور ان میں ظاہر اپنی نشانیوں کا ذکر بھی فرماتا ہے۔ ارض و سماوات اور اس میں ظاہر اللہ تعالیٰ کی تمام نشانیوں کی تمام تر تفصیل کو ''رب العالمین'' کے جامع الفاظ میں سمیٹ دیا گیا۔

قرآن اللہ تعالیٰ کی تمام صفاتِ رحمت و قہر کو بیان کرتا ہے۔ سورۃ فاتحہ میں اس کی رحمت کی صفات کو ''اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' میں سمو دیا گیا اور اس کی قدرت، اس کی گرفت اور قہر و غضب کی صفات کو بندے کے دل میں اتار دینے کے لیے ''مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' کے الفاظ استعمال کیے گئے کہ وہی ہے جو روزِ جزا سب فیصلوں کا مالک ہو گا۔ جو اس حقیقت کو تسلیم کرے گا وہی اس کے احکام کی پیروی صحیح طریقے سے کر پائے گا اور وہی اس کی قائم کردہ حدود و قیود کو تسلیم کرے گا۔ قرآن میں روزِ آخرت، اس دن قائم کیے جانے والے میزان اور دی جانے والی جزا و سزا کا ذکر تفصیلاً موجود ہے تاکہ بندے اس دن کے آنے کے لیے تیار ہو جائیں اور اپنے ظاہری و باطنی اعمال کو سنوار لیں۔ اس دن کے متعلق تمام تفصیلی آیات کو مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ میں جمع کر دیا گیا ہے۔

قرآن اللہ اور بندے کے تعلق کا بیان ہے۔ قرآن بندے کو عبادات اور توکّل کے ذریعے

اپنے رب سے اپنا تعلق قائم کرنا سکھاتا ہے اور سورۃ فاتحہ میں یہ تمام تفصیل ''اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ'' کے الفاظ میں سمودی گئی۔ قرآن صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت ہے اور بندے کو یہ راہ اختیار کرنے کی ترغیب بھی دیتا ہے اور ذریعے اور راستے بھی سمجھاتا ہے۔ بندے کو دی جانے والی یہ تمام ترغیب ایک دعا کی صورت میں سورہ فاتحہ میں شامل ہے کہ ''اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ'' ہمیں سیدھا راستہ دِکھا۔ اگر انسان صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے سے قبل خلوص نیت سے یہ دعا کرے گا تو ہی قرآن کے اندر موجود صراطِ مستقیم کے متعلق تمام ہدایت ورہنمائی سے فیض یاب ہو پائے گا۔ اسی لیے قرآن کے آغاز میں رکھی گئی یہ آیت ''اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ'' درحقیقت صراطِ مستقیم کی طرف اُٹھنے والا بندے کا پہلا قدم ہے۔ یہ صراطِ مستقیم کن لوگوں کی پیروی کر کے اختیار کیا جا سکتا ہے، ان بندوں کے اوصاف، ان کی پہچان، ان کے طریقے کیا ہیں، ان کا اپنے ربّ سے تعلق کیا اور کیسا ہے، قرآن میں یہ تمام تفصیل بھی موجود ہے۔ انبیاء ومحبوبین کے متعلق آیات اور بیان کردہ واقعات کے ذریعے اللہ ہمیں اپنے ان انعام یافتہ لوگوں کا راستہ اور طریقہ بھی سمجھاتا ہے اور ان کی پیروی کی تلقین بھی کرتا ہے ترجمہ: ''اور لازم ہے تم پر ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی نیک چال چلنی''۔ قرآن کریم میں جا بجا واقعات وآیات کی صورت میں پھیلے ان لوگوں کے اوصاف اور ان کی پیروی کی ترغیب کو سورۃ فاتحہ میں ان الفاظ میں سمیٹ دیا گیا صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ''ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے اپنا انعام نازل کیا۔'' انسان انسان سے ہی سیکھتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ اسے اللہ سے اپنا تعلق جوڑنے کے طریقے اس سے پہلے گزرے انسانوں کے طریقوں کی مثالیں دے کر سمجھائے جائیں اور اس کے سامنے ایسے لوگوں کے اوصاف بھی بیان کر دیے جائیں تاکہ وہ اپنے اردگرد ایسے لوگوں کو تلاش کر کے انہیں آیاتِ قرآنی میں بتائی گئی نشانیوں کے مطابق پہچانے اور پھر ان کی پیروی کرے۔ سورۃ فاتحہ کی اس دعا میں انہی تمام باتوں کی تفصیل کو سمیٹا گیا ہے۔ انسان کو سیدھے راستے پر رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے غلط راہ پر چلنے والے لوگوں کے انجام سے بھی باخبر کر دیا جائے تاکہ وہ عبرت پکڑے اور

اس راہ کو اختیار کرنے سے پہلے اللہ کے غضب کی مثالیں ان لوگوں کے متعلق جان کر سمجھ لے جنہوں نے اس غضب کو دعوت دی۔ قرآن بندوں کے لیے نصیحت اور عبرت بھی ہے۔ بندوں کے سرکش نفس کو قابو میں رکھنے کے لیے اللہ جابجا گزشتہ نافرمان قوموں کے برے اعمال اور ان پر انہیں دیے گئے عذاب کا بھی تذکرہ کرتا ہے اور ایسی روش کی پیروی کرنے والوں کو روزِ جزا دی جانے والی سخت سزاؤں کا ذکر بھی کرتا ہے۔ اللہ کے غضب کا یہ تمام ذکر صرف اس لیے کہ لوگ اللہ سے خوف کو قائم رکھیں اور ایسی راہ کی طرف مائل نہ ہوں جو اس کے غضب کو دعوت دے۔ اس تمام ترنصیحت اور عبرت کو سورۃ فاتحہ کی آیت ''غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ'' میں سمودیا گیا۔ یوں تمام قرآن کی تمام تفصیل سورۃ فاتحہ میں جمع بھی ہے اور سورۃ فاتحہ تمام قرآن کی بنیاد بھی ہے۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ تمام قرآن سورۃ فاتحہ کا ہی تفصیلی بیان ہے اور اس کی آیات کی تشریح وتفسیر ہے۔

سورۃ فاتحہ کی تمام تفصیل کا ''بسم اللہ'' میں جمع ہونے سے مراد قرآن اور سورۃ فاتحہ کی تمام روح کا اسمِ اَللّٰہُ ذات میں جمع ہونا ہے۔ اسمِ اَللّٰہُ تمام عالموں میں موجود اللہ کی تمام نشانیوں کا جامع ہے۔ اسمِ اَللّٰہُ میں ہی اللہ کی تمام صفات اور ذات مجتمع ہیں اور قرآن انہی صفات وذات کی حقیقت کا بیان ہے جس کا خلاصہ سورۃ فاتحہ میں ہے۔ اسمِ اَللّٰہُ قرآن کی حقیقی روح کو بندے پر کھولتا ہے۔ جب ذکر اسمِ اَللّٰہُ ذات سے نفس شفاف ہو کر روح کا تصفیہ ہو جاتا ہے تو قلبِ انسانی میں پوشیدہ تمام علمِ قرآن اس پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ قرآن میں موجود ہدایت کا خزانہ اسمِ اَللّٰہُ ذات سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ بغیر اسمِ اَللّٰہُ ذات قرآن کی روح تک پہنچنا ناممکن ہے۔ اسمِ اَللّٰہُ ذات ہی اسمِ اعظم ہے جس میں تمام قرآن کی تاثیر جمع ہے۔ سلطان العارفین حضرت سخی سلطان باھُو رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ب بسم اللہ اسم اَللّٰہُ دا اے وی گہنا بھارا ھُو

ترجمہ: بسم اللہ میں اسم اَللّٰہُ پوشیدہ ہے اور یہ وہی بھاری امانت ہے (یعنی ذاتِ حق تعالیٰ) جس

کو اٹھانے سے تمام مخلوقات نے انکار کر دیا تھا سوائے انسان کے۔ آپؒ مزید فرماتے ہیں ''سن
چاروں کتابیں توریت، زبور، انجیل اور قرآن مجید حقیقت میں اسمِ اَللّٰہُ ذات کی شرح و تفسیر ہیں۔
تمام پیغمبروں نے پیغمبری اسمِ اَللّٰہُ ذات کی برکت سے پائی۔ اسمِ اَللّٰہُ ذات عین ذات پاک
ہے'' (عین الفقر)

یعنی نہ صرف قرآن بلکہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ تمام الہامی کلام اسمِ اَللّٰہُ ذات کی تفصیل ہیں
اور ان کا تمام علم اسمِ اَللّٰہُ ذات میں جمع ہے۔ سلطان العارفین حضرت سخی سلطان باھو رحمتہ اللہ
علیہ کی تمام کتب اسمِ اَللّٰہُ ذات کی شرح و تفسیر ہیں۔ اپنی تصنیف نور الہدیٰ شریف میں آپ رحمتہ
اللہ علیہ فرماتے ہیں ''جملہ قرآنی علوم، نص و حدیث اور تمام علوم جو لوحِ محفوظ اور عرش و کرسی پر لکھے
ہوئے ہیں، ماہ سے ماہی تک ساری مملکتِ خداوندی کے غیبی علوم اور اللہ تعالیٰ کے سارے بھید اور
توریت، زبور، انجیل و قرآن کے جتنے علوم ہیں تمام حکم احکام اور ظاہری و باطنی، نفسی، قلبی، روحی،
سرّی امور اور جو حکمتیں تمام عالمِ مخلوقات کے درمیان جاری ہیں سب کے سب اسی تصور اسمِ اَللّٰہُ
ذات سے حاصل ہوتے ہیں۔'' (نور الہدیٰ)

جو شخص ذکر و تصور اسمِ اَللّٰہُ ذات سے اسمِ اَللّٰہُ ذات کی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے وہ حق
الیقین سے جان لیتا ہے کہ کائنات کا کوئی علم اور راز اسمِ اَللّٰہُ ذات سے باہر نہیں ہے۔ سلطان
الفقر ششم حضرت سخی سلطان محمد اصغر علی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''جس دل کے اندر اسمِ اَللّٰہُ ذات
نقش ہو کر قرار پا گیا اس کے سامنے کائنات کا کوئی راز باقی نہ رہا'' (شمس الفقرا)۔ غرض قرآن کا
تمام علم سورۃ فاتحہ میں جمع ہے اور سورۃ فاتحہ کی روح اسمِ اَللّٰہُ ذات میں ہے۔

بسم اللہ کا باء میں پوشیدہ ہونے سے مراد اسمِ اَللّٰہُ ذات کا ''با'' یعنی بندۂ کامل میں
ظاہر ہونا ہے۔ ''با'' سے مراد وہ بندۂ حق (انسانِ کامل) ہے جو تمام ذات و صفاتِ حق تعالیٰ کا مظہر
ہونے کے ساتھ ساتھ تمام علمِ حق و خلق کا بھی جامع ہے۔ وہ بندۂ مومن یعنی انسانِ کامل جو قاری
نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں ہے قرآن، جس نے قربِ الٰہی کی انتہا پر پہنچ کر علمِ الٰہی کو بھی حاصل کر

لیا، وہی بندۂ کامل تمام علمِ قرآن کا جامع ہے۔ اس 'با' یعنی بندۂ مومن میں جمع تمام علم قرآن کا 'با' کے نقطہ میں جمع ہونے سے مراد قرآن کے تمام علم کا بندۂ مومن کے 'قلب' میں جمع ہونا ہے۔ 'با' کے نقطہ سے مراد بندۂ مومن کا قلب ہے۔ مومن کا قلب کائنات کا وہ مقام ہے جہاں ذات حق تعالیٰ کی سمائی ہے کہ نہ وہ زمینوں میں سماتا ہے نہ آسمانوں میں لیکن بندۂ مومن کے قلب میں سما جاتا ہے۔ بندۂ مومن کا قلب ہی با کا وہ نقطہ ہے جہاں اللہ اور اس کا تمام علم جمع اور مرکوز ہے۔ چنانچہ قرآن کا علم ہو یا دوسری الہامی کتب کا، مخلوق کا علم ہو یا خالق کا، دنیا کا علم ہو یا آخرت کا، ہر علم مومن کے قلب کے نقطے میں جمع ہے۔ تمام عالم کے پھیلاؤ سے مراد اس قلب کا فراخ ہونا یا پھیلنا ہے۔ جس قلب میں اللہ سمایا ہے ظاہر ہے تمام عالم بھی اس میں سمایا ہے۔ اسی قلب کے فراخ اور وسیع ہونے سے عالم ظاہر ہوا۔ عالم کی تمام مخلوقات اور اشیاء اس قلب کے لیے وہی حیثیت اور حقیقت رکھتی ہیں یا ان کی قلبِ انسانِ کامل سے وہی نسبت ہے جو قرآن کی آیات، سورتوں، الفاظ اور کلمات کو سورۃ فاتحہ سے ہے۔ قرآن کی تمام آیات، سورتیں، الفاظ اور کلمات جس طرح سورۃ فاتحہ کی تفصیل ہیں اسی طرح افراد، افراد کے گروہ اور قومیں قلب انسانِ کامل کی تفصیل ہیں۔

قرآن پاک میں اللہ فرماتا ہے: ترجمہ: ''ہم نے تم سب کو ایک جان سے پیدا کیا'' اور فرماتا ہے ''وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا'' (یونس۔ 19) ترجمہ: ''اور لوگ پہلے واحد اُمت تھے پھر جدا جدا ہوئے''۔ وہ مقام جہاں سب مخلوقات واحد حالت میں جمع ہیں وہ قلبِ انسانِ کامل ہے' اسی مقام سے انھیں وسعت اور پھیلاؤ حاصل ہوا۔ اسی نسبت سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ فرماتے ہیں کہ ''الفاظ، حروف، کلمات اور سورتیں اور آیتیں اور کتاب مراد ہے فراخی اس کی (قلبِ انسانِ کامل یا با کا نقطہ) سے اور داخل ہونا کُل (مخلوقاتِ عالم) کا اس میں مراد ہے عدم فراخی اس کی سے کہ نہیں کوئی اور چیز اس کے علاوہ''۔

☆☆☆☆☆☆

فَمَنْ عَرَفَ مَا قُلْنَا عَرَفَ مَعْنٰی قَوْلِهٖ تَعَالٰی "اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِناً" فَمَدُّ الظِّلِّ عِبَارَةٌ عَنْ اِنْبِسَاطِ النُّقْطَةِ الْوُجُوْدِيَّةِ وَتَعَيُّنِهَا بِتَعَيُّنَاتِ الْحُرُوْفِ الْاِلٰهِيَّةِ وَالْكَوْنِيَّةِ وَالسُّكُوْنُ عِبَارَةٌ عَنْ عَدَمِ اِنْبِسَاطِ النُّقْطَةِ الْوُجُوْدِيَّةِ وَتَعَيُّنِهَا بِتَعَيُّنَاتِ الْحُرُوْفِ الْاِلٰهِيَّةِ وَالْكَوْنِيَّةِ وَعَدَمِ بَقَآئِهَا عَلٰی بَسَاطَتِهَا الْمُنَبَّهَةِ عَلَيْهَا فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی (كُنْتُ كَنْزًا)

ترجمہ: سو جس نے پہچانا اس چیز کو جو ہم نے کہا ہے (اُس نے) پہچانے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے معنی کہ ترجمہ: ''کیا نہیں دیکھتا تو اپنے ربّ کو کہ کیسا پھیلایا سایہ اور اگر چاہتا تو اسے ساکن کر دیتا۔'' پس سایہ کھینچنے سے مراد ہے وجود کے نقطے کی فراخی اور حروفِ الٰہیہ اور کونیہ کا تعین۔ اور (سایہ کے) ساکن ہونے سے مراد ہے نقطۂ وجود کی عدم فراخی اور حروفِ الٰہیہ اور کونیہ کا عدم تعین جو دلیل ہے اللہ تعالیٰ کے قول ''کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًا'' ''میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا'' پر۔

شرح: سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ترجمہ: ''کیا تو نے نہیں دیکھا اپنے ربّ کی طرف کہ کیسے پھیلایا سائے کو اور اگر چاہتا تو اسے ٹھہرا ہوا کر دیتا۔ پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل کیا پھر ہم نے آہستہ آہستہ اسے اپنی طرف سمیٹا۔'' (الفرقان۔ 45,46)

قرآن کریم اپنے نازل کرنے والے کی طرح سمندر سے بھی گہرے معنی رکھنے والی کتاب ہے۔ ہر آیت بلکہ ہر حرف معنی اور بناوٹ کے لحاظ سے بے پناہ گہرا اور وسیع ہے۔ اس کے ظاہری الفاظ کے ظاہری معنوں کا اطلاق اس ظاہری دنیا یعنی عالمِ ناسوت اور اس کے قوانین، افعال و اعمال پر ہوتا ہے۔ ان ظاہری معنوں کے باطن میں چھپے معنوں کا بھی ایک باطن ہے جن کا تعلق باطنی عالموں سے ہے اور پھر ان معنوں کا بھی ایک باطن ہے۔ یوں یہ بطون در بطون انتہائی گہری اور وسیع کتاب ہے۔ ان حقیقی معنوں کے باطن تک رسائی کے لیے انسان کو اس عالمِ ناسوت یا

ظاہری دنیا سے اپنی ہی ذات کے اندر، باطنی عالموں یعنی عالمِ ملکوت، عالمِ جبروت ولاہوت تک سفر کر کے ذاتِ حق تک رسائی حاصل کرنا ہوگی۔ ذاتِ حقیقی تک رسائی سے ہی قرآن کریم کی آیات کے حقیقی معنوں تک رسائی حاصل ہوگی ورنہ اس ظاہری دنیا میں قید انسان خواہ کتنا بھی علم کیوں نہ حاصل کر لے اور کتنا ہی بڑا اور نامور عالم کیوں نہ بن جائے اللہ کی بات کی اصل حقیقت کبھی اس پر ظاہر نہ ہوگی جس کی دلیل سورۃ الفرقان کی مذکورہ بالا آیت ہے۔ قرآن کریم کی اس وقت جتنی بھی تفاسیر موجود ہیں ان سب میں اس آیت کی تفسیر میں سائے اور سورج سے مراد دنیاوی ظاہری سورج اور اس سے بننے والے سائے ہی مراد لیا گیا ہے۔ ظاہری دنیا کے لحاظ سے یہ تفسیر درست ہے لیکن یہ انتہائی محدود تفسیر ہے اور حقیقی معنوں کا کوئی نقطہ بھی اس سے واضح نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو سراجاً منیراً یعنی روشن چراغ کہہ کر پکارا اور شمس یعنی سورج کا لقب بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے استعمال کیا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ انسانِ کامل ہیں جن کی رسائی حق اور حقیقت تک ہے چنانچہ وہ اس آیت مبارکہ کے حقیقی معنی بیان کرتے ہوئے ''سائے کو دراز'' کرنے کے الفاظ سے ''وجود'' کے نقطے کا فراخ ہونا مراد لیتے ہیں۔ وجود کا نقطہ قلبِ انسانِ کامل یا حقیقتِ انسانِ کامل ہے جسے ''حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم'' کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے اور جس کے متعلق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ ''اللہ نے سب سے پہلے میرے نور کو پیدا فرمایا اور پھر میرے نور سے تمام مخلوق کو پیدا فرمایا'' نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جامع نقطے سے تمام مخلوقات کے نور کا پیدا ہونا ہی ''سائے کا دراز'' ہونا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات ہی ''علم'' بھی ہے اور ''قلم'' بھی۔ تمام کا تمام علمِ حق وخلق قلبِ انسانِ کامل کی ''قلم'' میں جمع ہے۔ اس قلب سے پھوٹ کر یہ تمام علم اس عالم میں پھیلا۔ اس قلب کے نقطے سے علمِ حق کا تمام عالم میں پھیل جانا 'سائے کا دراز' ہونا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اصل وجود تو نقطہ یعنی نورِ محمد ہے جبکہ باقی عالم اس نقطے سے پھیلا ہوا سایہ۔ جس طرح ہر حرف کا آغاز ایک نقطہ سے ہوتا ہے اور ہر حرف

درحقیقت اس ایک نقطے کا دراز ہونا ہی ہوتا ہے' اس طرح کائنات کے ہر وجود کو اگر ایک حرف سمجھا جائے تو اس کا آغاز نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ایک نقطہ ہی ہے۔ یہی نور روحِ قدسی میں ڈھلا اور روحِ قدسی قلب میں اور قلب سے روحِ انسانی کی تخلیق ہوئی اور پھر روح ظاہری وجود کی صورت میں ظاہر ہوگئی اور اس تمام سلسلے سے ہی سائے کا دراز ہونا مراد ہے۔

آگے اللہ فرماتا ہے کہ اگر وہ چاہتا تو اس کو ساکن کر دیتا یعنی جب اللہ تعالیٰ نے قلب ونورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تخلیق کیا اور اس آئینے میں خود کو ملاحظہ کیا تو اس کی اپنی ذات کے دیدار کی خواہش کی تکمیل ہوگئی وہ چاہتا تو اپنے محبوب کی ذات کی تخلیق کے بعد تخلیق کے عمل کو روک دیتا لیکن یہ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فیض اور فیضان ہے جس نے تمام عالموں کی مخلوقات کو وجود بخشا اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات مومنین پر اللہ کا احسان ہے۔'' کہ وہ نہ ہوتی تو ہم بھی نہ ہوتے۔ اور فرمایا کہ ترجمہ: ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تو مومنین کی جانوں سے بھی زیادہ نزدیک ہیں'' (سورۃ الانفال) یعنی وہ ان کی جان یا روح کے اندر موجود ہیں کیونکہ ہر قلبِ انسانی کا وجود قلبِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہی ہے۔ سائے کے ساکن ہونے سے مراد ہر قلبِ انسانی میں قلبِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی موجودگی ہے کہ اگر ظاہری اجسام اور نفوس کے پردے ہٹا دیئے جائیں تو ہر جگہ ایک ہی ذات موجود ہے اور اگر ہر جگہ چاروں طرف ایک ہی شے موجود ہو تو خواہ وہ کتنی ہی وسیع اور متحرک کیوں نہ ہو، دیکھنے والے کو وہ ایک ہی نقطہ کی طرح اور ساکن محسوس ہوتی ہے۔

سائے کے ساکن ہونے سے مراد وہ مقامِ واحدیت بھی ہے جہاں ابھی صرف ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا وجود نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور روحِ قدسی کے نقطے کی صورت میں موجود ہے اور جہاں ابھی اس نقطے سے مخلوقاتِ عالم کے حروف کی تخلیق اور تعین نہیں ہوا اور مقامِ واحدیت ہی وہ مقام ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کُنْتُ کَنْزًا ''میں تھا ایک خزانہ''۔ یہ خزانہ چھپا ہوا' ٹھہرا ہوا یا ساکن ہے نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نقطے میں۔ اللہ چاہتا تو اسے ٹھہرا ہوا ہی رکھتا اور پھر کسی مخلوق کو کوئی وجود عطا نہ ہوتا لیکن اللہ نے اسے دراز فرمایا اور وجودِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اسے دراز کرنے کی وجہ اور دلیل

بنایا جیسا کہ اللہ نے دنیاوی سورج کو سایوں کے بننے اور ان کے پھیلنے اور سکڑنے کی وجہ اور دلیل بنایا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام یا انسانِ کامل ہی آفتابِ حیات اور آفتابِ ہدایت ہیں اور انہی سے پھیلا یا دراز ہوا ہے اس تمام عالم کا سایہ۔

مخلوقاتِ عالم کی تخلیق کو ''سائے کا دراز ہونا'' کہنے میں یہ حکمت بھی نظر آتی ہے کہ سایہ اصل وجود نہیں ہے، نہ ہی سائے کو بقا ہے، سائے کا وجود سورج کے ہونے سے ہے، جونہی سورج چھپ جائے سایہ ختم ہو جاتا ہے، اسی طرح مخلوقات کا وجود صرف سایہ ہے، اگر اللہ آفتاب یعنی انسانِ کامل کو خود میں چھپا لے تو مخلوقات کا وجود بھی ختم ہو جائے۔ بالآخر کائنات کا اختتام بھی یونہی ہے کہ ''ہر انتہا اپنی ابتدا کو لوٹ جاتی ہے''۔ جس انسانِ کامل کے نور سے تمام مخلوقات کے وجود کا سایہ تخلیق ہوا جب اللہ سے اپنی طرف سمیٹ لے گا جیسا کہ اللہ نے سورۃ الفرقان کی مذکورہ بالا آیت میں فرمایا، تو اسی وقت مخلوقات کے ظاہری وجودوں کا سایہ فنا ہو جائے گا اور باقی رہے گا صرف وجودِ حقیقی۔

واضح ہو کہ اس عبارت میں وجود کے نقطے یعنی نورِ محمدی ﷺ کے فراخ ہو کر مخلوقاتِ عالم کے وجود کے تخلیق ہونے کو جو ''سائے کے دراز'' ہونے سے تشبیہ دی گئی ہے اس سے یہ مراد ہرگز نہیں لی جا سکتی کہ موجوداتِ عالم نورِ الٰہی کا سایہ ہیں (نعوذ باللہ)۔ نور کا سایہ بننا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ محض ایک تشبیہ ہے جو بات سمجھانے کے لیے دی گئی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اصل وجود ذاتِ حق تعالیٰ کا ہی ہے اور موجودات اپنے وجود کے لیے اُس ذات کی محتاج ہیں جس طرح سایہ اپنے وجود کے لیے اصل وجود کا محتاج ہے۔ اصل وجود نہ ہو تو سایہ نہ ہو۔ لیکن سایہ بنے یا نہ بنے اصل وجود برقرار رہتا ہے۔ یہ نظریہ ''ہمہ اوست'' یا ''ہمہ از اوست'' ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: صوفیاء اشیاء کو حق تعالیٰ کے ظہورات جانتے ہیں اور اس کے اسماء و صفات کی جلوہ گاہ قرار دیتے ہیں۔ تنزل کے شائبہ اور تغیر و تبدل کے گمان کے بغیر۔ جس طرح سایہ شخص سے دراز ہوتا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سایہ شخص کے ساتھ متحد ہے اور عینیت

(ہو بہو ہونے) کی نسبت رکھتا ہے یا وہ شخص تنزل کر کے سایہ کی صورت میں ظاہر ہوا ہے بلکہ وہ شخص اپنے اصالت کی صرافت پر ہے[1] اور سایہ اس کے وجود میں آیا ہے۔ بے شائبہ تغیر و تبدل۔۔۔ اگرچہ بعض اوقات ایک جماعت جس نے اس شخص کے وجود کے ساتھ کمال کی محبت پیدا کر لی ہوتی ہے، اس کی نظر سے سایہ پوشیدہ ہو جاتا ہے اور اس شخص کے سوا ان کی نظر میں کوئی چیز مشہود نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے کہ ایسے لوگ کہیں کہ سایہ شخص کا عین (ہو بہو) ہے یعنی سایہ معدوم اور شخص موجود ہے اور بس۔ اس تحقیق سے لازم آیا کہ صوفیا کے نزدیک اشیاء حق تعالیٰ کے ظہورات ہیں، نہ کہ حق تعالیٰ کا عین۔ پس اشیاء حق سے ہیں نہ کہ حق جل شانہٗ ہیں۔ پس ان کے کلام ''ہمہ اوست'' کے معنیٰ ''ہمہ از اوست'' ہی ہیں۔'' (مکتوب نمبر 44۔ جلد دوم) (اقتباس از شمس الفقرا)

☆☆☆☆☆☆

فَهٰذِهِ النُّقْطَةُ الْبَآئِيَّةُ اِشَارَةٌ اِلَى النُّقْطَةِ الْوُجُوْدِيَّةِ وَ بَآءُ الْبِسْمِلَةِ اِشَارَةٌ اِلٰى اُمُّ الْكِتَابِ الثَّانِيْ وَهُوَ الْقَلَمُ وَلَارَيْبَ اَنَّهُ كَانَ فِيْهِ مُنْدَرَجًا وَالْبِسْمِلَةُ اِشَارَةٌ اِلٰى اُمِّ الْكِتَابِ الثَّالِثِ وَهُوَ الْعَرْشُ وَلَا شَكَّ اَنَّ الْعَرْشَ كَانَ مُنْدَرَجًا فِى الْعَقْلِ الَّذِيْ هُوَ الْقَلَمُ وَالْفَاتِحَةُ اِشَارَةٌ اَلَى الْكِتَابِ الْجَامِعِ وَهُوَ الْاِنْسَانُ وَلَا شَكَّ اِنَّ الْاِنْسَانَ قَبْلَ ظُهُوْرِهٖ كَانَ مُنْدَرَجًا فِىْ جَمِيْعِ الْمَرَاتِبِ كَانْدِرَاجِ الْكُلِّ فِيْهِ بَعْدَ ظُهُوْرِهٖ وَانْبِسَاطُ النُّقْطَةِ فِىْ ذَاتِهَا اِشَارَةٌ اِلَى الْكِتَابِ الْمُبِيْنِ الْاَوَّلِ وَانْبِسَاطُ الْبَآءِ بِالسِّيْنِ اِشَارَةٌ اِلَى الْكِتَابِ الْمُبِيْنِ الثَّانِيْ وَتَفْصِيْلُ حُرُوْفِ الْبِسْمِلَةِ وَتَدَاخُلُ

---

[1] یعنی اس کا اصل ذاتی وجود تو سائے سے پاک ہے البتہ سائے کا بننا اس کے وجود کی بدولت ہے۔

بَعۡضِهَا فِي الۡبَعۡضِ اِشَارَةٌ اِلَى الۡكِتَابِ الۡمُبِيۡنِ الثَّالِثِ وَ تَكۡرَارُ مَا فِي الۡبِسۡمِلَةِ فِي الۡفَاتِحَةِ وَتُضَاهِيۡ بَعۡضُهَا لِلۡبَعۡضِ اِشَارَةٌ اِلَى الۡكِتَابِ الۡمُبِيۡنِ الرَّابِعِ وَجَمِيۡعِ الۡقُرۡاٰنِ مِنَ الۡفَاتِحَةِ اِشَارَةٌ اِلَى مَرَاتِبِ الۡعَالَمِ وَاَجۡزَآئِهَا فَافۡهَمۡ۔

ترجمہ: پس باء کے نقطہ سے مراد وجود کا نقطہ ہے اور بسم اللہ کے باء سے مراد دوسری ام الکتاب ہے اور وہ قلم ہے اور بے شک وہ (یعنی قلم) نقطۂ وجود یہ میں مندرج (درج کی گئی ہے، داخل ہے) ہے اور بسم اللہ سے مراد تیسری اُم الکتاب ہے اور وہ عرش ہے اور بے شک عرش اس عقل میں مندرج ہے جس کو قلم کہتے ہیں اور فاتحہ کتابِ جامع یعنی انسانِ کامل کی طرف اشارہ ہے اور بے شک انسان اپنے ظہور سے قبل ان تمام مراتب میں اسی طرح مندرج تھا جیسے تمام مراتب بعد ظہور انسان میں مندرج ہیں۔ اور نقطہ کی اپنی ذات میں فراخی کتابِ مبین اول کی طرف اشارہ ہے اور باء کی فراخی سین کے ساتھ اشارہ ہے کتابِ مبین دوسری کی طرف اور بسم اللہ کے حروف کی تفصیل اور داخل ہونا بعض کا اس کے بعض میں اشارہ ہے کتابِ مبین تیسری کی طرف۔ اور بسم اللہ میں اور فاتحہ میں اس کی تکرار اور بعض کا بعض سے مشابہ ہونا اشارہ ہے کتابِ مبین چوتھی کی طرف۔ اور تمام قرآن کا فاتحہ میں جمع ہونا اشارہ ہے تمام مراتبِ عالم اور اس کے اجزاء کی طرف۔ پس اس سب کو سمجھ۔

شرح: انسان کا وجود مرتبۂ وحدت (عالمِ یاہوت) میں نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقطے سے دراز یا فراخ ہو کر عالمِ لاہوت، جبروت، ملکوت کے مراتب طے کرتے ہوئے عالمِ ناسوت میں مکمل ہوا اور یہ تمام مراتب پھر اسی کے وجود میں پوشیدہ ہو گئے جس طرح بیج مختلف مراتب طے کرتے ہوئے درخت کی صورت میں مکمل ہوتا ہے اور پھر اسی درخت کے پھل میں یہ بیج پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ عالمِ یاہوت، لاہوت، جبروت اور ملکوت میں سے ہر ایک کے لیے ایک ابتدا ہے اور ایک انتہا۔ جو مقام ایک مرتبہ کی انتہا ہے وہ اس سے اگلے مرتبے کے لیے ابتدا ہے۔ حضرت امام حسینؓ ہر مرتبے کی ابتدا کو اُم الکتاب کے نام سے موسوم کر رہے ہیں۔ اُم سے مراد ''ماں'' جس کے بطن میں اگلی نسل

پوشیدہ ہوتی ہے۔اُم الکتاب سے مراد سورۃ فاتحہ جس میں تمام قرآن پوشیدہ ہے، چنانچہ ہر مرتبے کی ابتدا ''ام الکتاب'' ہے جس میں اس مرتبے کی تفصیل پوشیدہ ہے اور ہر مرتبے کی انتہا کو ''کتابِ مبین'' کے نام سے موسوم کر رہے ہیں۔مبین سے مراد روشن، کھلی ہوئی۔ام الکتاب سورۃ فاتحہ میں پوشیدہ تمام علمِ الٰہی کی تفصیل کتابِ مبین قرآن کریم میں ظاہر ہوگئی۔اسی طرح ہر مرتبے کی ابتدا ام الکتاب ہے جس میں اس مرتبے کی تفصیل پوشیدہ ہے اور اس مرتبے کی انتہا کتابِ مبین ہے جہاں یہ تمام تفصیل کھل کر ظاہر ہوگئی۔اس مرتبے کی انتہا یعنی کتابِ مبین اگلے مرتبے کے لیے ابتدا یعنی ام الکتاب بنی جہاں اس نے مزید تفصیل حاصل کی اور اس تمام تفصیل کے ظاہر ہونے پر کتابِ مبین بن گئی۔یہ کتابِ مبین اگلے مرتبے کے لیے پھر ام الکتاب بنی۔یونہی ان چاروں مراتب کے لیے چار اُم الکتاب ہوئیں اور چار ہی کتابِ مبین ہوئیں اور ان کے مکمل ہونے پر کتابِ جامع یعنی انسانِ کامل کی تخلیق مکمل ہوئی۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ ان تمام مراتب کی تفصیل سورۃ فاتحہ کے مطابق اپنے اس قول کے حوالے سے بیان کر رہے ہیں جس میں انہوں نے فرمایا کہ تمام قرآن سورۃ فاتحہ میں ہے اور تمام سورۃ فاتحہ بسم اللہ میں پوشیدہ ہے اور بسم اللہ باء میں اور باء اپنے نقطہ میں پوشیدہ ہے۔وجود کی ابتدا یعنی پہلی اُم الکتاب نورِ الٰہی ہے جس سے پہلی کتابِ مبین یعنی نورِ محمدی یا قلم کا ظہور ہوا مرتبۂ وحدت کی ابتدا میں۔مرتبۂ وحدت کی انتہا پر یہ نورِ محمد یا قلم دوسری اُم الکتاب بنا اگلے مرتبہ واحدیت یا عالمِ لاہوت کے لیے۔یہاں یہ نورِ محمد اپنی ہی ذات میں فراخ ہوا اور اس سے ظہور ہوا روحِ قدسی کا اور قلم سے ظہور ہوا لوحِ محفوظ کا جو اس مرتبے کے لیے کتابِ مبین اور اگلے مرتبے کے لیے اُم الکتاب ہے۔جو شے جہاں سے ظاہر ہوتی ہے، ظہور سے قبل وہ وہیں پوشیدہ ہوتی ہے جیسے بچہ اپنے ظہور سے قبل ماں میں پوشیدہ ہوتا ہے اور درخت بیج میں۔یونہی نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے ظہور سے قبل نورِ الٰہی میں پوشیدہ تھا اور روحِ قدسی ظہور سے قبل نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں پوشیدہ تھی۔لہٰذا حضرت امام حسینؓ کے اس قول کی وضاحت ہوگئی کہ باء اپنے نقطہ میں پوشیدہ تھی۔جس نقطے کے

فراخ ہونے سے باء کی تشکیل ہوئی یہ اسی نقطے میں پوشیدہ تھی۔

روحِ قدسی جس سے تمام ارواح کا مادہ بنا، آغاز ہے موجوداتِ عالم کے وجود کا، اس لحاظ سے یہ ''بسم اللہ'' ہے جس سے ہر کام کی ابتدا ہوتی ہے۔ روحِ قدسی کا نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں پوشیدہ ہونا اس قول کی وضاحت کرتا ہے کہ ''بسم اللہ'' ''با'' میں پوشیدہ ہے۔ ''با'' ہی نے سین کے ساتھ مل کر ''بسم اللہ'' کو ظاہر کیا یعنی بسم اللہ ''با'' ہی سے ظاہر ہوئی جس کا مطلب یہ ہے کہ بسم اللہ ''با'' میں ہی پوشیدہ تھی۔

روحِ قدسی جو دوسرے مرتبے کی انتہا کے لیے کتابِ مبین ہے، تیسرے مرتبے کی ابتدا کے لیے اُم الکتاب ہے اور ترتیب کے لحاظ سے یہ تیسری اُم الکتاب ہے یعنی ''بسم اللہ'' تیسری اُم الکتاب ہے۔ اس بسم اللہ سے مکمل سورۃ فاتحہ ظاہر ہوئی۔ روحِ قدسی نے تفصیل کے تمام مراتب طے کئے اور اس سے تمام موجودات کی ارواح تخلیق ہوگئیں۔ روحِ قدسی اگر اُم الکتاب ہے تو یہ تمام ارواح کتابِ مبین ہیں۔ یوں تمام اروح کی تخلیق جس مرتبہ جبروت پر ہوئی وہ تیسری کتابِ مبین ہے کیونکہ یہ روحِ قدسی کی ہی تفصیل ہیں۔ ان ارواح نے روحِ قدسی سے ہی وجود حاصل کیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام ارواح روحِ قدسی میں ہی پوشیدہ تھیں۔ روحِ قدسی اگر بسم اللہ ہے تو یہ تمام ارواح سورۃ فاتحہ ہیں اور یہاں یہ قول واضح ہوگیا کہ سورۃ فاتحہ بسم اللہ میں پوشیدہ ہے یعنی تمام ارواحِ عالم روحِ قدسی میں پوشیدہ ہیں۔

ان ارواح میں ہر طرح کی مخلوق کی ارواح شامل ہیں اور اگر صرف انسانوں کو دیکھا جائے تو بھی ہر طرح کے انسانوں کی ارواح شامل ہیں خواہ وہ کافر ہوں، عیسائی، ہندو یا مسلمان۔ اسی لیے حضرت امام حسینؓ اس تیسرے مرتبے کو بسم اللہ کے حروف کی تفصیل قرار دیتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ ''داخل ہونا بعض کا اس کے بعض میں'' جس طرح حروف نقطوں کے ملنے سے ظاہر ہوتے ہیں اور الفاظ حروف سے اور پھر لفظ مل کر کلمے بنتے ہیں اور کلمے سورت۔ اسی طرح ایک روح ایک حرف ہے جو ایک نقطے یعنی نورِ الٰہی کے فراخ ہونے سے بنا۔ جس طرح تمام حروف میں سے بعض حروف مل کر ایک لفظ بناتے ہیں اور بعض حروف مل کر دوسرا لفظ اور بعض لفظ مل کر ایک کلمہ بناتے

ہیں اور بعض دوسرے لفظ مل کر دوسرا کلمہ بناتے ہیں۔ اسی طرح روحیں بھی مل کر گروہ اور جماعتیں بناتی ہیں اور یہ گروہ اور جماعتیں مل کر قومیں بناتے ہیں۔ بعض روحیں مل کر ایک قوم بناتی ہیں اور بعض مل کر دوسری قوم اور یوں جس طرح سورتیں مل کر تمام قرآن کی کتاب بناتی ہیں اسی طرح روحوں کی مختلف قومیں مل کر صفحۂ ہستی کی مکمل کتاب تخلیق کرتی ہیں۔ لیکن یہ تمام روحیں روحِ قدسی میں پوشیدہ ہیں اور روحِ قدسی نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اور نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نورِ الٰہی میں اور اسی ترتیب کے لحاظ سے تمام سورتیں سورۃ فاتحہ میں پوشیدہ ہیں، سورۃ فاتحہ بسم اللہ میں بسم اللہ باء میں اور باء اپنے نقطہ میں۔

سورۃ فاتحہ اور پورے قرآن میں حروف اور الفاظ کی تکرار بھی ہے اور الفاظ و حروف ایک دوسرے سے مشابہ بھی ہیں اور مختلف بھی۔ بالکل اسی طرح قوموں میں بعض پہلو ایک دوسرے سے مشابہ بھی ہیں اور بعض مختلف۔ یوں روحوں کا ظاہری وجود کے لبادوں میں قوموں اور گروہوں کی صورت میں اس دنیا میں ظاہر ہو جانا چوتھی کتابِ مبین ہے۔ جس طرح قرآن کریم چار مراتب طے کر کے اس دنیا میں ظاہر ہوا یعنی لوحِ محفوظ سے عرش پر اتارا گیا، عرش سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینے پر نازل کیا گیا، سینہ مبارک سے زبان مبارک پر آیا اور زبان مبارک کے ذریعے تمام دنیا میں ظاہر ہو گیا اسی طرح ارواحِ موجودات وجود کے چار مراتب طے کر کے دنیا میں ظاہر ہو گئیں۔ اب ان موجودات کے وجود کے اندر ہی وہ چاروں مراتب موجود ہیں جن کو طے کر کے وہ اس آخری مرتبے یعنی عالمِ ناسوت والے وجود تک پہنچیں۔ اس تمام سلسلے کو ایک آسان مثال کے ذریعے سمجھایا جا سکتا ہے کہ ایک طالبِ علم علم کے مختلف درجات طے کرتے ہوئے ایک خاص مقام تک رسائی حاصل کرتا رہا ہے۔ اب علم کے وہ تمام درجات اس کے اندر جمع ہو جاتے ہیں جنہیں وہ مختلف اوقات میں حاصل کرتا ہے۔ یہ علم ازل سے اس کے اندر ہی موجود تھا۔ دنیا کے ظاہری اسباب کے ذریعے اس علم کے حاصل کرنے کا مطلب اس کے دماغ کے اس پوشیدہ علم کا اس پر ظاہر ہو جانا ہے۔ یہ علم پہلے بھی اس کے اندر تھا اور ظاہر ہونے کے بعد بھی اس کے اندر ہی جمع

ہے۔ یوں ہی مخلوقاتِ عالم مختلف درجات طے کرتے ہوئے اپنے ظاہری وجود تک پہنچیں۔ اب یہ تمام درجات اور مراتب ان کی ذات کے اندر ہی جمع ہیں جس طرح قرآن کے تمام تر باطنی معنی اس کے ظاہری الفاظ کے اندر ہی جمع ہیں۔ ان باطنی معنوں تک رسائی کے لیے ان ظاہری الفاظ پر ہی غور و فکر کرنا ہوگا۔ اگر ظاہری الفاظ پر غور و فکر نہ کیا جائے تو باطنی معنوں کی سمجھ کبھی نہ آئے گی۔

اسی طرح عالمِ ناسوت میں ظاہر وجود کے اندر ہی تمام باطنی عالم اور مراتب جمع ہیں۔ عالمِ ناسوت وجود کی انتہا ہے اور عالمِ یاھوت اس وجود کی ابتدا۔ جیسا کہ آیت مبارک میں فرمایا گیا کہ انا للہ وانا الیہ راجعون بے شک ہم اللہ کی طرف سے ہیں اور اسی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں، تو اپنی ابتدا یعنی ذاتِ حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے لیے ہر وجود کو اپنی ہی ذات کے اندر ان تمام مراتب کو واپس طے کرنا ہوگا جن سے گزر کر اس نے اپنے ظاہری وجود کو حاصل کیا۔ تمام موجوداتِ عالم میں سے صرف انسان کو ہی یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اپنے عقل و شعور کی مدد، نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فیضان اور اپنے زمانے کے انسانِ کامل کے توسط اور وسیلے سے اپنے بالکل ابتدائی مقام یعنی عالمِ وحدت میں حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ دیگر مخلوقات کی تخلیق نچلے درجات پر ہوئی جیسا کہ فرشتوں کی تخلیق عالمِ جبروت میں ہوئی اور حیوانات و جمادات کی تخلیق عالمِ ملکوت میں ہوئی اس لیے ان مخلوقات کے انتہائی عروج کا مقام وہی ہے جہاں ان کی تخلیق ہوئی اور اس سے آگے ان کی رسائی ممکن نہیں جیسا کہ معراج کی شب حضرت جبرائیلؑ نے سدرۃ المنتہیٰ سے آگے جانے سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔ البتہ اللہ جسے چاہے فضیلت عطا کر سکتا ہے۔ مثلاً اصحابِ کہف کے کتے کو حیوانات میں خاص مقام عطا فرمایا۔ جمادات میں حجرِ اسود کو خاص رتبہ عطا فرمایا۔ یونہی جنات میں سے بھی اپنے قرب کی طلب رکھنے والوں کو ضرور ایک خاص مقام تک عروج عطا فرماتا ہے لیکن جو مقام انسانِ کامل کو حاصل ہے وہ کائنات کی کسی اور مخلوق کو حاصل نہیں۔

☆☆☆☆☆☆

وَاِذَا تُقَرِّرَ هٰذَا فَاعْلَمْ اَنَّ الْفَاتِحَةَ تَنْقَسِمُ عَلٰى ثَلٰثَةِ اَقْسَامٍ قِسْمٌ مُّتَعَلِّقٌ بِالْحَقِّ وَقِسْمٌ مُّتَعَلِّقٌ بِالْخَلْقِ وَقِسْمٌ جَامِعٌ بَيْنَهُمَا كَمَا رَوٰى اَبُوْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ قَالَ مَنْ صَلّٰى صَلٰوةً لَّمْ يَقْرَأْ فِيْهَا اُمُّ الْكِتَابِ فَهِيَ (خِدَاجٌ ثَلٰثًا) اَيْ غَيْرُ تَمَامٍ فَقِيْلَ لِاَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ اِنَّا نَكُوْنُ وَرَاءَ الْاِمَامِ قَالَ اِقْرَاْءَهَا فِيْ نَفْسِكَ۔

ترجمہ: اور جب ثابت ہو چکا یہ پس معلوم کر کہ بے شک فاتحہ تقسیم ہوتی ہے اوپر تین قسموں کے۔ ایک قسم اللہ سے متعلق ہے دوسری قسم خلقت کے ساتھ متعلق ہے اور تیسری قسم جامع ہے درمیان ان دونوں کے جیسا کہ روایت کیا ہے حضرت ابو ہریرہؓ نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہ فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ جس شخص نے پڑھی نماز اور نہیں پڑھا اس میں اُم الکتاب (فاتحہ) کو سو اس کی نماز ناقص ہے (یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین بار فرمایا)۔ پس کہا حضرت ابو ہریرہؓ نے کہ ہم امام کے پیچھے ہوتے ہیں، کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ پڑھا کرو اس کو اپنے دل کے اندر۔

شرح: اگر ہم قرآنی سورۃ فاتحہ پر غور کریں تو وہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ ذاتِ حق تعالیٰ سے متعلق ہے جس میں تین آیات الحمد للہ رب العالمین ○ الرّحمٰن الرّحیم ○ مالک یوم الدین ○ شامل ہیں۔ ان آیات میں ذاتِ حق تعالیٰ کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ الحمد میں سے اگر ''ل'' حذف کر دیا جائے تو ''احمد'' رہ جاتا ہے جو حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اشارہ ہے جو آغاز ہے ''وجود'' کا۔ تمام ''وجود'' کا دائرہ اس ''احمد'' یعنی حقیقتِ محمدیہ سے ''ل'' کی صورت ظاہر ہوا جیسا کہ پچھلے صفحات میں بیان کیا گیا ہے اور احمد کا وجود اللہ سے ظاہر ہوا یوں وجود کا آغاز ''الحمد للہ'' ہے جس سے تمام عالمین کی تخلیق ہوئی اور وہی ربّ العالمین ہے۔ الرحمٰن الرحیم سے مراد اس کے اسماء کی تجلیات ہیں جو تمام عالموں میں جاری وساری ہیں اور جن پر تمام

حیاتِ عالم کے کاروبار کا دارومدار ہے۔ مالك یوم الدین اس ساری کائنات کے وجود کے اختتام کے بعد بھی اس کے وجود کی بقا کی علامت ہے۔ سورۃ فاتحہ کی درمیانی آیت ایاك نعبد و ایاك نستعین بندے اور اللہ کے درمیانی تعلق کو ظاہر کرتی ہے اور یہ سورۃ فاتحہ کا دوسرا حصہ ہے جو بندے اور اللہ کے درمیان برزخ ہے۔ سورۃ فاتحہ کا تیسرا حصہ اهدنا الصراط المستقیم سے سورۃ کے اختتام تک ہے جو تمام کا تمام بندوں کے متعلق ہے۔ ان بندوں کے متعلق جو راہِ حق پر ہیں اور دوسرے وہ جو گمراہ ہیں۔ یعنی تین آیات صفات وحقائقِ الٰہیہ کے متعلق، تین آیات بندوں کی صفات کے متعلق اور ایک آیت اللہ اور بندوں کے درمیان تعلق کے متعلق۔

قرآنی سورۃ فاتحہ کی طرح انسان کی تخلیق کے مراتب بھی تین حصوں پر مشتمل ہیں (1) عالمِ امر جو تمام ذاتِ حق تعالیٰ سے متعلق ہے اور سورۃ فاتحہ کی پہلی تین آیات کی طرح اس کے بھی تین مقامات یا مراتب ہیں، احدیت (ھاھویت) وحدت (یاھوت) اور واحدیت (لاھوت)، (2) عالمِ خلق جو مخلوق سے متعلق ہے اور آخری تین آیات کی طرح اس کے بھی تین مراتب یا مقام ہیں جبروت، ملکوت اور ناسوت اور (3) برزخ یعنی انسانِ کامل جو ان دونوں (حق اور خلق) کے درمیان واسطہ اور وسیلہ ہے درمیانی آیت ایاك نعبد و ایاك نستعین سے متعلق ہے۔ یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی تین صورتیں یا حالتیں ہیں۔ ایک اس کا ظاہری وجود جس کا تعلق عالمِ خلق سے ہے، دوسرا اس کا باطن، قلب یا روحِ قدسی جس کا تعلق عالمِ امر سے ہے اور تیسری اس کی روحِ حیوانی ونورانی اور نفس جو برزخ کی طرح ہے اور جس کا تعلق ایک طرف سے دنیا سے ہے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ سے ہے۔

جب انسان اپنی ابتدا کی طرف یا اپنے رب تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو فرائض وسنن ونوافل کی ادائیگی، طلب وجستجو، غور وفکر، ذوق وہمت اور سب سے بڑھ کر مرشد کامل کی رہنمائی کے ذریعے ان تمام مراتب کو درجہ بدرجہ طے کرتے ہوئے عالمِ لاھوت میں اپنے رب کے حضور حاضر ہو جاتا ہے، اس کا دیدار کرتے ہوئے اس کی عبادت کرتا ہے۔ اسی لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام

نے فرمایا کہ جس نے نماز میں سورۃ فاتحہ تلاوت نہ کی اس کی نماز ناقص ہے یعنی جس نے سورۃ فاتحہ میں پوشیدہ مراتب کو نہ سمجھا، نہ جانا، نہ طے کیا، نہ بسم اللہ کی حقیقت سمجھی، نہ ''با'' یعنی انسانِ کامل کو پایا، نہ ہی ''با'' کے نقطے یعنی قلب انسانِ کامل کے توسط سے اپنی حقیقت، اپنی ابتدا نورِ محمدی ﷺ اور اپنی اصل روحِ قدسی کو عالمِ لاہوت تک پہنچ کر نہ پایا، اس نے اللہ کی بارگاہ تک رسائی نہ حاصل کی، نہ اس کی بارگاہ میں حضورِ قلب حاصل کیا پس اس کی نماز کامل کیسے ہو سکتی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا لا صلوٰۃ اِلا بحضور القلب حضورِ قلب کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

حضرت ابوہریرہؓ نے جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا کہ ہم تو امام کے پیچھے ہوتے ہیں یعنی نماز کی تلاوت تو امام کرتا ہے اور مقتدی خاموش رہتا ہے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حکم دیا کہ سورۃ فاتحہ کو دل میں پڑھ لیا کرو۔ اس حدیثِ مبارکہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگرچہ طالب مرید کو اس کا امام یعنی مرشد کامل ہی عالمِ ناسوت سے عالمِ لاہوت تک کے تمام مراتب طے کراتا ہے بلکہ حضرت سخی سلطان باھُوؒ کے قول کے مطابق کامل مرشد طالب کو یکدم برم کر کے ایک لمحے میں عالمِ ناسوت سے عالمِ لاہوت کے تمام مراتب طے کرا دیتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مرید کے ذمے کچھ فرائض نہیں اور تمام ذمہ داری مرشد کامل کی ہی ہے بلکہ جس طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سورۃ فاتحہ کی تلاوت کو مقتدی پر فرض قرار دیا خواہ وہ امام کے پیچھے ہی کیوں نہ نماز پڑھ رہا ہو، اسی طرح طالب مرید کی نماز یعنی قربِ الٰہی کو کامل بنانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ سورۃ فاتحہ کی طرح اپنی ذات میں پوشیدہ تمام عالموں کے مراتب کو طے کرنے کے لیے خود بھی ذوق و شوق، ہمت و جستجو کا مظاہرہ کرے۔ امام کی مکمل اطاعت و پیروی کے ساتھ ساتھ اپنے باطنی و ظاہری اعمال کو سنوارنے کے لیے خود کوشش کرے۔

☆☆☆☆☆☆

فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی قَسَمْتُ الصَّلٰوۃَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ نِصْفَیْنِ وَ

لِعَبْدِیْ مَاسَئَلَ فَاِذَا قَالَ الْعَبْدُ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ وَاِذَا قَالَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ وَاِذَا قَالَ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ وَاِذَا قَالَ الْعَبْدُ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی ھٰذَا بَیْنِیْ وَ بَیْنَ عَبْدِیْ وَ لِعَبْدِیْ مَاسَئَلَ وَ اِذَا قَالَ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی ھٰذَا لِعَبْدِیْ وَ لِعَبْدِیْ مَا سَئَلَ فَالْفَاتِحَۃُ مِنْ اَوَّلِھَا اِلٰی مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ط مُتَعَلِّقٌ بِالْحَقِّ الصِّرْفِ وَ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ مُتَعَلِّقٌ بِالْحَقِّ وَالْعَبْدِ وَمِنْ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ اِلٰی اٰخِرِ الْفَاتِحَۃِ مُتَعَلِّقٌ م بِالْعَبْدِ الصِّرْفِ۔

ترجمہ: اس لیے کہ میں نے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ میں نے نماز کو درمیان اپنے اور اپنے بندے کے دو حصوں میں تقسیم کیا سوال (وجواب) کی صورت میں۔ پس جس وقت کہتا ہے بندہ الحمد للہ رب العالمین (سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے) تو اللہ کہتا ہے میرے بندے نے میری تعریف کی ہے اور جب کہتا ہے الرحمن الرحیم (بخشنے والا مہربان ہے) تو اللہ کہتا ہے کہ میرے بندے نے میری صفت کی ہے اور جب کہتا ہے مٰلِکِ یوم الدین (روزِ جزا کا مالک ہے) تو اللہ کہتا ہے میرے بندے نے میری عزت کی ہے اور جب کہتا ہے بندہ کہ اِیاک نعبدُ وایاک نستعین (ہم تیری بندگی کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں) تو اللہ کہتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کے لیے (ہر) وہ چیز ہے جس کا وہ سوال کرے۔ اور جب وہ کہتا ہے اِھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم

ولا الضآلین (دکھا ہم کو سیدھا راستہ ان کا جن پر تو نے انعام نازل کیا نہ کہ ان کا جن پر تو ناراض ہو اور نہ گمراہوں کا) تو اللہ کہتا ہے کہ یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے کے واسطے ہے وہ چیز جس کا وہ سوال کرے پس فاتحہ اپنے آغاز سے لے کر مالك یوم الدین تک محض اللہ سے متعلق ہے اور ایاك نعبد و ایاك نستعین اللہ اور بندے (دونوں) سے متعلق ہے اور اھدنا الصراط المستقیم سے آخر تک صرف بندے سے متعلق ہے۔

شرح: جیسا کہ حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ ’’نماز مومن کی معراج ہے‘‘ یعنی نماز کے دوران مومن اپنے پروردگار سے اس عالم میں ملاقات کرتا ہے کہ دونوں کے درمیان کوئی تیسرا نہیں ہوتا۔ اس ملاقات میں دیدار کے ساتھ ساتھ رب اور عبد کے درمیان گفتگو کا سلسلہ بھی ہوتا ہے۔ بندہ نماز میں اپنے رب کی حمد وثنا کرتا ہے، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود وسلام بھیجتا ہے اور اپنے اور دیگر مومنین کے لیے دعا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے ادا کردہ ہر جملے کا لازماً جواب دیتا ہے اور مومن کی نماز کبھی اس سے خالی نہیں ہوتی۔ لیکن یہ حقیقی نماز جو اصل میں بندے اور رب کی ملاقات ہے، ہر مسلمان کو نصیب نہیں۔ نماز اور پروردگار سے ملاقات کے دوران بندے اور ربّ کے تعلق کی گہرائی بندے کے قربِ الٰہی کے مقام پر منحصر ہے۔ بشر خیر اور شر کا مجموعہ ہے۔ خیر اس کی ذات کے اندر ہی اللہ تعالیٰ کی صورت میں موجود ہے اور شر شیطان کی صورت میں۔ اگر انسان کی ذات کو ایک سیدھی لکیر کی مانند تصور کیا جائے تو اس کی ایک انتہا پر ذاتِ حق تعالیٰ ہے اور اس کی مخالف دوسری انتہا پر شیطان ہے۔ انسان کا ہر نیک عمل اور ہر نیک گمان وخیال اسے ایک ایک قدم کر کے اللہ کی طرف لے جاتا ہے اور ہر بُرا عمل اور بُرا گمان شیطان کی طرف لے جاتا ہے۔

انسان عموماً تین قسموں پر منقسم ہیں۔ ایک وہ جو شیطانی عمل کرتے کرتے اللہ سے بالکل دور اور شیطان کے بالکل قریب ہو چکے ہیں، اب نیکی کی کوئی بات ان پر اثر نہیں کرتی۔ دوسرے وہ جو نیک عمل اور نیک گمان کرتے کرتے اللہ کے انتہائی قریب اور شیطان سے بالکل دور ہو چکے ہیں اور قربِ الٰہی کے اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ شیطان کے ہر ضرر سے محفوظ ہو چکے ہیں اور تیسرے

وہ لوگ جو کبھی نیک عمل کر کے چند قدم اللہ کی طرف بڑھتے ہیں تو کبھی گناہ کر کے واپس شیطان کی طرف قدم بڑھاتے ہیں یوں وہ تمام عمر اِدھر سے اُدھر اور پھر اُدھر سے اِدھر چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ اللہ بھی اپنے بندوں سے ہم کلام ہوتا ہے اور ان کے ہر سوال کا جواب دیتا ہے اور شیطان بھی اپنے وسوسے انسان کے دل میں ڈالتا رہتا ہے۔ جو بندہ اللہ سے جتنا قریب ہوگا وہ اتنا ہی اس کے کلام کو سنے گا، اس کی بات کو سمجھے گا اور اپنے ہر سوال کا جواب پائے گا، یہ بندہ جتنا قربِ الٰہی میں ہوگا اتنا ہی شیطانی وسوسوں سے بچا رہے گا۔ دوسری طرف جو بندہ اللہ سے دور ہوگا وہ اللہ کے کلام کو نہ کبھی اپنے اندر سن پائے گا نہ اس کی بات سمجھ پائے گا حالانکہ اللہ اپنے اِس بندے کے سوالوں اور دعاؤں کا بھی جواب ضرور دے گا لیکن اللہ سے دوری کی بنا پر وہ کبھی انہیں سن نہیں پائے گا بلکہ شیطانی قرب کی وجہ سے ہمیشہ شیطانی سوچوں اور وسوسوں میں گھرا رہے گا۔ اور جو لوگ دونوں انتہاؤں کی درمیان ہیں وہ اگرچہ شیطانی وسوسوں سے کسی حد تک محفوظ رہیں گے لیکن اللہ سے دور ہونے کا نقصان یہ ہوگا کہ یہ لوگ بھی اپنی عبادات اور اپنی دعاؤں کے دوران اللہ کے دیئے گئے جوابوں اور اللہ کی اپنے بندوں سے کی گئی خوبصورت ہم کلامی سے محروم رہ جائیں گے۔ کبھی اللہ کی بات نہ سن سکیں گے نہ سمجھ سکیں گے۔ نماز ان کی معراج کبھی نہ بن سکے گی۔ اللہ تو اپنی بارگاہ میں کھڑے ہونے والے ہر بندے کے ہر سوال اور اس کی ہر عبادت کا جواب لازماً دیتا ہے لیکن ان باتوں کو سن پانا صرف ان لوگوں کی قسمت میں ہے جنہوں نے اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ ''بے شک میں نے اپنا چہرہ اُس (اللہ) کے چہرے کی طرف پھیر لیا'' کے مطابق دنیا اور دنیا کی ہر لذت و خواہش سے منہ موڑ کر اپنا رُخ صرف اور صرف اپنے پروردگار کی طرف کر لیا ہے۔ ایسے لوگ اپنی ہی ذات کے اندر اپنے رب سے گفتگو کرتے اور اپنی ہر بات کا جواب بالصواب پاتے ہیں جیسا کہ قرآن میں اللہ خود فرماتا ہے وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (سورۃ الشوریٰ۔51) ترجمہ: ''اور ہر بشر کی مجال نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے کلام کرے مگر یہ کہ وحی کے ذریعے یا پردے کے پیچھے سے یا کسی

فرشتے کوفرستادہ بنا کر بھیجے اوروہ اس کے اِذن سے جواللہ تعالیٰ چاہے وحی کرے، بے شک وہ بلند مرتبہ اورحکمت والا ہے''۔

وحی اور فرشتے کے ذریعے پیغام بھیجنے کا سلسلہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ختمِ نبوت کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے ختم ہوچکا لیکن مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ یعنی پردے کے پیچھے سے کلام کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے جس کے ذریعے اللہ اپنے دوستوں، ولیوں اور خلفاء سے کلام کرتا ہے اور اپنی بات ان کے دل میں ڈالتا ہے۔

حدیثِ پاک میں بھی فرمایا گیا کہ مَا مِنْ عَبْدٍ اِلَّا وَ سَیُکَلِّمُہٗ رَبُّہٗ لَیْسَ بَیْنَ الْعَبْدِ وَالرَّبِّ تَرْجُمَانٌ وَ لَا وَاسِطَۃٌ ترجمہ: ''ہر ایک (مومن) بندہ اللہ تعالیٰ سے کلام کرے گا اور اس وقت اللہ اور بندے کے درمیان کوئی ترجمان ہوگا نہ واسطہ''۔ (بخاری ومسلم)

اقبالؒ نے بھی فرمایا کہ:

گدائے جلوہ رفتی برسرِ طور
کہ جان تو زخود نا محرمے است

مفہوم: ''تو دیدار کا منگتا خدا کی تجلی کا طالب بن کر طور پر گیا کیونکہ تو خود سے انجان تھا۔ تجھ کو معلوم نہیں کہ جس تجلی کو تو طور پر ڈھونڈتا تھا وہ تیرے اندر موجود ہے''۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو اللہ سے کلام کرنے کے لیے کوہِ طور پر جانا پڑتا تھا لیکن امتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ایک صادق مسلمان کا ''طور'' اس کی ذات کے اندر ہے۔ اسے اللہ سے جو راز و نیاز اور کلام کرنا ہے وہ اپنی ذات کے اندر ہی کرسکتا ہے۔ پس نماز بھی اللہ اور بندے کے درمیان راز و نیاز ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے نماز کو دو حصوں میں تقسیم کیا اپنے اور اپنے بندے کے درمیان۔ یعنی جب بندہ نماز کی صورت میں اللہ کی حمد وثنا کرتا ہے یا اس سے دعا کرتا ہے تو اللہ بھی ساتھ ساتھ اس کی ہر بات اور سوال کا جواب دیتا رہتا ہے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہٗ کا فرمان ہے کہ ''میں تب تک سجدے سے سر نہیں اُٹھاتا جب تک اللہ کی طرف سے ''لبیک یا عبدی'' کی ندا نہیں سن لیتا''۔

حضرت امام حسینؓ بندے اور رب کی دورانِ نماز اس گفتگو کو سورۃ فاتحہ کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں کہ جب بندہ الحمد للہ کہتا ہے تو اللہ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد وثنا کی۔ دورانِ تلاوتِ فاتحہ اگرچہ زبان سے ہر نمازی الحمد للہ کے الفاظ ہی ادا کرتا ہے لیکن ہر ایک نمازی کی حمدِ الٰہی ایک جیسی نہیں ہوتی بلکہ ہر شخص اللہ کی حمد وثنا اپنی معرفت وقربِ الٰہی کے مقام کے مطابق کرتا ہے۔ جو شخص جس قدر ذاتِ الٰہی کی قدرت وعظمت کی معرفت رکھتا ہے وہ اسی لحاظ سے حمدِ الٰہی بیان کرتا ہے۔ معرفتِ الٰہی سے محروم ایک عام مسلمان عموماً الحمد للہ کے الفاظ غفلت سے اور روانی میں صرف تلاوت کی غرض سے ادا کرتا ہے اور اس غفلت میں وہ ہرگز حقیقی معنوں میں رب تعالیٰ کی حمد وثنا نہیں کرتا۔ اللہ فرماتا ہے کہ ''جب ایک بندہ مجھے غفلت سے یاد کرتا ہے تو میں اسے لعنت سے یاد کرتا ہوں'' پس اللہ سے کیا جواب بندے کو ملتا ہے یہ اس بندے کے اللہ سے تعلق کی گہرائی اور اخلاص پر ہی منحصر ہے۔ اللہ فرماتا ہے ''فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ ترجمہ: تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔'' جس خلوص اور محبت سے بندہ اللہ کو یاد کرے گا اس سے دس گنا بڑھ کر اللہ اسے خلوص ومحبت سے یاد کرے گا اور دوسری طرف غافل بندے کی طرف اللہ بھی نظر نہیں کرتا اگرچہ اس کی تمام دنیاوی ضروریات اسے مہیا کرتا رہتا ہے لیکن قربِ الٰہی میں ایسے غافل بندوں کا کوئی حصہ نہیں۔

الحمد للہ کے معنی ہیں سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے چنانچہ جب ایک مسلمان کسی بھی انسان یا مخلوق کی کسی بھی خوبی یا حسن کی تعریف کرتا ہے تو درحقیقت وہ اللہ ہی کی تعریف کرتا ہے کیونکہ ہر مخلوق کی ہر خوبی اور حسن اس میں موجود ذاتِ حق تعالیٰ کے نور کی بدولت ہے وہی ہر شے کی ہر خوبی کی وجہ ہے اسی لیے ہر تعریف کا اصل حق دار بھی وہی ہے، مخلوق نہیں۔ عام لوگوں کی نظر مخلوقات اور اشیاء کے ظاہری اجسام پر ہوتی ہے اس لیے وہ ان اشیاء اور مخلوقات کی تعریف کرتے ہیں نہ کہ اللہ کی اور اپنی خوبیوں پر بھی فخر وغرور اختیار کرتے ہیں یہ سمجھ کر کہ ہماری ہر خوبی ہماری اپنی پیدا کردہ ہے۔ ایسے تکبر اور غفلت کے ساتھ ان کا الحمد للہ کے الفاظ ادا کرنا بے معنی، بیکار اور بے فائدہ

ہے۔ لیکن معرفت وقربِ الٰہی سے فیض یاب اولیاء اللہ کی نظر سے ظاہری اجسام کے پردے ہٹ چکے ہوتے ہیں اس لیے اگر وہ زبان سے کسی شے کی تعریف بھی کریں تو حقیقتاً دل سے وہ صرف اللہ کی قدرت کی حمد وثنا کر رہے ہوتے ہیں۔ ایک عام مسلمان تو صرف پانچ وقت مقرر کر کے نماز ادا کرتا اور تلاوتِ فاتحہ کرتا ہے وہ بھی غفلت بھرے دل سے، لیکن اولیاء اللہ دائمی نماز کی حالت میں ہوتے ہیں چنانچہ وہ جب بھی تمام عالموں میں ذات وصفاتِ حق تعالیٰ کے حسن وقدرت کے جلوے دیکھ کر عش عش کر اُٹھتے ہیں، وہ اپنی دائمی نماز میں الحمد للّٰہ کی تلاوت کرتے ہیں جس کے جواب میں اللہ ان سے راضی ہو کر ان کی اس حمد وثنا کو سراہتا ہے کہ میرے سچے اور خالص بندے نے میری قدرت کے مشاہدے کے بعد میری حقیقی ثنا کی۔ ایسا بندہ خود بھی اللہ کے ہاں تعریف کا حق دار ٹھہرتا ہے کہ جس نے محبت وذوقِ الٰہی کے باعث قرب کے درجات طے کیے اور حق تعالیٰ تک رسائی حاصل کر کے اس کی حقیقی حمد وثنا کی توفیق حاصل کی۔ قرب کے یہ درجات اس نے اپنی ذات کو ذاتِ حق تعالیٰ میں فنا کر کے حاصل کیے۔ اپنی ذات پر تجلیاتِ الٰہی کی شدت کو سہا، اس کی محبت میں ہر نعمت سے منہ موڑا اور پھر یہ مقام حاصل کیا کہ صحیح ڈھنگ سے ''الحمد للّٰہ'' ادا کر سکے۔ بے شک اللہ اپنے ایسے محبّ کی حمد وثنا کا جواب حمد وثنا سے ادا کرتا ہے۔

ایسے خالص مومن ہی ''رب العالمین'' کے حقیقی معنی بھی سمجھتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ عام مسلمان زمین وآسمان کا خالق ومالک تو اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں لیکن اپنی ذات اور اس سے وابستہ اشیاء اور رشتوں کا مالک خود کو سمجھتے ہیں۔ جب خود کو یا اپنی ذات سے جڑے رشتوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے، یا اللہ کی عطا کی ہوئی کوئی نعمت ان سے چھین لی جاتی ہے تو ان کے دل اعتراض سے بھر جاتے ہیں کہ ہماری فلاں چیز ہم سے چھن گئی یا ہمیں فلاں تکلیف پہنچائی گئی۔ اگر حقیقتاً اللہ کو اپنا ربّ اور اپنی ہر شے کا مالک مانتے تو کبھی کسی عمل پر اعتراض نہ کرتے۔ دلوں میں افعالِ الٰہی پر اعتراض بھر کر زبان سے ''رب العالمین'' کہیں بھی تو کیا فائدہ۔ ''ربّ العالمین'' کے الفاظ حقیقی معنوں میں وہی بندۂ الٰہی ادا کر سکتا ہے جس نے اللہ کو دنیا وآخرت، آسمانوں زمینوں اور عالموں کا رب ماننے سے

پہلے اپنا رب مانا، اپنا اور اپنی ذات سے وابستہ ہر شے کا اصل مالک جانا، جس حال میں اس نے رکھا راضی رہے، جو دیا لے لیا، جو واپس لیا خوشی خوشی دے دیا۔ وہ بھوکا رکھے، بیمار رکھے، تنہا رکھے، قرب دے، دور کرے، جہنم میں ڈالے یا جنت میں، اس کی رضا کہ وہ مالک ہے۔ ایک مسلمان جب سچے دل سے اللہ کو اپنا رب اور مالک مانے گا تو ہی باطن میں یہ مشاہدہ حاصل کر سکے گا کہ عالمِ ناسوت ہو یا ملکوت، جبروت ہو یا لاھوت ہر عالم کا ربّ وہ ہے، جہاں پہنچو اسی کی تجلیات کا ڈیرہ ہے۔ اسی کے جلوے، اسی کی قدرت کا نظارہ ہے۔ اس بات میں تو کسی مسلمان کو کوئی شک نہیں کہ تمام ظاہری عالموں کا رب اللہ ہے حتیٰ کہ عیسائی و یہودی بھی یہ مانتے ہیں کہ دنیا و آخرت کا رب اللہ ہے۔ حقیقتاً ''رب العالمین'' کے معنی صرف وہی سمجھے گا جو اپنے باطن میں قرب و معرفتِ الٰہی کے درجات طے کرتے ہوئے اپنے ان باطنی عالموں میں بھی اس کی قدرت کا مشاہدہ کرے گا اور دیکھ پائے گا کہ مجھے اٹھانے والا، بٹھانے والا، سلانے والا جگانے والا، کھلانے والا پلانے والا صرف وہی ایک اللہ ہے۔ زبان سے یہ سب ادا کرنا نہایت آسان ہے لیکن اپنی باطنی بصیرت سے اس سب کا مشاہدہ کر کے حقیقتاً دل سے کہنا بہت مشکل۔ جب بندہ حقیقی مشاہدے کے بعد سچے دل سے اللہ کو ہی ہر ظاہر باطن، اول آخر، زمین آسمان، عالمِ ظاہر و عالمِ باطن کا رب مان لیتا ہے تو ہی اپنا آپ حقیقتاً اپنے مالک کے حوالے کر دیتا ہے اور تب ہی صحیح طور پر ''رب العالمین'' کے الفاظ ادا کرتا ہے، صرف پانچ وقتی نماز میں نہیں بلکہ ہر وقت اپنی دائمی نماز میں۔ اس کے دل سے کسی لمحے یہ خیال اوجھل نہیں ہوتا کہ میں ایک بندہ یعنی ایک عاجز غلام ہوں اور میرا ایک مالک ہے جس کو میں اپنے ہر عمل اور ہر خیال کے لیے جواب دہ ہوں صرف تب ہی وہ اپنے ہر عمل اور ہر خیال کی پاکیزگی کی حفاظت کرتا ہے۔ ہر لمحے خود کو عاجز اور اپنے رب کو قادر ماننے والا ہی رب العالمین کے الفاظ کو حقیقی معنوں میں ادا کرتا ہے۔

الحمد للہ رب العالمین میں بندہ ''ذاتِ حق تعالیٰ'' کی تعریف کرتا ہے جبکہ الرحمن الرحیم میں ''صفاتِ حق تعالیٰ'' کی، جیسا کہ تنزلاتِ ستہ یعنی نزولِ حق تعالیٰ کے مراتب میں پہلے عالم

لاھوت میں ذاتِ حق تعالیٰ کا اظہار ہوا اور پھر عالمِ جبروت میں صفاتِ حق تعالیٰ کا۔ پہلی تجلی ذاتی ہے دوسری صفاتی۔ اسی طرح سورۃ فاتحہ میں بھی پہلی آیت ذات سے متعلق ہے دوسری صفات سے متعلق ہے۔ صفات ذات سے الگ کوئی چیز نہیں ہیں۔ صفات ذات سے ہی منسلک ہیں۔ صفات ذاتِ حق تعالیٰ میں ظہور سے قبل بھی موجود تھیں لیکن صفات کے اظہار کے لیے مخلوق کا وجود ضروری ہے۔ یعنی وہ رحیم تب ہی کہلائے گا یا اس کی صفت رحمت تبھی ظاہر ہوگی جب ایسا کوئی وجود ہوگا جس پر رحمت کی جائے۔ اسی طرح اس کی صفت قہار تب ہی ظاہر ہوگی جب وہ کسی وجود کو اپنی قہاری سے فنا کرے گا جیسا کہ ایک عورت میں ماں ہونے کی صفت ہمیشہ سے موجود ہوتی ہے لیکن وہ ماں تب تک نہیں بنتی جب تک ایک وجود اس سے پیدا ہو کر اسے ماں نہ بنائے۔ یعنی یہ صفت اس کے وجود میں تھی لیکن اس کے اظہار کے لیے ایک دوسرا وجود ضروری تھا۔

صفاتِ الٰہیہ اگرچہ ذات سے ایک ہی دم میں اکٹھی ظاہر ہوئیں لیکن اللہ کے فرمان کہ ''میری رحمت ہر شے پر حاوی ہے'' کے مطابق صفاتِ رحمت دیگر تمام صفات پر حاوی اور محیط ہیں اس لیے سورۃ فاتحہ میں صفاتِ الٰہیہ کے تذکرہ میں الرحمٰن اور رحیم کے ذکر میں تمام صفات کو سمیٹ دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے تمام مخلوقات کو وجود عطا کیا۔ رحمت دو طرح کی ہے رحمتِ عامہ اور رحمتِ خاصہ۔ رحمتِ عامہ تمام مخلوقات کے لیے عام ہے اور اس کا مظہر اسم رحمٰن ہے جبکہ رحمتِ خاصہ خاص الخاص بندوں یعنی مومنین کے لیے ہے اور اس کا مظہر اسم رحیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو اپنی ذات سے وجود عطا کر کے ان پر احسان کیا۔ کوئی کیڑا مکوڑا ہو یا درندہ، درخت ہو یا پہاڑ، مسلمان ہو یا کافر، گنہگار ہو یا مومن، اپنے اسمِ رحمٰن کی تجلی سے وہ ہر موجود شے پر رحمت کرتا ہے خواہ وہ اللہ کو مانے اور اس کی اطاعت کرے یا نہ کرے۔ اسمِ رحمٰن سے ہی وہ کافروں کو بھی رزق عطا کرتا اور ان کی دعاؤں کو سنتا اور قبول کرتا ہے۔ چونکہ اسمِ رحمٰن سے جاری رحمت جمیع مخلوقات پر اللہ کا احسان ہے اس لیے یہ رحمتِ امتنائی کہلاتی ہے۔ احسان اس لیے بھی کہ یہ مخلوقات اس رحمت کے بدل میں اپنے وجود عطا کرنے والے کا نہ ٹھیک سے شکر ادا کر پاتے ہیں،

نہ صحیح طور پر حمد وثنا کر پاتے ہیں جس کا وہ حقدار ہے اور نہ ہی اس کی محبت میں کچھ قدم بڑھا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی ان تمام کمزوریوں کو جانتے ہوئے بھی انہیں وجود عطا کرتا ہے، زندگی عطا کرتا ہے، رزق عطا کرتا ہے، ان کی خواہشات پوری کرتا ہے اور بدلے میں ان سے کچھ طلب نہیں رکھتا چنانچہ اس کی یہ رحمت سراسر ان پر احسانِ الٰہی ہے۔ کسی مخلوق کی اتنی مجال نہیں کہ وہ اللہ کی حمد اس کی شان کے مطابق ادا کر سکے سوائے انسانِ کامل محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے، اور جو اللہ نے قرآن پاک میں یہ فرمایا کہ ''زمین وآسمان کی ہر شے اللہ کی تسبیح کر رہی ہے'' تو یہ تسبیح بھی وہ مخلوق نہیں کر رہی بلکہ ان کا اصل' ان کا مبداء نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی کر رہا ہے یا یوں کہا جائے کہ وہ ذات اپنی حمد خود کر رہی ہے کہ کسی دوسرے کو اس کی کامل معرفت و پہچان حاصل ہی نہیں لہٰذا کوئی دوسرا اس کی حمد اس کی شان کے مطابق نہیں کر سکتا۔ یعنی عابد بھی وہ اور معبود بھی وہ، ساجد بھی وہ مسجود بھی وہ، حامد بھی وہ محمود بھی وہ۔ چنانچہ اس نے جو کچھ بھی مخلوق کو عطا کیا اس دنیا و آخرت میں وہ سراسر اس کا اپنے اسمِ رحمٰن کی تجلیات کے ذریعے مخلوقات پر احسان ہے اور مخلوقات کے اعمال کا اس میں کچھ حصہ نہیں۔

جبکہ اسمِ رحیم سے جاری رحمتِ خاصہ اللہ نے اپنے خاص بندوں یعنی مومنین کی بندگی، محبتِ الٰہی اور اس کی خاطر کئے گئے نیک اعمال کی جزا کے طور پر خود پر واجب کر لی ہے۔ قربِ الٰہی کے درجات طے کرتے ہوئے ان مومنین کو تجلیاتِ الٰہیہ کی اس شدت کو سہنا ہوتا ہے جس سے کوہِ طور بھی ریزہ ریزہ ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو گئے۔ چنانچہ ان تجلیات کو سہنے، اپنے نفس کو مارنے اور شیطان سے لڑنے کے لیے جو قوت مومنین کو درکار ہے وہ اسمِ رحیم سے انہیں حاصل ہوتی ہے۔ یہ اللہ کا فضل اور خاص مدد ہے مومنین کے لیے جس کے ذریعے وہ قربِ الٰہی کی طلب رکھنے والوں کے درجات بلند کرتا ہے۔ یہ مومنین کی محبت کا وہ بدل ہے جو اللہ نے خود پر واجب کر لیا ہے اس لیے یہ رحمتِ وجوبی کہلاتی ہے۔ اللہ مومنین کی اس رحمتِ وجوبی سے مدد نہ فرماتا تو وہ کبھی صرف اپنے اعمال و عقائد یا عشق و محبت کے سبب سے قربِ الٰہی حاصل کرنے کے لائق نہ ہو پاتے جیسا کہ اللہ فرماتا ہے کہ ''یہ فضلِ الٰہی ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے''۔ مومنین کے لیے

رحمتِ امتنائی بھی ہے کیونکہ وہ اللہ کی مخلوق میں شامل ہیں اور رحمتِ وجوبی بھی کیونکہ انہوں نے دنیا وعقبیٰ کی طلب چھوڑ کر صرف اللہ کی طلب کی جبکہ باقی تمام مخلوق کے لیے صرف اسمِ رحمٰن کی رحمتِ امتنائی یا رحمتِ عامہ ہے اور اسمِ رحیم کی رحمتِ وجوبی یا رحمتِ خاصہ میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔

فصوص الحکم میں ہے کہ ''رحمتِ امتنائی اسمِ رحمٰن کی صفت اور رحمتِ وجوبی اسمِ رحیم کی صفت ہے۔ اسمِ رحمٰن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جمیع کائنات کو اپنی ذات سے پیدا کیا۔ یہ رحمتِ عامہ ہے پس اسمِ رحمٰن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جمیع مخلوق پر احسان (امتنان) کیا۔ اسمِ رحیم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے طبقۂ مومنین کو اپنی رحمتِ خاصہ وجودیہ سے نوازا اور ان کو اعمالِ صالح کی توفیق بخشی۔ ان مومنین پر امتثالِ امرِ الٰہی (یعنی تعمیلِ حکم) واجب ہے اور اللہ تعالیٰ پر ان کے اعمالِ صالح کی جزا میں رحمت واجب ٹھہری۔ اسمِ رحمٰن کے مظاہر جمیع مخلوقات ہیں اور اسمِ رحیم کے مظاہر مومنین، اولیاء کرام اور انبیاء علیہم السلام ہیں اور یہ رحمتِ وجوبی رحیمی بھی رحمتِ امتنائی رحمانی سے ہے۔ رحمتِ وجوبی کسی عمل کی جزا یا عمل کے ثواب کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے مگر چونکہ حق تعالیٰ ہر عمل کرنے والے کی ہویت (اصل حقیقت) ہے اور وہی فاعل حقیقی ہے اس لحاظ سے وہ رحمت جو حق تعالیٰ نے خود پر واجب فرمائی ہے حقیقتاً اس سے ہے، اسی کے لیے ہے۔ اس کا غیر ہے کون جس کے لیے وہ رحمت واجب فرمائے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ پر جزائے عمل کو واجب کر لیا ہے تو یہ واجب کر لینا بھی ایک قسم کا امتنان (احسان) ہے کیونکہ کسی غیر نے اس کو واجب نہیں کیا اور نہ کسی غیر کے لیے یہ رحمت واجب ہوئی۔ (فصوص الحکم والایقان)

سورۃ فاتحہ کی تیسری آیت میں جب بندہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کہتا ہے تو وہ قدرتِ الٰہی کا اقرار کرتا ہے اور اس کا یہ اقرار بھی اس کی معرفتِ الٰہی کے بقدر ہوگا۔ جس قدر اس نے قدرتِ الٰہی کا مشاہدہ و معرفت حاصل کی ہوگی اسی قدر یقین سے وہ اس کا اقرار کرے گا۔ قدرتِ الٰہی کا تعلق اعمال وافعالِ الٰہی سے ہے۔ تنزلاتِ ستہ میں تیسرے مرتبے پر عالمِ جبروت میں اعمال و افعالِ الٰہی کا اظہار ہوا اور اسی مناسبت سے سورۃ فاتحہ کی تیسری آیت میں بندہ قدرتِ الٰہی کا اقرار

یہ کہہ کر کرتا ہے کہ ”وہی روزِ جزا کا مالک ہے“۔ اللہ کی قدرت اللہ کے افعال سے ظاہر ہوتی ہے جو وہ اس کائنات کے نظام کو چلانے کے لیے کرتا ہے۔ مالک سے مراد حاکم، شدید القوت، ہر شے پر قادر۔ مالك يوم الدين سے مراد کہ تمام موجودات پر اس کا تصرف آخرت کے اس لمحے تک قائم ہے جب تک ان موجودات کا وجود قائم ہے۔ صوفیاء کرام ”یوم“ سے مراد تجلی الٰہی بھی لیتے ہیں۔ تجلیات کا تعلق چونکہ باطن سے ہے اور ظاہر میں ان کا مشاہدہ ممکن نہیں اس لیے ”یوم“ سے مراد تنزیہہِ حق تعالیٰ ہے یعنی ہر شے کے باطن میں تجلیاتِ ذات وصفاتِ حق تعالیٰ کی موجودگی کی وجہ سے وہ شے حیات، بصر، سمع، علم اور دیگر صفات سے متصف ہے۔ تنزیہہ کے معنی یہ ہیں کہ ہر شے کا باطنی وجود تجلیاتِ ذاتِ حق تعالیٰ کی بدولت قائم ہے اور یہی معنی ہیں ”یوم“ یعنی تجلیات کا مالک ہونے کے۔ دین کا تعلق ظاہری اعمال سے ہے اس لیے دین سے مراد توحیدِ تشبیہی ہے یعنی ہر شے ذات وصفاتِ حق تعالیٰ کا اظہار ہے۔ تنزیہہ سے مراد باطن، تشبیہ سے مراد ظاہر اور مالك يوم الدين سے مراد کہ وہ یوم (تمام باطنی تجلیات) کا بھی مالک ہے اور دین (ظاہری اعمال) کا بھی، تنزیہہ یعنی باطن بھی وہ اور تشبیہ یعنی ظاہر بھی وہ اور ہر شے کے ظاہر و باطن کا مالک، اس پر قادر صرف وہی ذاتِ حق تعالیٰ ہے۔

سورۃ فاتحہ کی پہلی تین آیات کا تعلق حقائقِ الٰہیہ اور عالمِ امر سے ہے۔ چوتھی آیت اياك نعبد و اياك نستعين برزخ ہے عالمِ امر اور عالمِ خلق میں کیونکہ یہ آیت بندے اور رب کے درمیان تعلق کو جوڑتی ہے اور اس کا تعلق حقائقِ الٰہیہ اور کونیہ دونوں سے ہے جبکہ آخری تین آیات کا تعلق

فاتحہ کی سب آیات اللہ نے اس طرح سے نازل کی ہیں کہ جیسے بندہ اللہ کو مخاطب کر کے اس کی حمد اور اس سے دعا کر رہا ہو، حالانکہ یہ آیات نازل اللہ نے کیں اور بندے کا اس میں کچھ عمل دخل شامل نہیں کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ سورۃ فاتحہ کی یہ آیات نازل نہ کرتا تو کسی بندے کی مجال نہ تھی کہ ایسی ایک بھی آیت بنا لیتا۔ تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان آیات میں اللہ خود بندے کی زبان سے خود کو ہی

مخاطب کرر ہا ہے اور اپنے ہی متعلق بیان کرر ہا ہے کہ ''سب حمد تمام عالموں کے رب کے لیے ہے، وہی رحمٰن ورحیم ہے وہی روزِ جزا کا مالک ہے'' اور خود ہی فرمار ہا ہے کہ ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔'' بات اللہ کی ہے اور ادا بندے کی زبان سے ہو رہی ہے چنانچہ اپنا اصل حامد بھی وہ خود ہے اور طالب بھی۔ خود ہی کہنے والا اور خود ہی سننے والا، خود ہی تقاضا کرنے والا اور خود ہی اس کو پورا کرنے والا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ خود ہی عبد ہے اور خود ہی رب ہے (نعوذ باللہ)، کیونکہ عبد عبد ہے اور رب رب ہے۔ البتہ عبد کی اصل حقیقت، اس کا باطن، اس کا مبدا ذاتِ حق تعالیٰ ہے اور جب ایک خاص عبد اپنی اس اصل حقیقت تک پہنچ کر اس کو پہچان لیتا ہے اور خود کو اس میں فنا کر لیتا ہے تو یہ ذات اس کا ظاہر بھی ہو جاتی ہے تب وہ ''عبد'' اور ''ھو'' کا جامع ہو جاتا ہے اور ایاك نعبد و ایاك نستعین کی حقیقت کو سمجھ پاتا ہے کہ یہاں کون عابد ہے کون معبود، کون طالب ہے کون مطلوب، کون عبد ہے کون رب۔ اس کی ذات میں ہی عبودیت اور ربوبیت کے تمام اسرار تکمیل پاتے ہیں اور یہ ''عبد'' جو خود اس عبودیت اور ربوبیت کا جامع ہے، جو ایک جہت سے ''عبد'' اور ایک جہت سے ''ھو'' ہے، جو ایک رخ سے مانگنے والا اور ایک رخ سے دعا کا سننے والا ہے صرف انسانِ کامل ہے جیسا کہ علامہ ابنِ عربی فرماتے ہیں ''انسانِ کامل کی حقیقت ربوبیت وعبودیت کی جامع ہے۔ ذات ایک ہے اس کی شانیں دو ہیں۔ ایک شان کا نام عبودیت ہے دوسری شان کا نام ربوبیت ہے۔'' (فصوص الحکم والایقان)

چنانچہ جس طرح انسانِ کامل برزخ ہے عبودیت اور ربوبیت کے درمیان، عالمِ امر اور عالمِ خلق کے درمیان اسی طرح یہ آیت ایاك نعبد و ایاك نستعین بھی برزخ ہے۔ انسانِ کامل بھی واسطہ اور وسیلہ ہے بندے اور رب کا تعلق جوڑنے والا اور یہ آیت بھی چنانچہ ایاك نعبد و ایاك نستعین سے مراد انسانِ کامل کی ذات ہے۔

اللہ کے ایسے کامل اکمل ولی جو ذاتِ حق میں فنا ہو کر 'ھو' کے ساتھ 'ھو' ہو گئے، جو عبودیت و ربوبیت کے جامع ہو گئے، جن کا باطن وظاہر صرف وہی ایک ذات ہو گئی ان سے مدد مانگنا، ان کی

حقیقت یعنی اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنا ہے اور یہ شرک کے زمرے میں ہرگز نہیں آتا جیسا کہ ایاك نعبد و ایاك نستعین سے بعض اوقات مراد لی جاتی ہے کہ صرف اللہ ہی سے مدد مانگنا جائز ہے اور کسی اور سے مدد مانگنا شرک ہے۔ بے شک اللہ کے غیر سے مدد مانگنا شرک ہے لیکن جو ذات اللہ کی ذات کے سمندر میں فنا ہو کر خود سمندر ہو گئی وہ اللہ سے غیر کہاں رہ گئی۔ ایسے کامل اکمل اولیاء سے استعانت طلب کرنا حق ہے۔ صدرالافضل سید محمد نعیم الدین مرادآبادی ایاك نعبدوایاك نستعین کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''پہلی تین آیات میں ذکرِ ذات وصفات کے بعد ایاك نعبد فرمانا اشارہ ہے کہ اعتقادِ عمل پر مقدم ہے اور عبادت کی مقبولیت عقیدے کی صحت پر موقوف ہے۔ نَعْبُدُ (ہم تیری عبادت کرتے ہیں) کے صیغہ جمع (ہم) سے ادا بجماعت بھی مستفاد ہوتی ہے اور یہ بھی کہ عوام کی عبادتیں محبوبوں اور مقربوں کی عبادت کے ساتھ درجۂ قبول پاتی ہیں۔ اس میں ردِشرک بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کسی کے لیے نہیں ہوسکتی۔ وایاك نستعین میں یہ تعلیم فرمائی کہ استعانت (مدد) خواہ بواسطہ ہو یا بے واسطہ ہر طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ حقیقی مستعان (مدد کرنے والا) وہی ہے باقی آلات وخدام واحباب وغیرہ سب عونِ الٰہی[1] کے مظہر ہیں۔ بندے کو چاہیے کہ اس پر نظر رکھے اور ہر چیز میں دستِ قدرت کو کارکن دیکھے۔ اس سے یہ سمجھنا کہ اولیاء وانبیاء سے مدد چاہنا شرک ہے عقیدۂ باطلہ ہے کیونکہ مقربانِ حق کی امداد امدادِ الٰہی ہے، استعانت بالغیر نہیں۔ اگر اس آیت کے معنی وہ ہوتے جو وہابیہ نے سمجھے تو قرآن پاک میں اَعِیْنُوْ بِقُوَّۃٍ اور اِسْتَعِیْنُوْ بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ کیوں وارد ہوتا اور احادیث میں اہلِ اللہ سے استعانت کی تعلیم کیوں دی جاتی''۔

مندرجہ بالا شرح طلب عبارت میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ بیان فرما رہے ہیں کہ ''جب بندہ ایاك نعبد و ایاك نستعین کہتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کے لیے ہے وہ چیز جس کا اس نے سوال کیا۔'' یعنی اللہ اپنے ہر بندے کی بات سنتا اور اس کی ہر طلب کو پورا کرتا ہے۔ اب یہ بندے پر ہے کہ وہ اللہ سے کس چیز کا

---

[1] مدد

سوال کرتا ہے، دنیا یا عقبیٰ کا یا خود ذاتِ حق تعالیٰ کے قرب کا۔ دنیا و آخرت میں بندے کو جو کچھ ملتا ہے وہ حقیقتاً اسکی اپنی طلب اور کوششوں کے مطابق ملتا ہے۔ جو شخص جس شے کی جتنی شدت سے طلب کرتا ہے اور اس کے حصول کے لیے جتنی کوشش کرتا ہے اللہ بالآخر اسے وہ ضرور عطا کر دیتا ہے۔ فصوص الحکم میں علامہ ابنِ عربی رحمتہ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں: ''حق تعالیٰ نے جو کچھ ہمارے لیے حکم فرما دیا ہے وہ ہمارے اعیانِ ثابتہ کے تقاضا کی وجہ سے ہے بلکہ علمِ الٰہی میں ہم خود ہی اپنے اوپر حکم کرنے والے ہیں کیونکہ عالم کو علم معلوم ہی نے عطا کیا ہے۔ ہماری استعدادات نے زبانِ حال سے جو مانگا حق تعالیٰ جوادِ حقیقی نے عطا کر دیا۔ اگر کسی نے زہر مانگا تو عطا کر دیا، تریاق مانگا تو عطا کر دیا، کفر مانگا تو عطا کر دیا، اسلام مانگا تو عطا کر دیا۔ جوادِ حقیقی رب تعالیٰ کی طرف سے عطا ہی عطا ہے۔ مانگنے والے ہم خود ہیں گویا ہم خود ہی اپنی استعدادات کے مطابق حکم کر رہے ہیں اس لیے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے حجتِ بالغہ ہے۔'' (فصوص الحکم)۔ پس روزِ آخرت کوئی بندہ اللہ پر اعتراض نہ کر سکے گا کہ تو نے ہمارے ساتھ ایسا کیوں کیا یا ہمیں خود سے دوری یا قرب کی حالت میں کیوں رکھا۔ اللہ اس دن ان پر یہ حقیقت کھول دے گا کہ اللہ نے انہیں اسی حال میں رکھا جس کی طلب ان کی ارواح نے کی تھی۔ اس دن ان کی ہر حجت باطل ہو جائے گی اور صرف اللہ تعالیٰ کی حجت کامل ہوگی۔

اھدنا الصراط المستقیم سے آخر سورۃ تک تینوں آیتیں حقائقِ کونیہ یعنی عالمِ خلق اور مخلوق سے متعلق ہیں اور ان تینوں آیتوں کا دعائیہ صورت میں ہونا واضح کرتا ہے کہ مخلوق عاجز و بے بس ہے۔ از خود کسی مخلوق کے لیے ممکن نہیں کہ وہ صراطِ مستقیم کو پا سکے جب تک کہ اسے مدد و توفیقِ الٰہی حاصل نہ ہو البتہ اس کی طلب کرنا بندے کے بس میں ہے اور اسی طلب کی ترغیب اللہ اس آیت اھدنا الصراط المستقیم میں دے رہا ہے کہ مجھ سے سیدھا راستہ طلب کرو میں ضرور دکھاؤں گا۔ اس دعا کی قبولیت کا وعدہ اللہ نے خود قرآن میں ان آیات کی صورت میں کیا کہ:

ترجمہ: ''اور جو ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم انہیں خود تک پہنچنے کا راستہ (صراطِ مستقیم) سُجھا

دیتے ہیں'' (سورۃ عنکبوت۔69) اور فرمایا ترجمہ: ''وہی (اللہ) انہیں اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لے آتا ہے''۔ (البقرہ۔257)

صراطِ مستقیم وحدت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ صراطِ مستقیم خود واحد ہے۔ حقائقِ کونیہ یعنی مخلوق سے متعلق حقائق بیان کرتے ہوئے پہلے صراطِ مستقیم یعنی وحدت کا ذکر ظاہر کرتا ہے کہ پہلے مخلوق وحدت میں تھی اور پھر اس میں اختلاف پیدا ہوا جیسا کہ اللہ فرماتا ہے: ''وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْ (سورۃ یونس۔19) ترجمہ: ''اور لوگ ایک ہی اُمت تھے پھر مختلف ہوئے''۔ ''اُمت'' سے یہاں مراد ان کا واحد ہونا یا وحدت میں ہونا ہے۔

یوں ایک ہی مبدا اور منبع یعنی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پیدا ہونے والی ارواح وحدت سے اختلاف کی طرف گامزن ہوتے ہوئے دو مختلف گروہوں میں تقسیم ہوئیں جن کا تذکرہ اگلی دو آیات میں ہے۔ ایک انعام یافتہ گروہ جو جمالِ الٰہی کا مظہر ہے جس کا ذکر صراط الذین انعمت علیھم میں ہے اور دوسرا گروہ گمراہ اور غضب یافتہ گروہ جو جلالِ الٰہی کا مظہر ہے جس کا ذکر غیر المغضوب علیھم ولاالضالین میں ہے۔ یہ آیات ذاتِ حق تعالیٰ کے وحدت سے کثرت کی طرف سفر کو ظاہر کرتی ہیں کہ ذاتِ حق تعالیٰ جو سورۃ فاتحہ کے آغاز میں اپنی ذات وصفات کی حمد کرتے ہوئے یکتا و واحد ہے، تنزلاتِ ستہ کے مراتب طے کرتے ہوئے جب عالمِ امر سے عالمِ خلق میں ظاہر ہوا تو اس نے عالمِ امر میں اپنی وحدت کے برعکس عالمِ خلق میں کثرت کو پسند فرمایا۔

پہلی تین آیات وحدت سے متعلق ہیں اور آخری تین آیات کثرت سے متعلق ہیں اور ان کی درمیانی آیت ایاک نعبد و ایاک نستعین دونوں کی جامع یا دونوں میں برزخ ہے۔ چنانچہ سورۃ فاتحہ کی سات آیات تنزلاتِ ستہ ہی کی طرح نزولِ حق تعالیٰ کا بیان ہیں البتہ ترتیب میں فرق یوں ہے کہ تنزلاتِ ستہ کا ساتواں مرتبہ یعنی انسانِ کامل جسے كُنْتُ كنزاً مخفياً فَاَرَدْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ ذاتِ سرّ چشمۂ چسمان'' میں ''ذاتِ سر چشمۂ چشمان'' سے موسوم کیا گیا، کو سورۃ فاتحہ کی چوتھی آیت میں ایاک نعبد و ایاک نستعین سے منسوب کیا گیا۔

تخلیقِ آدم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫O ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ O (التین۔5،4) ترجمہ: ’’ہم نے انسان کو احسن صورت میں تخلیق کیا اور پھر اسے اسفل السافلین کی طرف اتار دیا۔‘‘ سورۃ فاتحہ بھی انسان کی اسی تخلیق کا بیان ہے۔ پہلی تین آیات میں اس ’’احسن صورت‘‘ کا بیان ہے اور پھر اسفل السافلین کی طرف نزول کرتے ہوئے آخری آیت غیر المغضوب علیھم ولاالضالین میں اسفل السافلین کی آخری انتہا کا ذکر ہے اور حدیثِ قدسی کنت کنزاً مخفیاً میں یہی مرتبہ ’’فَخَلَقۡتُ الۡخَلۡقَ‘‘ میں بیان کیا گیا ہے۔

سورۃ فاتحہ کی آخری آیات میں اللہ تعالیٰ نے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت طلب کرنے والوں کے لیے صراطِ مستقیم کی نشاندہی فرما دی کہ صراطِ مستقیم اصل میں وہی راہ ہے جس پر تمہارے بزرگ اولیاء اور اللہ کے مقرب لوگ چلے جن پر اس نے اپنے قرب و دیدار کا انعام نازل کیا۔ صراطِ مستقیم درحقیقت ان مقرب لوگوں کی پیروی اور اتباع کی راہ ہے جو وحدت کی طرف سفر کرتے ہوئے اللہ واحد کے ساتھ واحد ہو گئے۔ پس جس کو صراطِ مستقیم کی تلاش ہے وہ ایسے محبوبینِ الٰہی کو تلاش کرے اور پھر ان کے دامن سے وابستہ ہو کر ان کے نقشِ قدم پر چلے۔ ان انعام یافتہ لوگوں کا نقشِ قدم ہی صراطِ مستقیم ہے اور جو ان کے خلاف ہے وہ مغضوبین اور ضالین یعنی غضب یافتہ گمراہ لوگوں کی راہ ہے۔ جس نے ان انعام یافتہ لوگوں کی راہ کو ٹھکرایا اس نے صراطِ مستقیم کو ٹھکرایا اور خود بھی گمراہیوں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں انعام یافتہ لوگوں کی وسیع اصطلاح استعمال کر کے اپنے قرب کے حامل تمام لوگوں کو اس میں شامل کر لیا ہے جن میں انبیاء و اولیاء و صدیقین سب شامل ہیں۔ اگر انعام یافتہ گروہ سے صرف انبیاء مراد لینا مقصود ہوتا تو اللہ واضح طور پر فرماتا کہ ’’انبیاء کی راہ پر چلا‘‘۔ اکثر لوگ اولیاء اللہ کے اعلیٰ مقام اور ان کی پیروی کا رد کرتے ہوئے صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیروی اور اتباع کو جائز اور اولیاء کے اتباع کو ناجائز قرار دیتے ہیں حالانکہ اولیاء کی راہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی راہ سے جدا ہے ہی نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی راہ کا اتباع کر کے ہی تو وہ اللہ کے قرب

کے لائق بنے اور انعام یافتہ کہلائے۔ ان کا اتباع اصل میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اتباع ہی ہے کیونکہ یہ تمام انعام یافتہ گروہ ایک ہی صراطِ مستقیم پر ہے۔ وہ صراطِ مستقیم عشق و دیدارِ الٰہی کی راہ ہے۔ ظاہری اعمال میں تھوڑا بہت فرق ہو سکتا ہے کہ ہر ایک کے اظہارِ محبت کے انداز جدا جدا ہوتے ہیں لیکن باطنی عقائد ایک ہی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی اپنی ذات عشقِ الٰہی اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تپش سے فنا ہو چکی اور جو اپنی اصل حقیقت حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یعنی وحدت تک پہنچ چکے اور اب نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی ان کی حقیقت ہے۔ ان کے ظاہری اجسام کے لباس میں اصل وجود خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ہے جیسا کہ علامہ ابنِ عربیؒ فرماتے ہیں ''ہر زمانہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ازل سے ابد تک اپنا لباس بدلتے رہتے ہیں اور اکمل افراد کی صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی جلوہ نما ہوتے ہیں'' (فصوص الحکم)۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''تمہارے درمیان صورتاً کوئی نبی موجود نہیں ہے تاکہ تم اس کا اتباع کرو۔ پس جب تم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متبعین کا اتباع کرو گے جو کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حقیقی اتباع کرنے والے اور اتباع میں ثابت قدم تھے تو گویا تم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اتباع کیا۔ جب تم ان کی زیارت کرو گے تو گویا تم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زیارت کی۔ (الفتح الربانی۔ مجلس ۱۴)

علامہ ابنِ عربی رحمتہ اللہ علیہ فصوص الحکم میں فرماتے ہیں کہ ''قیامت کے روز ہر کسی پر رازِ توحید فاش کر دیا جائے گا کہ درست عقیدہ وہی ہے جو اولیاء اللہ کا ہے۔'' اولیاء کا عقیدہ صراطِ مستقیم اس لیے بھی ہے کہ انہوں نے کبھی فرقہ بندی کی بات نہیں کی۔ سب صرف اللہ سے تعلق کی درستگی اور قلب کی صفائی پر زور دیتے ہیں۔

پس ایسے کامل اولیاء کا اتباع نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اتباع ہے اور اب جبکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ظاہری نبوت اختتام پذیر ہو کر باطنی نبوت میں تبدیل ہو گئی تو ان اولیاء کا اتباع ہم پر واجب ہو گیا جن میں یہ باطنی نبوت پائی جاتی ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا کہ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ (سورۃ النساء۔59) ترجمہ: ''اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اطاعت کرو اور اس کی جو تم

میں سے صاحبِ امر ہو۔'' صاحبِ امر سے مراد دنیاوی حکمران ہرگز نہیں ہو سکتے کیونکہ ان میں سے کثرت ان کی ہے جو نبی اکرم ﷺ کا اتباع کرنے والے نہیں ہیں، ان کی اطاعت نبی اکرم ﷺ کی اطاعت کے خلاف ہوگی اور نہ ہی یہ لوگ ''انعام یافتہ گروہ'' میں شامل ہیں۔ اولی الامر وہی ولی کامل ہے جو خود نبی اکرم ﷺ کا کامل اتباع کرنے والا ہے، اس کی راہ وہی ہے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہے۔ اس کا اتباع نبی اکرم ﷺ کا اتباع اور نبی اکرم ﷺ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ یہی صراطِ مستقیم ہے، یہی انعام یافتہ لوگوں کا رستہ اور یہی وہ رسی ہے جس کو اللہ نے مضبوطی سے تھامنے کا حکم دیا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا فرمان ہے کہ ''اگر سورۃ فاتحہ کی شرح لکھوں تو ستر کتابوں میں لکھی جائے۔'' ستر کا عدد محض کثرت کی طرف اشارہ ہے ورنہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے صرف بسم اللہ کی تفسیر بیان کرنے میں رات سے صبح کر دی تھی۔ سورۃ فاتحہ میں معنی در معنی تمام عالمین کے حقائق پوشیدہ ہیں جن کی شرح وتفسیر مکمل طور پر بیان کرنا ممکن نہیں۔ صوفیاء کرام اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس سورۃ کی شرح کرتے آئے ہیں لیکن اس کی شرح و بیان مکمل نہ ہو سکا نہ ہی ہو سکتا ہے چنانچہ ہم یہاں اس کی شرح کا اختتام کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

وَلِتَحْقِيْقِ هٰذِهِ الْاَقْسَامِ الثَّلَاثَةِ رَسَمْنَا دَائِرَةً وَّقَسَّمْنَاهَا بِقِسْمَيْنِ بِسَبَبِ خَطٍّ مَّارٍّ بَيْنَهُمَا وَجَعَلْنٰهَا قِسْمًا لِلْحَقِّ وَقِسْمًا لِّلْعَبْدِ وَقِسْمًا جَامِعًا لَّهُمَا وَهِيَ هٰذِهِ۔

ترجمہ: ان تینوں اقسام کی تحقیق کے لیے ہم نے ایک دائرہ کھینچا ہے اور اس کو دو قسم میں تقسیم کیا ہے اس خط کے ذریعے جو گزرتا ہے ان دونوں کے درمیان اور کیا ہم نے اس ایک قسم کو واسطے اللہ کے اور دوسری قسم واسطے بندے کے اور تیسری قسم جامع واسطے ان دونوں کے اور وہ یہ ہے:۔
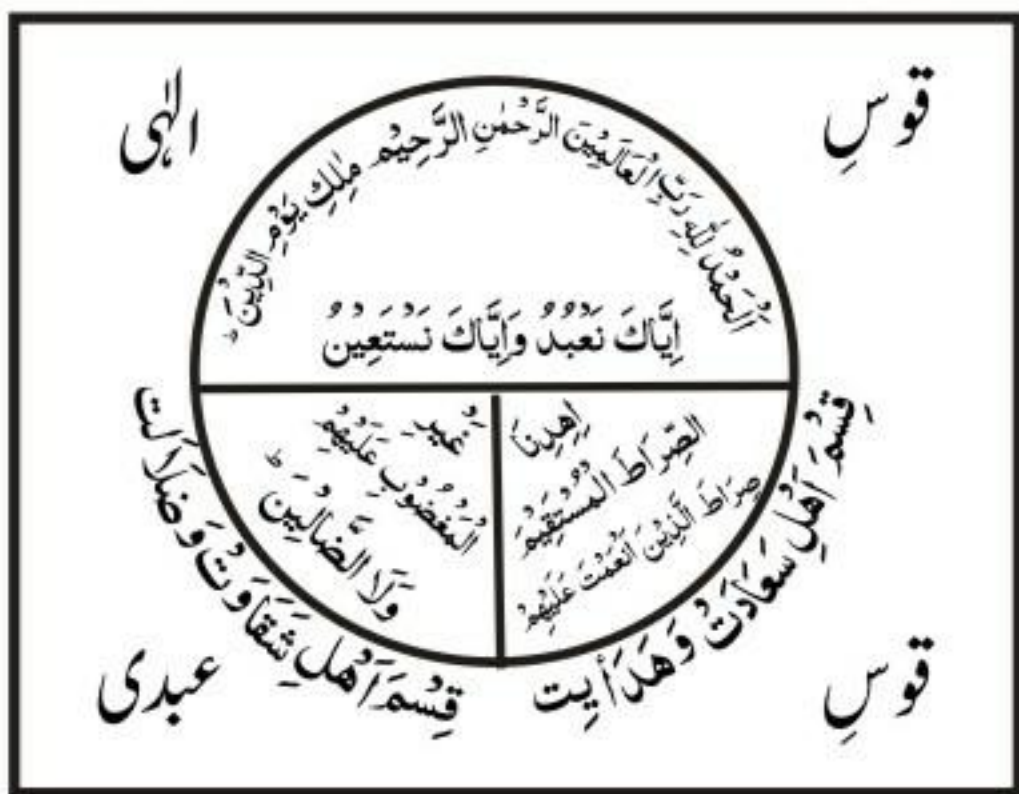
وَاَعْلَمْ اَنَّ ھٰذِہِ الدَّآئِرَۃُ الْکُلِّیَّۃُ مُشْتَمِلَۃٌ عَلٰی جَمِیْعِ الْمَوْجُوْدَاتِ جَبَرُوْتِہَا وَمَلَکُوْتِہَا وَبَرْزَخٍ جَامِعٍ وَّمُلْکِہَا فَمَا یَتَعَلَّقُ بِالْحَقِّ مِنْہَا یُسَمّٰی بِالْجَبَرُوْتِ وَمَا یَتَعَلَّقُ بِالْعَبْدِ یَنْقَسِمُ قِسْمَیْنِ قِسْمٌ سُمِّیَ بِالْمَلَکُوْتِ وَقِسْمٌ سُمِّیَ بِالْمُلْکِ فَاِنَّ لِلْعَبْدِ رُوْحًا وَّجِسْمًا رُوْحُہٗ شَامِلٌ لِلْمَلَکُوْتِ وَجِسْمُہٗ شَامِلٌ لِلْمُلْکِ وَمَا یَتَعَلَّقُ بِالْحَقِّ وَالْعَبْدِ مَعًا سُمِّیَ بِالْحَقِیْقَۃِ الْکُلِّیَّۃِ الْاِنْسَانِیَّۃِ وَالْقِسْمُ الَّذِیْ یَتَعَلَّقُ بِالْعَبْدِ کَمَا قُسِّمَ قِسْمَیْنِ وَسُمِّیَ کُلُّ قِسْمٍ بِاِسْمٍ کَذٰلِکَ خُصِّصَ قِسْمٌ بِاَہْلِ السَّعَادَۃِ وَالْھِدَایَۃِ وَھُوَ مِنْ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ اِلٰی اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ وَقِسْمٌ بِاَہْلِ الشِّقَاوَۃِ وَالضَّلٰلَۃِ وَھُوَ مِنْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ اِلٰی وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔

ترجمہ: جاننا چاہیے کہ یہ دائرہ کلیہ جبروت، ملکوت، ملک اور برزخ کی تمام موجودات پر مشتمل ہے۔ جو کچھ متعلق ہے حق سے اسے جبروت کہتے ہیں اور جو کچھ متعلق ہے عبد سے اس کی دو اقسام

ہیں ایک قسم کو ملکوت اور ایک قسم کو مِلک کہتے ہیں اس لیے کہ عبد کے واسطے روح اور جسم ہے۔ اس کی روح شامل ہے واسطے ملکوت کے اور جسم اس کا شامل ہے واسطے مِلک کے اور وہ جو متعلق ہے ساتھ اللہ اور بندے دونوں کے اس کا نام رکھا گیا ہے حقیقتِ کلیہ انسانیہ۔ جو قسم عبد سے متعلق ہے اس کی پہلے ہی دو قسمیں ہو چکی ہیں اور ہر قسم کا ایک نام رکھا گیا ہے یعنی ملک اور ملکوت۔ ایسے ہی اس کی دو قسمیں اور ہیں ایک قسم اہلِ سعادت اور ہدایت ہیں جن کا بیان اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ تک ہے اور ایک قسم اہلِ شقاوت اور ضلالت جس کا بیان غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ سے وَلَا الضَّالِّيْنَ تک ہے۔

شرح: سورۃ فاتحہ نزولِ ذاتِ حق تعالیٰ اور ظہورِ الٰہی کے تمام مراتب کا بیان ہے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ نے طالبانِ معرفت کی سہولت کے لیے سورۃ فاتحہ کی آیات میں بیان کردہ ان تمام مراتب کو انتہائی فراست کے ساتھ ایک دائرہ جو خطوط[1] کے ذریعے تقسیم کیا گیا ہے، کی صورت میں دکھایا ہے جس کی مدد سے سورۃ فاتحہ کی عبد اور ربّ کے درمیان تقسیم کو مزید آسانی اور وضاحت کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے، پہلی تین آیات جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے ظہور کے ساتھ ہے، کو دائرے کے اوپر والے نصف حصے میں رکھا گیا ہے، آخری تین آیات کو نیچے والے نصف حصے میں اس طرح رکھا گیا ہے کہ اس کے مزید دو حصے کیے گئے ہیں جس میں انسانوں کی دو حصوں میں تقسیم کو ظاہر کیا گیا ہے۔ دائرے کو دو حصوں میں تقسیم کرنے والا خط سورۃ فاتحہ کی درمیان والی آیت ایاك نعبد و ایاك نستعین کو ظاہر کرتا ہے جو برزخ اور تعلق ہے اللہ اور بندے کے درمیان۔

نزول کے تنزلاتِ ستہ میں سے پہلے تین مراتب، مراتبِ حقی کہلاتے ہیں کیونکہ ان میں صرف ظہورِ ذات وصفاتِ حق تعالیٰ ہے اور ابھی خلق کی صورت ظاہر نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے احدیت (الحمد للّٰہ رب العالمین) میں اپنی تنہا ذات سے وحدت یعنی حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم (الرحمٰن الرحیم) میں قدم رکھا اور پھر واحدیت (مالك یوم الدین) کی طرف نزول کیا

---

[1] سیدھی لکیریں

جہاں اس ذات کے انوار وتجلیات اور اسماء وصفات کا اظہار ہوا۔ یہاں ابھی خلق کی تخلیق نہیں ہوئی۔ دائرۂ حیات کے اس نصف حصے کو مندرجہ بالا عبارت میں ''جبروت'' کہا گیا ہے۔ جبروت کے معنی 'جوڑنے والا' یا 'جڑا ہوا' کے ہیں۔ چونکہ یہاں ذاتِ حق تعالیٰ وحدت کی صورت میں ہے، ابھی کثرت ظاہر نہیں ہوئی، اگرچہ اسماء کے انوار ظاہر ہو گئے ہیں لیکن ان میں بھی پھیلاؤ نہیں بلکہ وحدت اور یکجائی ہی ہے اس لیے اسے جبروت کہا گیا۔

دائرہ کا نچلا حصہ انسانوں کے متعلق ہے۔ جس طرح ایک انسان واحد ہو کر بھی واحد نہیں بلکہ ظاہر اور باطن، جسم اور روح کا مرکب ہے اسی لحاظ سے انسانوں سے متعلق اس نصف دائرے کو مزید دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ روح کا تعلق ملکوت سے ہے اور جسم کا تعلق مِلک سے یعنی اس دنیا اور عالمِ ناسوت سے ہے۔ انسان کے باطن اور ظاہر، روح اور جسم کی اس تقسیم کو اس دائرے میں اہلِ سعادت (وہ لوگ جو صراط مستقیم پر چلے) اور اہلِ شقاوت (وہ لوگ جو گمراہ ہوئے) کی صورت میں علیحدہ علیحدہ دکھایا گیا ہے۔ اہلِ سعادت اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ لوگ ہیں جن کی نظر دنیا سے ہٹ کر آخرت اور عقبیٰ کی طرف ہو گئی ہے، جبکہ اہلِ شقاوت اہلِ ظاہر ہیں جن کا تعلق حق تعالیٰ سے نہ ہو کر صرف اس دنیا اور اس کے ظاہر تک محدود ہے۔ اہلِ سعادت اہلِ روح ہیں کیونکہ ان کی روح ان کے جسم پر اور ان کا باطن ان کے ظاہر پر حاوی آ چکا ہے جبکہ اہلِ شقاوت اہلِ جسم ہیں کیونکہ ان کی روح ان کے جسموں میں مغلوب ہے اور ان کا ظاہر ان کے باطن پر حاوی ہے۔ اہلِ سعادت حق تعالیٰ کے جمال کے مظہر ہیں اور اہلِ شقاوت اللہ تعالیٰ کے جلال کے مظہر۔ اللہ کے انوارِ جلال و جمال اوپر والے نصف دائرے جو مراتبِ حقی کو ظاہر کرتا ہے، میں اکٹھے یا جامع ہیں اس لیے اسے جبروت کہا گیا ہے جبکہ نچلے نصف دائرے میں، جو مراتبِ خلقی کا بیان ہے، میں جدا جدا یا علیحدہ علیحدہ ظاہر ہو گئے ہیں۔ جمالِ حق تعالیٰ کے مظہر اہلِ سعادت کا تعلق ملکوت سے ہے کیونکہ وہ فرشتوں سی لطافت و نورانیت حاصل کر کے اس عالمِ ناسوت یا عالمِ ظاہر دنیا سے بلند ہو کر عالمِ ملکوت تک پہنچ گئے ہیں کیونکہ ان کی روح ان کے جسموں

پر حاوی ہے جبکہ جلالِ حق تعالیٰ کے مظہر اہلِ شقاوت اسی عالمِ ناسوت میں قید ہیں۔

اہلِ شقاوت کو اگرچہ اس عالمِ ناسوت میں گنہگاران میں شامل کیا جاتا ہے لیکن ان کا وجود کائنات میں اتنا ہی ضروری ہے جتنا اہلِ سعادت کا، کیونکہ اگر اہل شقاوت نہ ہوں تو اہلِ سعادت کی سعادت کی قدر و قیمت معلوم نہ ہو سکے۔ جس طرح اگر اندھیرا نہ ہو تو روشنی کی قیمت معلوم نہ ہو، اگر غم نہ ہو تو خوشی کی کوئی قدر نہ ہو۔ اہلِ شقاوت کا وجود بھی حق تعالیٰ سے ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے جلال کے مظہر ہیں۔ اس لیے اگر آخرت میں انہیں عذاب بھی ملے گا تو وہ بھی اللہ کی رحمت کی ہی ایک صورت ہوگی۔ نارِ جہنم سے ان کے وجود میں موجود غیر ماسویٰ اللہ جل کر راکھ ہو جائے گا، غیریت (کہ ان کا وجود اللہ سے غیر کوئی وجود ہے) کا وہم اُٹھ جائے گا اور پھر ان کے وجود میں بھی ذاتِ حق تعالیٰ ظاہر ہو جائے گی۔ فصوص الحکم میں شیخ ابنِ عربی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

❁ حق تعالیٰ دوزخیوں کو دوزخ میں اس لیے بھیجے گا تاکہ وہ عذاب کے باعث رب تعالیٰ کو یاد کریں۔ دنیا میں وہ یادِ حق سے غافل تھے لیکن دوزخ میں پہنچتے ہی وہ ذاکر ہو جائیں گے۔ اگر غافل ذاکر بن جائیں تو وہ عذاب اُس راحت سے ہزار درجہ بہتر ہے جو بندہ کو حق تعالیٰ سے غافل کر دے پس عذابِ آخرت میں بھی رحمت پوشیدہ ہے۔ (فصوص الحکم والایقان)

سیّد عبدالکریم بن ابراہیم الجیلی رحمتہ اللہ علیہ ''انسانِ کامل'' میں بیان فرماتے ہیں:

❁ معلوم کرنا چاہیے کہ دوزخیوں کو دوزخ میں لذت ہوگی جیسے کہ اس شخص کو لڑائی جھگڑے میں لذت آتی ہے جو اس کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ بہت سے لوگ لڑائی میں لذت پاتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ اس میں تکلیف پا رہے ہیں، لیکن ربوبیت جو ان کے نفس میں پوشیدہ ہے ان امور میں خوض[1] کرنے پر ان کو آمادہ کرتی ہے۔ پھر ان کے لیے ایک اور لذت بھی ہے جو خارش والوں کی لذت کے مشابہ ہے کہ اگرچہ کھجلا کھجلا کر اس کا بدن کٹ جاتا ہے اور چھل جاتا ہے مگر وہ اس کو کھجلانے میں لذت پاتا ہے اور وہ عذاب و لذت کے مابین ہوتا ہے۔ اور ان

---

[1] غور و فکر۔ سوچ بچار

دوزخیوں کے لیے ایک اور لذت بھی ہے جو اس جاہل کی لذت کے مشابہ ہے جو اپنی رائے پر نازاں ہوتا ہے اگرچہ وہ خطا پر ہی ہو''۔ (انسانِ کامل)

فرمایا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس واسطے نہیں بھیجے گئے کہ وہ شقی لوگوں کو سعید بنا دیں۔ اگر ایسا ہوتا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ابوجہل کو ضرور مومن بنا دیتے۔ بلکہ اس واسطے بھیجے گئے تاکہ وہ آ کر صرف آواز دے دیں اور اہلِ سعادت الگ ہو جائیں اور اہلِ شقاوت الگ۔ اہلِ سعادت ازل سے ہی اہلِ سعادت ہیں اور اہلِ شقاوت ازل سے ہی اہلِ شقاوت ہیں اور ابد تک یہی صورتحال رہے گی۔ لہٰذا دنیا میں بھی وہ اپنے اپنے گروہ میں ہی رہتے ہیں جس میں تبدیلی کی کوئی صورت نہیں۔ دنیا میں انبیاء و اولیاء کے ذریعے دی جانے والی دعوتِ حق کو صرف اہلِ سعادت ہی قبول کریں گے اور اہلِ شقاوت کبھی قبول نہ کریں گے۔

مندرجہ بالا دائرہ میں مراتبِ حقی اور مراتبِ خلقی کے درمیان کھینچی گئی لکیر یا خط جو سورۃ فاتحہ کی درمیانی آیت ایاک نعبد وایاک نستعین کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ آیت اللہ اور بندے کے درمیان تعلق کو ظاہر کرتی ہے، ربوبیتِ حق تعالیٰ اور مخلوقات کے اجسام کی صورت میں اس کے اظہار کو ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز بھی کرتی ہے اور ربّ اور عبد کو جوڑتی بھی ہے۔ چنانچہ یہ برزخ ہے جس کے لفظی معنی ''پردہ'' کے ہیں۔ دائرہ کو غور سے دیکھنے سے برزخ کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے اور انسانِ کامل کی بھی جسے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ نے اس سے قبل برزخ سے تشبیہ دی تھی۔ اس لکیر کا تعلق دائرے کی دونوں اطراف سے ہے۔ یہ دائرے کے اوپر والے نصف حصے سے بھی اسی طرح جڑی ہے جس طرح نچلے حصے سے۔ اوپر والے حصے کا تعلق ربوبیت سے ہے اور نیچے والا کا عبودیت سے، اوپر والا حق ہے نیچے والا خلق اور یہ لکیر دونوں کے درمیان حدِ فاصل بھی ہے اور دونوں کو جوڑنے والی بھی۔ اس کا ایک رخ ربوبیت ہے اور دوسرا رخ عبودیت ہے اور یہی حقیقتِ انسانِ کامل بھی ہے، وہی واسطہ اور وسیلہ ہے ربّ اور خلق کے درمیان، لہٰذا برزخ ہے جس کا اظہار سورۃ فاتحہ میں ایاک نعبد وایاک نستعین کے الفاظ میں کیا گیا کہ ''ہم

تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں''۔

☆☆☆☆☆☆

وَذٰلِكَ لِاَنَّ عَالَمَ الْجَبْرُوْتِ جَامِعُ الْجَلَالِ وَالْجَمَالِ وَلَا بُدَّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمَا مَظْهَرَ اَنِ لِيَظْهَرَ بِهِمَآ اِحْكَامُهُمَا فَاَهْلُ السَّعَادَتِ وَالْهِدَايَةِ وَهُمْ اَصْحَابُ الْيَمِيْنِ مَظْهَرُ الْجَمَالِ وَاَهْلَ الشَّقَاوَةِ وَالضَّلَالَةِ وَهُمْ اَصْحَابُ الشِّمَالِ مَظْهَرُ الْجَلَالِ وَلَا بُدَّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمَا مَقَامَانِ لِيَظْهَرَ فِيْهِمَا اَحْكَمُهُمَا وَاَخْلَاقُهُمَا وَاَعْمَالُهُمَا وَهُمَا الْجَنَّةُ وَالنَّارُ وَجَمِيْعُ ذٰلِكَ مُنْدَرَجٌ فِي الْقِسْمِ الَّذِيْ يَتَعَلَّقُ الْعَبْدِ۔

ترجمہ: یہ تقسیم ضروری ہے اس لیے کہ عالمِ جبروت میں جلال اور جمال جامع ہیں اور جلال اور جمال کے لیے مظہر ہونے چاہیے تاکہ اُن مظاہر میں اُن کے احکام ظاہر ہوں۔ پس اہلِ سعادت اور ہدایت یعنی اصحابِ یمین مظہرِ جمال ہیں اور اہلِ شقاوت اور ضلالت یعنی اصحابِ شمال مظہرِ جلال ہیں اور ضروری ہے کہ ان کے لیے دو مقام ہوں تاکہ ان میں ان کے احکام اور اخلاق اور اعمال ظاہر ہوں۔ وہ جنت اور نار ہے یہ سب اس قسم میں مندرج ہے جو عبد کے متعلق ہے۔

شرح: کائنات کی جمیع مخلوقات اللہ تعالیٰ کے اسماء کی مظہر ہیں۔ ہر مخلوق کے لیے ایک اسم ہے۔ عالمِ جبروت میں یہ تمام اسماء اور ان کی صفات ''ذات'' میں جمع ہیں۔ اسماء اور ان سے ظاہر ہونے والی صفات کو دو قسم پر تقسیم کیا جا سکتا ہے جلالی اور جمالی۔ جلالی اسماء کی مثال قہار، جبار، مضل وغیرہ ہیں جبکہ جمالی اسماء کی مثال کریم، لطیف، رحمٰن اور رحیم وغیرہ ہیں۔ جبروت میں یہ سب ذات میں جمع ہیں لیکن ان کے اظہار کے لیے ضروری ہے کہ دو ہی قسم کے ان کے مظہر بھی ہوں چنانچہ اللہ نے مخلوق کو دو ہی قسم پر تقسیم کیا۔ نصف جو اس کے جمالی اسماء کے مظہر ہوں اور نصف جو اس کے جلالی اسماء کے مظہر ہوں۔ فصوص الحکم میں ہے:

❁ اے طالب تو جان لے کہ وہ ذات اور وجود جس کا اسم اَللّٰہُ ہے ذات کے لحاظ سے وہ احد ہے اور اسماء کے لحاظ سے وہ کُل ہے۔ یعنی حقیقت کے اعتبار سے وہ احد ہے اس کے سوا کسی چیز کا وجود نہیں اور اسماء کے اعتبار سے کل موجودات اُسی احد کے مظاہر ہیں۔ اسمِ اَللّٰہُ جامع جمیع اسماء و جامع جمیع صفات ہے۔ باقی اسماء میں سے ہر ایک اسم ایک خاص صفت کا مظہر ہے۔

❁ جملہ ممکناتِ عالم اسی ذاتِ احد کے اسماء کے مظاہر ہیں۔ نیز موجودات میں سے ہر ایک موجود کا ایک خاص ربّ ہے اور وہ موجود اسی ربّ کا مربوب ہے یعنی ہر موجود ایک خاص اسم کا مظہر ہے اور وہ موجود اسی اسم کے تحت کام کرتا ہے گویا وہ اسم اس موجود کا ربّ ہے اور اس موجود کی تربیت وہی اسم کرتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ گرامی اسماء الٰہیہ کی جامع ہے۔

❁ ہر صورت حق کی صورت ہے۔ صورتِ آدم علیہ السلام بھی حق ہے اور صورتِ ابلیس بھی حق ہے مگر آدم علیہ السلام کی صورت اسم ''ہادی'' کی صورت ہے اور ابلیس کی صورت اسم ''مضل'' (گمراہ کرنے والا) کی صورت ہے۔ انبیاء کرام اور ان کے وارثین ہدایت کے امام ہیں۔ شیاطین وانبیاء شیاطین گمراہی کے امام ہیں۔ ہدایت کا ورثہ بھی علمی ہے اور ضلالت کا ورثہ بھی علمی ہے۔ شیطان اپنے علم سے ہی گمراہ ہوا اور آدم علیہ السلام اسمائے الٰہیہ کے علم سے مستحقِ خلافت ہوئے۔ (فصوص الحکم والایقان)

اللہ کے جمالی اسماء کے مظہر انہی اسماء کی تجلیات پر پلتے ہیں، انہی سے قوت حاصل کرتے اور انہی کی صفات کو اپناتے ہیں اور اہلِ سعادت کہلاتے ہیں۔ جبکہ جلالی اسماء کے مظہر انہی کی تجلیات پر پلتے، ان سے قوت حاصل کرتے اور انہی صفات کو اپناتے ہیں اور اہلِ شقاوت کہلاتے ہیں۔ جس اسمِ الٰہی کی تجلیات پر وہ مظہر یا موجود پلتا ہے وہی اسم اس کا ربّ کہلاتا ہے، وہی اسم اس کی تربیت کرتا ہے اور اسی اسم کی وہ اطاعت کرتا ہے چنانچہ ان موجودات میں انہی اسماء الٰہیہ کی صفات اور ان کے احکام ظاہر ہوتے ہیں جن کی تجلیات سے ان کا تعلق جڑتا ہے۔

چونکہ اللہ کے جمالی اسماء اور جلالی اسماء کی مظہر بننے والی موجودات دو قسم کی ہیں اس لیے

ضروری ہے ان دو طرح کے مظہروں کے لیے ٹھکانے اور مقام بھی دو طرح کے ہوں پس اہلِ جمال یا اہلِ سعادت کو اصحابِ یمین یعنی داہنی طرف والے کہا اور اہلِ جلال یعنی اہلِ شقاوت کو اصحابِ شمال یعنی بائیں طرف والے کہا۔ اصحابِ یمین کا ٹھکانہ جنت بنایا اور اصحابِ شمال کا ٹھکانہ جہنم بنایا۔ ان داہنی طرف والوں اور بائیں طرف والوں کے علاوہ کچھ خاص مقربینِ حق بھی ہیں جو نہ داہنی طرف ہیں اور نہ بائیں طرف بلکہ سیدھے چل کر اپنے ربّ اپنے اللہ تک پہنچنے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو جلالی و جمالی تمام اسماء کے جامع اسم اَللّٰہُ کے مظہر ہیں۔ ان کا رب اسمِ اَللّٰہُ ہے، اسی کی تجلیات پر یہ پلتے ہیں، وہی ان کی تربیت کرتا ہے اور اسی کی وہ اطاعت کرتے ہیں اور اس اسم کی تمام صفات اور احکام ان میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کے لیے نہ جنت ہے نہ جہنم بلکہ ان کے لیے خود ذاتِ حق تعالیٰ اور اس کا قرب ہے۔ سورۃ واقعہ میں اللہ اپنی مخلوق کے ان گروہوں کے متعلق فرماتا ہے:

ترجمہ: ''اور (روزِ قیامت) تم تین قسم کے ہو جاؤ گے۔ تو داہنی طرف والے کیسے داہنی طرف والے اور بائیں طرف والے کیسے بائیں طرف والے اور جو سبقت لے گئے وہ تو سبقت ہی لے گئے۔ وہی مقربِ بارگاہ ہیں چین کے باغوں میں۔'' (سورۃ واقعہ 12-8)

اصحابِ یمین اور اصحابِ شمال کے ٹھکانے بھی بتا دیئے۔

❁ ترجمہ: اور داہنی طرف والے کیسے داہنی طرف والے۔ بغیر کانٹوں کے بیریوں میں اور کیلے کے گچھوں میں اور ہمیشہ سائے میں اور ہمیشہ جاری پانی میں اور بہت سے میووں میں جو نہ ختم ہوں گے اور نہ روکے جائیں گے اور بلند بچھونوں میں''۔ (الواقعہ 34-27)

❁ ترجمہ: ''اور بائیں طرف والے کیسے بائیں طرف والے۔ جلتی ہوا اور کھولتے پانی میں اور جلتے دھوئیں کی چھاؤں میں جو نہ ٹھنڈی نہ عزت کی، بیشک وہ اس سے پہلے (یعنی دنیا میں اور ازل میں) نعمتوں میں تھے''۔ (الواقعہ 45-41)

اپنی اپنی سمتیں اور اپنے اپنے ٹھکانے ان موجودات یا ان کی ارواح نے ازل میں خود چنے تھے۔ روزِ الست اللہ تعالیٰ نے ان مخلوقات کو اپنے سامنے آراستہ کر کے ان سب پر اپنے اسم

''اَللّٰہُ'' کی تجلی برابر ڈالی تھی اور پھر پوچھا ''اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ '' ''کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں''؟ سب نے اسم اَللّٰہُ کو ہی اپنا ربّ مانا اور کہا ''قَالُوْا بلٰی '' ترجمہ: ''بے شک تو ہی ہمارا ربّ ہے'' (سورۃ الاعراف)۔ یعنی اللہ نے اپنے جلال اور جمال کے تمام اسماء کی تجلی وحدت کی جامع صورت میں سب ارواح پر برابر ڈالی اور کسی کو اس سے محروم نہ رکھا۔ لیکن پھر جب ذات سے اس کے اسماء وصفات ظاہر ہوئے تو نو حصے ارواح کی نظر ذات سے ہٹ کر اسماوصفات پر لگ گئی۔ ہر موجود نے ان میں سے وہ اسم جس کی صفات اپنا کر وہ اسے اپنا ربّ بنانا چاہتا تھا خود پسند کیا اور خود چنا اور پھر اس پر قائم ہو گیا۔ اللہ کی ذات سے اس کے جلالی اسماء پہلے ظاہر ہوئے اور جمالی اسماء بعد میں جیسا کہ حضرت سخی سلطان باھو رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''اللہ نے اپنی پہچان کے لیے مخلوق کو پیدا کرنا چاہا تو پہلے بائیں طرف قہرِ جلالیت سے دیکھا جس سے نارِ شیطانی پیدا ہو گئی پھر دائیں طرف لطف وکرم جمعیت ورحمت اور شفقت والتفات کی نظر سے دیکھا تو آفتاب سے روشن تر نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد امرِ کن فرمایا اور کل مخلوقات کی ارواح پیدا ہو گئیں۔'' (شمس العارفین۔ کلید التوحید) ان جلالی اسماء کو اپنا ربّ چننے والی کافروں اور اہلِ دنیا کی ارواح تھیں اور یہی اصحاب شمال یا اہلِ شقاوت بنے۔ پھر اللہ کے جمالی اسماء کی تجلیات ظاہر ہوئیں تو باقی بچی ہوئی ایک حصہ ارواح میں سے نو حصے ارواح نے ان اسماء کو اپنا رب چن لیا، یہ اہلِ سعادت یا اصحابِ یمین کی ارواح ہیں جو اہلِ عقبیٰ یا اہلِ جنت ہیں۔ صرف ایک حصہ ارواح کی نظر آخر تک صرف اور صرف ذات پر رہی اور انہوں نے اسمِ اَللّٰہُ کو ہی اپنا ربّ مانا، اسی کی اطاعت اور اسی سے محبت کی، یہ اہلِ اللہ مقربین، انبیاء واولیاء کی ارواح ہیں جن کا راستہ بالکل سیدھا صراطِ مستقیم ہے، نہ داہنے نہ بائیں، نہ جلال نہ جمال بلکہ اہلِ اللہ۔ ان کا دین ہی حقیقی دین ہے کیونکہ دینِ اسلام ایک سیدھا راستہ صراطِ مستقیم ہے نہ دائیں ہے نہ بائیں ہے۔ اگرچہ داہنی طرف والوں کے لیے اللہ نے جنت اور اس کی نعمتیں انعام میں رکھی ہیں لیکن ان کو وہ عزت، مقام ومرتبہ ہرگز حاصل نہیں جو قربِ حق کے گھوارے میں رہنے والے اہلِ اللہ کے لیے ہے۔ ان کے

لیے نہ جنت ہے نہ نار کیونکہ جنت اور جہنم ''عبد'' سے متعلق ہے اور یہ اہلِ اللہ عبودیت اور ربوبیت کے جامع (عبدہٗ) ہیں، ان کے لیے صرف ذاتِ حق اور اس کا قرب ہے۔ چنانچہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ اگلی عبارت میں ان کے متعلق فرماتے ہیں:۔

وَاَمَّا الْقِسْمُ الْمُتَعَلِّقُ بِالْحَقِّ وَالْعَبْدِ مَعًا نِ الَّذِیْ سُمِّیَ بِالْحَقِیْقَةِ الْکُلِّیَّةِ الْاِنْسَانِیَّةِ فَھُوَ مَرْتَبَةُ اَھْلِ الْکَمَالِ وَ مَقَامُ الْمُطَّلِعِ وَمَنْزِلُ الْاَشْرَافِ عَلَی الْاَطْرَافِ وَمَوْقِفُ الْاَعْرَافِ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَعَلَی الْاَعْرَافِ رِجَالٌ یَّعْرِفُوْنَ کُلًّا بِسِیْمَاھُمْ لِاَنَّھُمْ مُّحِیْطُوْنَ عَلَی الْکُلِّ وَلَھُمُ الْکَمَالُ الْمُتَعَلِّقُ بِالذَّاتِ وَالْجَلَالُ وَالْجَمَالُ مُنْدَرِجَانِ فِی الْکَمَالِ وَاَرْبَابُ ھٰذَا الْمَوْقِفِ الْعَارِفُوْنَ الْمُوَحِّدُوْنَ۔

ترجمہ: اور جو قسم حق اور عبد دونوں کے متعلق ہے جس کو حقیقتِ کلیہ انسانیہ کہتے ہیں وہ مرتبہ اہلِ کمال کا ہے اور ان کا مقامِ طلوع اور منزل اشراف کی اطراف میں اور آرام گاہ 'اعراف' ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اعراف کے اوپر مرد ہیں جو ہر ایک کو ان کی پیشانیوں سے پہچانتے ہیں اس واسطے کہ وہ سب کو محیط ہیں۔ ان کے واسطے کمال ہے جو ذات (حق تعالیٰ) سے متعلق ہے اور اس کمال میں جمال اور جلال دونوں داخل ہیں اور اس مقام کے اصحاب عارف اور موحد ہیں۔

شرح: اہلِ اللہ، اہلِ کمال ہیں، اللہ کے جلال و جمال سمیت تمام صفات کے جامع۔ حیات، سمع، علم، بصر، قیومیت اور ان تمام صفات سے متصف جن کا تعلق صرف ذاتِ حق تعالیٰ سے ہے۔ یہ موحد ہیں کیونکہ انہوں نے اللہ کی واحد ذات کو ربّ مانا نہ کہ کسی ایک اسم یا اس کی صفت کو یا زیادہ اسماء وصفات کو بلکہ اس ذات سے تعلق جوڑا اور اسی ایک واحد ذات میں فنا ہو کر اسی کے ساتھ واحد ہو گئے چنانچہ موحد کہلائے اور ہمیشہ ایک صراطِ مستقیم پر رہے نہ دائیں (جنت کی) طرف مڑے نہ بائیں (دنیا کی) طرف مڑے۔ پس یہ کمالِ عظیم کے مالک اور مقامِ لازوال پر متمکن ہیں۔ یہ

عارفینِ الٰہی ہیں یعنی اللہ کو دیکھنے، پہچاننے اور جاننے والے، اس علمِ خداوندی کی بنا پر یہ عام مسلمانوں کو اللہ کی معرفت کی تعلیم دینے والے ہیں۔ صفاتِ حق سے مکمل طور پر متصف ہونے کی بنا پر یہ علیم بھی ہیں اور تمام مخلوقِ الٰہی کے احوالِ ظاہر و باطن کے ناظر اور جاننے والے ہیں۔ ان کی نگاہ کی حقیقت نگاہِ الٰہی ہے، یہ اللہ کی سماعت و بصارت سے بہرہ ور ہیں، اللہ خود ان کی سماعت و بصارت و گویائی اور ہر قوت ہے کیونکہ یہ اللہ کی ذات میں فنا ہو چکے، اس لیے یہ تمام مخلوق کے ظاہر و باطن کو جاننے اور پہچاننے والے ہیں۔ وہ سب مخلوق پر اسی طرح محیط ہیں جس طرح اللہ کی ذات ہر شے پر محیط اور ہر شے کا احاطہ کرنے والی ہے جیسا کہ سلطان العارفین حضرت سخی سلطان باھو رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''عارف باللہ قادری بہر مقام حاضر بہر قدرتے قادر'' ترجمہ: ''عارف باللہ قادری ہر مقام پر حاضر اور ہر قدرت پر قادر ہے''۔ یہ بات ہرگز بعید از قیاس یا ناممکن نہیں کیونکہ عارفین باللہ وہ اہلِ اللہ ہیں جن کے قلب میں ذاتِ حق سمائی ہے اور جس قلب کی وسعت ایسی بے انتہا ہو کہ اس میں اللہ کی لامحدود ذات سما جائے، وہ قلب اللہ کی محدود مخلوق کا احاطہ کیوں نہیں کر سکتا۔ سلطان العارفین حضرت سخی سلطان باھو رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

- عارفوں کے قلب رحمتِ الٰہی سے وسیع ہوتے ہیں کہ رحمتِ الٰہی دل میں سما جاتی ہے لیکن قلب رحمتِ الٰہی میں نہیں سماتا کہ رحمتِ الٰہی اللہ تعالیٰ کی نظرِ رحمت ہے اور قلب نظرگاہِ الٰہی ہے۔ بے شک عارف حقیقتِ قلب سے واقف ہوتا ہے اور اس کا سینہ مقامِ ہدایت ہوتا ہے۔ (کلید التوحید)

- اے میرے عزیز منتہی کامل کا قلب حق تعالیٰ کی ذات کے لیے فراخ اور وسیع ہوتا ہے اور تجلّیِ حق اس میں سما جاتی ہے لیکن رحمتِ خدا میں نہیں سما سکتی۔ اگر رحمتِ حق کو رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ ''میری رحمت ہر شے سے وسیع ہے'' کے مطابق وسعت دی جائے تو پھر بھی انسانِ کامل کے قلب کے مشابہ نہیں ہو سکتی کیونکہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ''میں زمین و آسمان میں نہیں سما سکتا لیکن مومن کے قلب میں سما جاتا ہوں''۔ لیکن رحمتِ خداوندی اور عرشِ رحمٰن قلبِ مومن کے مقابلے میں محسوس ہی نہیں ہوتا کیونکہ لَوْ اِنَّ الْعَرْشَ وَ مَاحَوْلَهٗ مِئَةَ اَلْفِ اَلْفِ مَرَّةً فِیْ زَوَایَةِ

مِنْ زَوَایَا قَلْبِ الْعَارِفِ مَا حَصَلَ لَہٗ عَقَدَ ترجمہ: اگر عرش اپنے گردونواح کے ساتھ لاکھوں گنا بھی بڑھ جائے تو بھی وہ قلبِ عارف کے زاویے سے باہر نہیں ہوسکتا۔ گویا کہ عرشِ باری تعالیٰ اور قلبِ عارف کے درمیان مقابلہ محال ہے۔ (سلطان الوہم)

آپ رحمتہ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں:

❁ ربوبیت خاص رازِ ربّ ہے جو فقرائے عارف باللہ کا نصیبہ ہے۔ حدیثِ قدسی میں فرمانِ حق تعالیٰ ہے ''جو مجھے پا کر پہچاننا چاہتا ہے وہ مجھے عارف باللہ فقیر کی وساطت سے پا بھی لیتا ہے اور پہچان بھی لیتا ہے''۔ پس راہِ معرفتِ مولیٰ میں عارف باللہ نادیدہ ہرگز نہیں ہوتا اور نہ ہی جہان کی کوئی شے اس سے مخفی ہوتی ہے۔ عارفین باللہ جو کچھ دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے ہی ہوتا ہے جیسا کہ فرمانِ حق تعالیٰ ہے کہ ترجمہ: ''میرا نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی مرضی سے کچھ نہیں کہتا بلکہ وہ وہی کہتا ہے جو اس پر وحی کی جاتی ہے'' (سورۃ نجم)

چشم باچشم است و دل با دل نظیر
انتہائے عارفانش ایں فقیر

ترجمہ: عارف باللہ کا انتہائی مرتبہ یہ ہے کہ ان کی آنکھیں اللہ کی آنکھیں اور ان کا دل اللہ کا دل ہوتا ہے۔ (کلید التوحید کلاں)

حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہٗ عارف باللہ کے متعلق فرماتے ہیں:

❁ عارف باللہ کے اخلاق، اخلاقِ خداوندی ہوتے ہیں لہٰذا وہ اہلِ معصیت کو شیطان، نفس اور خواہش کے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ (الفتح الربانی)

❁ عارف باللہ کسی چیز کے ساتھ نہیں ٹھہرتا، اسے نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ اور نہ کوئی اسے اللہ سے روک سکتا ہے، وہ تو ہر چیز کے پیدا کرنے والے کے ساتھ قرار پاتا ہے۔ (الفتح الربانی)

انسان کا حقیقی مقام یہی ہے جس کی بنا پر وہ اللہ کی تمام مخلوقات سے افضل ہے۔ حقیقتِ

کلیہ انسانیہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اپنی ہر صفت سے متصف ہونے کی صلاحیت و استعداد کے ساتھ پیدا فرمایا اسی لیے اس نے فرمایا کہ ''اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا'' اور فرمایا کہ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا (البقرہ۔31) ''آدم کو تمام اسماءِ الٰہیہ (یعنی صفاتِ الٰہیہ) کا علم سکھایا'' اور حدیثِ قدسی میں حکم بھی فرمایا گیا کہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ ترجمہ: ''اللہ کے اخلاق (صفات) سے متصف ہو جاؤ''۔ قربِ حق تعالیٰ کے سفر میں جب انسان ترقی کرتا ہے تو اس میں ذاتِ حق تعالیٰ ظاہر ہوتی جاتی ہے اور اُس کی صفات بھی اس کی بشری صفات پر غالب آتی جاتی ہیں۔ جتنا قرب بڑھتا ہے اتنی ہی صفاتِ حق تعالیٰ کا اظہار اس کی ذات سے ہوتا ہے حتیٰ کہ انسان کی اپنی ذات و بشری صفات مکمل فنا ہو کر اللہ کی ذات و صفات اس میں ظاہر ہو جاتی ہیں اور وہ اپنے اصل مقام یعنی 'وحدت' یا حقیقتِ محمدیہ تک پہنچ جاتا ہے جہاں نورِ محمدی کی صورت میں ذات وصفات کا مکمل و کامل اظہار ازل میں ہوا۔ ہر انسان اسی ایک کلیہ (formula) پر پیدا کیا گیا لیکن اس کلیہ کا عملی، فعلی اور مکمل اظہار صرف عارفین باللہ میں ہوتا ہے اور ان میں بھی کامل ظہورِ صفاتِ حق تعالیٰ صرف انسانِ کامل میں ہوتا ہے۔

اہلِ سعادت اگرچہ اللہ کے ہاں دیگر مخلوقات سے بہتر مقام رکھتے ہیں اور ان میں کچھ صفاتِ الٰہیہ کچھ حد تک ظاہر بھی ہوتی ہیں لیکن ان میں اللہ کی کوئی بھی صفت کامل طور پر ظاہر نہیں ہوتی جس کی دلیل یہ ہے کہ صفاتِ الٰہیہ افضل اور اعظم ترین ہیں ان سے متصف انسان کسی صورت کسی بھی کمتر شے یا کمتر مقام کی تمنا کر ہی نہیں سکتا، اہلِ سعادت یا دہنی طرف والے طلبِ اللہ کی بجائے طلبِ عقبیٰ و جنت میں ہی رہتے ہیں اور اسی طلب میں اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور آخرت میں اللہ انہیں یہی عطا کرتا ہے لیکن اللہ کی تخلیقات کے حساب سے جنت انسان سے کمتر شے ہے۔ اللہ کی صفات یا کم از کم ایک بھی صفت سے متصف انسان اس کمتر شے کی طلب کیسے کر سکتا ہے۔ یہ بات شانِ صفاتِ الٰہیہ کے خلاف ہے، چنانچہ صفاتِ الٰہیہ سے متصف انسان صرف اللہ ہی کی طلب کرتا ہے اور اس کی صفات سے زیادہ سے زیادہ متصف ہو کر اس کے قرب کی

انتہائی منازل پر پہنچنے کی طلب میں کوشاں رہتا ہے۔ ایسا انسان ہی اشرف المخلوقات اور حقیقی انسان کہلانے کے لائق ہے۔

☆☆☆☆☆☆

وَاِذَا تُقُرِّرَ هٰذَا فَاعْلَمْ اَنَّ فِيْ هٰذَا الْبَرْزَخِ يَتَّصِفُ الْحَقُّ تَعَالٰى بِصِفَاتِ الْعَبْدِ مِنَ الضِّحْكِ وَالْبُكَآءِ وَالْبَشَاشَةِ وَالْفَرَحِ وَالْمَكْرِ وَالْاِسْتِهْزَآءِ وَالْمَرَضِ وَالْجُوْعِ وَالْعَطْشِ وَمَا اَشْبَهَ ذٰلِكَ وَالْعَبْدُ يَتَّصِفُ بِصِفَاتِ الْحَقِّ تَعَالٰى مِنَ الْحَيٰوةِ وَالْعِلْمِ وَالْاِرَادَةِ وَالْقُدْرَةِ وَالسَّمْعِ وَالْبَصَرِ وَ الْكَلَامِ وَالْاَحْيَآءِ وَالْاِمَاتَةِ وَالْاِنْبِسَاطِ وَالْاِنْقِبَاضِ وَالتَّصَرُّفِ فِي الْاَكْوَانِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ فَهٰذَا الْبَرْزَخُ هُوَ مَرْتَبَةُ التَّنَزُّلِ الرَّبَّانِيِّ لِيَتَّصِفَ الرَّبُّ فِيْهَا بِالصِّفَاتِ الْعَبْدَانِيَّةِ وَمَرْتَبَةُ ارْتِفَاعِ الْعَبْدِ لِيَتَّصِفَ الْعَبْدُ فِيْهَا بِالصِّفَاتِ الرَّبَّانِيَّةِ فَهِيَ الْعَمٰى الْمَذْكُوْرُ فِي الْحَدِيْثِ الْمَشْهُوْدِ وَلَوْ لَا اِنِّيْ اَخَافُ عَنِ التَّطْوِيْلِ وَالْاِعْرَاضِ عَنِ التَّوْحِيْدِ لَذَكَرْتُ فِيْ هٰذِهِ الْمَرْتَبَةِ الْعَمَآئِيَةِ اَسْرَارَهَا فَاَخَذْتُ لِذٰلِكَ عِنَانَ الْقَلَمِ وَاكْتَفَيْتُ بِمَا يَلِيْقُ بِهٰذَا الْمُخْتَصَرِ۔

ترجمہ: اور جب ثابت ہو چکا یہ پس معلوم کر کہ تحقیق اس برزخ میں حق تعالیٰ صفاتِ عبد سے متصف ہے جیسے کہ ہنسنا اور رونا، بشاشت اور خوشی اور مکر اور استہزاء اور مرض اور بھوک اور پیاس اور اسی سے مشابہ (دیگر صفات وغیرہ) اور عبد حق تعالیٰ کی صفات سے متصف ہوتا ہے جیسا کہ حیات اور علم، بسط اور قبض، ارادہ اور قدرت، سماع اور نظر اور کلام، زندہ کرنے اور مارنے، اکوان[1] اور اس کے غیر میں تصرف وغیرہ۔ پس یہ برزخ وہ مرتبہ تنزلِ ربانی کا ہے تا کہ متصف ہو پروردگار صفات

---

[1] کون ومکان

عبودیت سے اور عبد کی بلندی کا وہ مرتبہ ہے جس میں عبد متصف ہوتا ہے صفاتِ ربانی سے۔ پس یہی مقام عماء ہے جو مشہور حدیث مبارکہ میں مذکور ہے اور اگر طوالت اور توحید کے موضوع سے اعراض (ہٹ جانے) کا خوف نہ ہوتا تو میں ضرور اس مرتبہ عمائیہ کے اسرار بیان کرتا۔ پس اسی سبب سے میں نے اپنے قلم کو روک لیا ہے اور اسی بیان کو کافی سمجھا جو مختصر اور مناسب ہے۔

شرح: جیسا کہ مقامِ برزخ کی شرح میں یہ بات تفصیلاً بیان کر دی گئی کہ اس مقام کے حامل اہلِ اللہ عارفین کی ایک جہت عبودیت ہے اور ایک جہت ربوبیت ہے، وہ تمام صفاتِ الٰہیہ سے متصف ہو کر مقامِ ربوبیت پر متمکن ہیں، ان کی بشری صفات ذاتِ حق تعالیٰ میں فنا ہو گئیں اور ان میں تمام کی تمام صفاتِ الٰہیہ ظاہر ہو گئیں۔ یہ انسانی عروج کا انتہائی مقام ہے جہاں عبد ''عبدہٗ'' کہلاتا ہے یعنی وہ عبد جس کی صورت میں ھو ظاہر ہے لیکن یہ مقام عبد کو صرف اپنی اللہ کی طرف سیرِ عروجی سے حاصل ہونا ناممکن ہے کیونکہ ذاتِ حق تعالیٰ مقامِ لامحدود کی مالک ہے۔ اس تک رسائی تب تک ممکن نہیں جب تک وہ خود بھی تنزل کر کے اپنے عبد کی طرف نہ بڑھے۔ اگر ایک طرف بندہ سیرِ عروجی کرتے ہوئے اللہ کی طرف بڑھتا ہے تو دوسری طرف اللہ بھی تنزل کرتے ہوئے اپنے عبد کی ذات میں ظاہر ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ مکمل ظاہر ہو جاتا ہے جیسا کہ اس نے حدیثِ قدسی میں فرمایا کہ ''جب میرا بندہ میری طرف ایک قدم بڑھاتا ہے تو میں اس کی طرف دس قدم بڑھاتا ہوں۔ وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں'' عبد کا عروج یہ ہے کہ وہ صفاتِ حق تعالیٰ سے متصف ہوتا جاتا ہے اور ذاتِ حق تعالیٰ کا نزول یہ ہے کہ وہ صفاتِ عبد سے متصف ہوتا جاتا ہے جس کے متعلق اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ ''میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے اس قدر قریب ہوتا ہے کہ میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں وہ مجھ سے پکڑتا ہے، میں اس کے کان بن جاتا ہوں وہ مجھ سے سنتا ہے، میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں وہ مجھ سے دیکھتا ہے، میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں وہ مجھ سے چلتا ہے''۔ پس ان اہلِ اللہ عارفین کی ذات میں کچھ نہیں بچتا سوائے حق تعالیٰ کے۔ بندہ صفاتِ الٰہیہ اپناتا ہے اور اللہ صفاتِ عبد، بندہ ذاتِ حق

تعالیٰ میں فنا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ذاتِ عبد میں۔ اسی مقام کو سلطان العارفین حضرت سخی سلطان باھو رحمتہ اللہ علیہ نے رسالہ روحی شریف میں ''گاہی قطرہ در بحر و گاہی بحر در قطرہ'' ترجمہ: ''کبھی قطرہ سمندر میں اور کبھی سمندر قطرہ میں'' کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ مقامِ برزخ میں عبد اور اللہ مشترکہ خصوصیات کے حامل ہو جاتے ہیں۔ عارف باللہ کے وجود میں بولنے والا، ہنسنے والا، رونے والا، مذاق کرنے والا، تدبیریں کرنے والا حق تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا۔ رسالۃ الغوثیہ میں اللہ تعالیٰ حضور غوث الاعظم رضی اللہ عنہٗ سے فرماتا ہے ترجمہ: ''اے غوث الاعظمؓ! انسان کوئی چیز نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے، نہ کھڑا ہوتا ہے نہ بیٹھتا ہے، نہ بولتا ہے، نہ سنتا ہے نہ کوئی کام کرتا ہے، نہ کسی چیز کی طرف متوجہ اور نہ اس سے روگردان ہوتا ہے مگر یہ کہ اس میں میں ہوتا ہوں۔ میں ہی اس کو حرکت میں لاتا ہوں اور میں ہی اس کو ساکن رکھتا ہوں'' پھر فرمایا ''اے غوث الاعظمؓ! انسان کا جسم اس کا نفس، اس کا دل، اس کی روح، اس کے کان، اس کی آنکھ اور اس کے ہاتھ پاؤں ہر ایک چیز کو میں نے اپنی ذات سے اپنے لیے ظاہر کیا ہے۔ وہ نہیں مگر میں ہی ہوں اور میں اس سے غیر نہیں ہوں''۔ حضور غوث الاعظمؓ نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا ''اے ربّ کیا تیرے لیے کھانا پینا ہے؟ فرمایا ''فقیر کا کھانا میرا کھانا اور اس کا پینا میرا پینا ہے'' (رسالۃ الغوثیہ)۔ پس یوں اللہ بندے کی صفات سے متصف ہوتا ہے اور اسے وہ صفات حاصل ہوتی ہیں جو اسے جسمِ انسان میں ظاہر ہوئے بغیر ہرگز حاصل نہ ہو پاتیں یعنی اگر اللہ تنزل کر کے انسان کے روپ میں ظاہر نہ ہوتا تو اس کا وجود ایسا لطیف، نورانی بلکہ عقل سے بھی بالاتر کوئی ایسا وجود ہے جو نہ ہنس سکتا ہے نہ رو سکتا ہے، اسکی محبت، اس کے جذبات و احساسات کے اظہار کے لیے یہ جسمِ انسان ہی ذریعہ بنتا ہے، اپنے ان جذبات و احساسات کے اظہار کی خاطر ہی اس نے انسان اور جسمِ انسان کو پیدا کیا اور اس کے مادی وجود میں خود ظاہر ہو کر بے صورت کو صورت عطا کی، اپنے احساسات و جذبات کو اظہار کا کمال عطا کیا۔ ایسا نہ ہوتا تو اس ذات کا اظہار ادھورا اور نامکمل رہتا۔ حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''ہر چیز کی ذات اس کی ذات سے ہے، ہر چیز کا اثر اس کے اثر سے ہے، ہر شے کی صفت

اس کی صفت سے ہے۔ متحرک اس سے متحرک اور ساکن اس سے ساکن ہے۔ بندہ کا فعل محض مجازاً ہے ورنہ درحقیقت وہ فعل خداوندِ عالم کا ہے۔ اس طرح قلب اللہ سے دوستی کا محل (مقام) ہے۔ آنکھیں اس کے دیدار کا محل اور جان عبرت کا محل ہوتی ہے'' (کشف المحجوب)

''اسرارِ حقیقی'' میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا کہ ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس خاک کے پتلے میں بولنے والا، سننے والا اور دیکھنے والا کون ہے اور کیسا ہے؟ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ ''وہی (اللہ) بولنے والا، سننے والا اور وہی دیکھنے والا ہے''۔

اگرچہ ذاتِ حق تعالیٰ ہر انسان کے باطن میں موجود ہے لیکن ظاہر صرف انسانِ کامل میں ہے کیونکہ وہ تمام صفاتِ الٰہیہ سے متصف ہو چکا اور اس کا ظاہر باطن ایک ہو چکا اور اس ''ایک'' ہو جانے کی بنا پر ہی وہ ''موحد'' کہلایا۔ انسانِ کامل میں ہی اللہ کی وہ صفات بھی ظاہر ہیں جو دیگر انسانوں میں قطعاً ظاہر نہیں مثلاً اس کا علم علمِ الٰہی ہے یعنی کامل و مکمل ہر شے کا احاطہ کرنے والا، اس کا ارادہ اللہ کا ارادہ ہے، اللہ اور اس کی ذات ایک ہو چکی اس لیے ان کا ارادہ بھی ایک ہو چکا، اللہ وہی چاہتا ہے جو اس کا محبوب چاہتا ہے، اور محبوب وہی چاہتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ پھر اللہ اسے اپنی کامل قدرت سے متصف کرتا ہے جس کے متعلق فرمایا گیا کہ ''فقیر وہ نہیں جس کے پاس کچھ نہیں بلکہ وہ ہے جو 'کن' کہے اور (وہ کام) ہو جائے''۔ پیدا کرنا اور مارنا بھی انسانِ کامل کے سپرد ہوتا ہے جیسا کہ حضرت غوث الاعظمؓ ''قم'' کہہ کر مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔ انسانِ کامل کو یہ قوت و اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی نگاہ سے اللہ کے طالبوں کے دلوں کو زندہ کرے اور نفوس کو مار ڈالے۔ انسانِ کامل کی نگاہ سے زندہ کیا ہوا دل یعنی قلب و روح ابدی حیات پاتا ہے اور کبھی دوبارہ نہیں مرتا۔ سلطان العارفین حضرت سخی سلطان باھو رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''مرشد (کامل انسان) ہی محی (زندہ کرنے والا) اور ممیت (مار ڈالنے والا) ہے۔ وہ دلوں کو زندہ کرتا اور نفس کو مارتا ہے'' (سلطان الوھم)۔ اور اکوان یعنی تمام کون و مکان پر اس کو عطائے الٰہی سے تصرف عطا

ہوتا ہے۔

پس یہ مقامِ برزخ اور اہلِ برزخ کی حقیقت ہے کہ یہاں عبد ربّ کی صفات سے متصف اور ربّ عبد کی صفات سے متصف ہے۔ عبد کے روپ میں ربّ ظاہر ہے اور ربّ کا روپ عبد نے اختیار کیا ہے۔ اس مقام پر نہ عبد عبد رہا نہ ربّ ربّ۔ بلکہ یہ مقام عبدہٗ ہے۔ ''انسانِ کامل'' میں سیّد عبدالکریم بن ابراہیم الجیلیؒ فرماتے ہیں ''فی نفسہٖ وہ ایک ذات ہے جس کی دو جہتیں ہیں ایک سفل (نیچے) کی جانب اور دوسری اوپر کی جانب۔ اور بیان کرنے میں ہر جہت کے لیے ذات، اوصاف اور فعل جدا جدا ہیں۔ اگر تو ایک کہے تو بھی سچ ہے اور اگر تو دو کہے تو وہ دو بھی ہیں۔ یا اگر تو کہے کہ نہیں بلکہ وہ تو مثلث (تین) ہے تو تو نے سچ بولا، یہ ہے حقیقتِ انسان۔ اس کی احدیت پر نظر ڈال کہ وہ (اللہ) اس کی ذات ہے اور بول اُٹھ کہ وہ اپنی شانِ احدیت میں واحد و یکتا ہے اور اگر تو دو ذاتیں دیکھے تو بہ سبب اس کے عبد و ربّ ہونے کے تو کہہ دے گا کہ وہ دو ہیں اور جب تو حقیقت پر یعنی اس چیز پر جس کو میں نے دو ضدوں (عبد اور ربّ) میں جمع کیا، سرسری نظر ڈالے گا تو تُو حیران رہ جائے گا، نہ اس کے سفل کو عالی اور نہ اس کی بلندی کو سفل کہہ سکے گا بلکہ اس کی حقیقت کے لیے جس کی ذات کے حقائق کو دو وصف (عبد کے وصف بھی اور ربّ کے وصف بھی) لاحق ہوئے ہیں ایک تیسرا نام مقرر کر اور وہ تیسری ذات وہ ہے جس کا عالمِ علوی کی جہت سے ''احمد'' نام ہے اور عالمِ سفلی کی جہت سے ''محمد''۔ ربّ ہونے کی جہت سے وہ اسم عزیز و ہدیٰ سے تعریف کیا جاتا ہے''۔ (انسانِ کامل)

گذشتہ صفحات میں بنائے جانے والے دائرے میں مقامِ برزخ یعنی مقامِ انسانِ کامل کو ظاہر کرنے والی درمیانی لکیر اس تمام حقیقت کو بڑی خوبی سے بیان کرتی ہے کہ اس کا تعلق عالمِ علوی (اوپر والے حصے یعنی حقیقت و اوصافِ ربوبیت) سے بھی ہے اور عالمِ سفلی (نیچے والے حصے یعنی حقیقت و اوصافِ عبد) سے بھی ہے اور پھر اس اوپر اور نیچے کے تعلق کے علاوہ اس کا اپنا ایک ذاتی وجود بھی ہے جو اِن دونوں کا جامع بھی ہے اور ایک ایسا عجیب وجود ہے جو مکمل ربّ بھی

ہے اور مکمل عبد بھی ہے۔ جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی حقیقت بیان کی کہ ''انا احمد بلا میم'' اور فرمایا کہ ''من رأنی فقد رائی الحق'' یعنی جس نے مجھے دیکھا اس نے ربّ کو دیکھا۔ پس اس کی حقیقت کو سمجھنا فہم وعقل سے بالاتر ہے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ''میری حقیقت سے میرے ربّ کے سوا کوئی واقف نہیں''۔

اس عجیب وغریب مقام کو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ مقامِ عماء فرمارہے ہیں۔ حدیث شریف میں مذکور ہے کہ ابی زرین عقیلی رضی اللہ عنہٗ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے عرض کی کہ ''این کان ربنا قبل ان یخلق الخلق قال کان فی العماء ما فوقه هوا و ماتحته هوا'' یعنی ہمارا ربّ پیدائشِ خلق سے پہلے کہاں تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ''ابرِ رقیق (عماء) میں تھا اور اس کے اوپر اور نیچے ہوا تھی''۔ یہ مقام عماء بھی مقام انسانِ کامل کی طرح عجیب اور فہم وعقل سے بالا ہے۔ اسی کے متعلق سلطان العارفین حضرت سخی سلطان باھُو رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ''اس ذات پاک کو سمجھنے کے لیے عقل کے ہزاروں ہزار قافلے سنگسار ہو گئے مگر اس کی ماہیت کو سمجھ نہ پائے'' (رسالہ روحی شریف) اور اسی مقام کے متعلق فرمایا گیا کہ تَفَكَّرُوْا فِي الْاٰيَاتِ وَلَا تَفَكَّرُوْا فِي الذَّاتِ ''اس کی ذات میں تفکر نہ کرو بلکہ اس کی نشانیوں پر غور کرو''۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ نے طوالت اور اس خوف سے کہ لوگ اس کے حقائق کو سمجھ ہی نہ پائیں گے اور اپنی کم فہمی کے سبب توحید کے منکر ہو جائیں گے، اس مقام کے اسرار کو بیان نہیں فرمایا۔ اسی غرض کو سامنے رکھتے ہوئے ہم بھی اس کے بیان سے گریز کریں گے۔

☆☆☆☆☆☆

فَثَبَتَ عَلٰى مَا قَرَّرْنَا اَنَّ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ جَامِعَةٌ لِّجَمِيْعِ الْمَرَاتِبِ وَالْعَوَالِمِ الَّتِيْ هِيَ الْكُتُبُ وَجَمِيْعُ الْمَرَاتِبِ وَالْعَوَالِمِ فِيْهَا مُنْدَرَجَةٌ وَلِذٰلِكَ سُمِّيَتْ بِاُمِّ الْكِتَابِ وَ اَمَّا الْبِسْمِلَةُ الْمَوْسُوْمَةُ

بِاُمِّ الْاُمِّ فَهِيَ اَيْضًا عَلٰى قِسْمَيْنِ قِسْمٌ مِنْهَا مَا يَتَعَلَّقُ بِالذَّاتِ وَ هُوَ الْبِسْمُ وَقِسْمٌ۔ يَتَعَلَّقُ بِالصِّفَاتِ وَهُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ وَقِسْمٌ وَمَا بَيْنَهُمَا فَهُوَ جَامِعٌ لِلْقِسْمَيْنِ وَمُقَابِلُهُمَا وَهُوَ فِيْهِ جَمْعٌ وَهُوَ اللهُ وَاِنْ شِئْتَ اَنْ تَرْسِمَ عَلَيْهَا دَائِرَةً فَارْسِمْهَا وَاجْعَلْهَا قَابَ قَوْسَيْنِ بِخَطٍّ مَّارٍّ فِيْ وَسْطِهَا فَثَبِّتِ الْبِسْمَ فِي الْقَوْسِ الْاَيْمَنِ وَالرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ فِي الْقَوْسِ الْاَيْسَرِ وَاللهُ فِي الْبَرْزَخِ لِاَنَّهٗ اِسْمٌ لِلذَّاتِ الْمَوْصُوْفَةِ بِجَمِيْعِ الْاَسْمَآءِ وَالصِّفَاتِ فَهُوَ بَرْزَخٌ مِنْ حَيْثُ جَمْعِيَّتِهٖ لِلْقِسْمَيْنِ وَهِيَ هٰذَا۔

ترجمہ: پس ثابت ہوا اس تقریر سے جو ہم بیان کر چکے ہیں کہ فاتحہ ان تمام مراتب اور عوالم کی کتاب جامع ہے جو کتاب (کتابِ حیات) میں ہیں اور تمام مراتب اور عوالم فاتحہ میں داخل (جمع) ہیں اسی واسطے اس کا نام اُم الکتاب ہے۔ لیکن بسم اللہ جس کو اُمّ الاُم کہتے ہیں، دو قسم پر منقسم ہے ایک قسم ذات کے متعلق ہے اور وہ 'بسم' ہے اور دوسری قسم صفات کے متعلق ہے وہ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ہے اور ایک قسم جو ان دو کے درمیان ہے وہ جامع ہے ان دو قسموں کی اور مقابل ہے ان دونوں کے اور یہ دونوں قسمیں اس کے بیچ جامع ہیں اور وہ اللہ ہے۔ اور اگر تو چاہے کہ اس (تقسیم کو واضح کرنے کے لیے) دائرہ کھینچے (جیسا کہ سورۃ فاتحہ کی تقسیم کی وضاحت کے لیے بنایا گیا ہے) تو اس کو قاب قوسین (کی صورت) بنا بسبب اس خط کے جو اس کے وسط میں سے گزرنے والا ہے۔ پس ''بسم'' کو داہنے قوس میں اور رحمٰن اور رحیم کو بائیں قوس میں ثابت کر اور اللہ کو برزخ میں ثابت کر اس لیے کہ اللہ اس ذات کا اسم ہے جو تمام اسماء اور صفات سے موصوف ہے اور وہ تمام قسموں کے اس میں جمع ہونے کے اعتبار سے برزخ ہے اور وہ دائرہ یہ ہے:
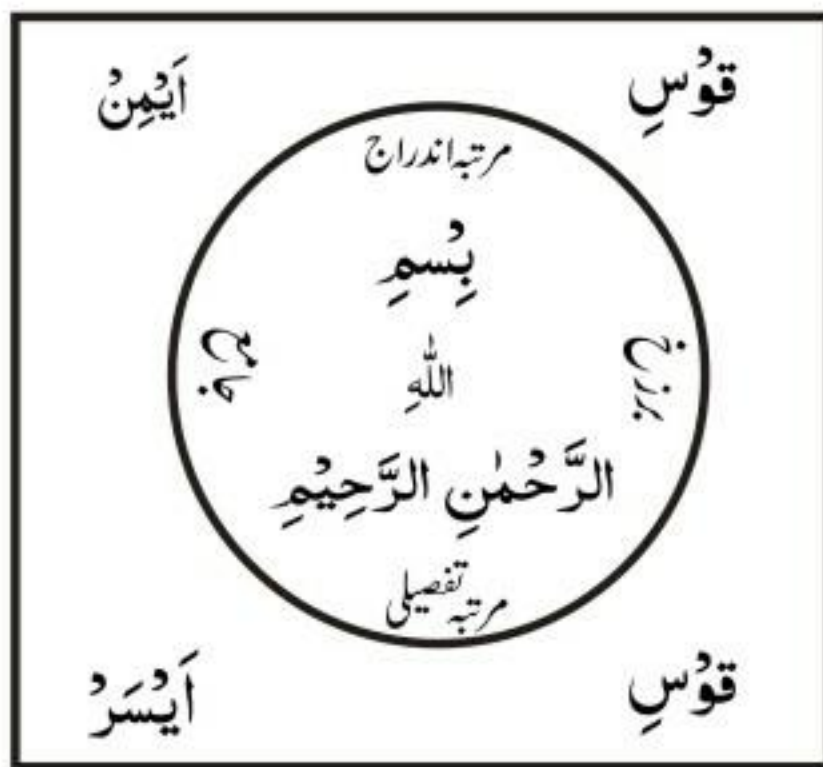
شرح: مرآۃ العارفین کی تمام تر شرح میں یہ بات دلائل کے ساتھ ثابت کر دی گئی کہ قرآن کی ابتدا سورۃ فاتحہ کی طرح وجود کی سورۃ فاتحہ ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے۔ اس سورۃ فاتحہ میں تمام تر قرآن بھی جمع ہے اور ذاتِ حق تعالیٰ اور ذاتِ انسان کی تمام تر تفصیل بھی جمع ہے۔ اللہ کے اسماء و صفات اور اس کی ذات کے ظہور کے تمام مراتب کی تفصیل، حقائقِ کونیہ اور حقائقِ الٰہیہ کے تمام اسرار و رموز، عالمِ لاہوت، جبروت، ملکوت و ناسوت کے تمام حقائق کی تفصیل غرضیکہ ''حیات'' کی عظیم کتاب اپنے تمام مراتب و عوالم سمیت اسی سورۃ فاتحہ میں جمع بھی ہے اور اسی کے بطن سے اپنا ظہور اور تفصیل پاتی ہے۔ پس خواہ قرآن کی سورۃ فاتحہ ہو یا وجود کی، ہر لحاظ سے سورۃ فاتحہ اُم الکتاب ہے۔

مرآۃ العارفین کے آغاز میں ہی حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ فرماتے ہیں کہ ''تمام قرآن سورۃ فاتحہ میں جمع ہے اور تمام فاتحہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' میں جمع ہے'' تو یوں بسم اللہ الرحمن الرحیم اُم الکتاب سورۃ فاتحہ کے لیے اُمّ الام یعنی ماں کی ماں ہے۔ سورۃ فاتحہ کی طرح بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی دو قسموں میں تقسیم کی گئی ہے اور ان دو قسموں کو جوڑنے والی ایک برزخ ان دونوں کے درمیان ہے۔ ان دو قسموں کو دو قوسوں کی صورت میں تقسیم کیا گیا ہے اور پھر ان دو قوسوں کو ملا کر دائرے کی صورت دے دی گئی ہے۔ دو قوسوں کے ملنے کے لیے عربی میں قاب

قوسین کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ عرب کے رواج کے مطابق دو قبیلے جب آپس میں دوستی کرتے تھے تو ایک رسم ادا کرتے تھے جس میں دو کمانیں ملا کر چلائی جاتی تھیں جس سے یہ اشارہ دینا مقصود ہوتا تھا کہ اب ہم ایک ہیں، ایک کا دشمن دوسرے کا دشمن اور ایک کا دوست دوسرے کا دوست متصور ہوگا۔ اسی رسم کو قاب قوسین کہا جاتا تھا۔ شبِ معراج جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام قربِ الٰہی کے آخری انتہائی مقام پر تھے تو اس قربت اور یکجائی کے اظہار کے لیے اللہ تعالیٰ نے سورۃ النجم میں قاب قوسین کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اور حقیقتاً یہ وہ مقام ہے جب انسانِ کامل میں ذاتِ حق تعالیٰ مع اپنے تمام اسماء وصفات کے مکمل طور پر سما بھی جاتی ہے اور ظاہر بھی ہو جاتی ہے۔ دونوں میں دوئی کی کوئی گنجائش نہیں رہتی ہے۔ ایک کو پکارو تو دراصل دوسرے کو پکارا جا رہا ہے اور دوسرے کی بات کرو تو حقیقتاً وہ پہلے کی بات ہے۔ یہاں نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نورِ الٰہی یعنی اپنی اصل کی طرف لوٹ گیا ہے جہاں سے اس کا آغاز ہوا تھا اور ساتھ ساتھ اپنی عبدیت کو بھی قائم رکھتے ہوئے ایک برزخ کی صورت اختیار کر گیا ہے جس کی ایک جہت عبودیت ہے دوسری ربوبیت اور یوں انسانِ کامل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام واسطہ اور وسیلہ بن گئے اللہ اور بندوں کے درمیان تعلق کو جوڑنے والا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی اسی کاملیت کو دو قوسوں کے ملاپ کے ذریعے ظاہر کرتی ہے۔ ایک قوس جسے قوسِ ایمن یا داہنی قوس کہا گیا ہے ''بسم'' یعنی اللہ کے اسماء کے لیے ہے۔ دوسری قوس صفاتِ الٰہیہ الرحمٰن الرحیم کے لیے ہے جن سے اشارہ تمام صفات کی طرف ہے اور یہ اسماء وصفات جمع ہو گئے مقامِ برزخ یعنی انسانِ کامل میں جسے اس دائرے میں ''اللہ'' کے نام اور ذات سے موسوم کیا گیا ہے جیسا کہ علامہ ابنِ عربی رحمتہ اللہ علیہ فصوص الحکم میں فرماتے ہیں ''پس کامل اکمل اور مکمل وہ شخص ہے جو عالمِ اجسام سے ترقی کر کے مرتبہ احدیت میں پہنچ جائے اور تمام صفاتِ الٰہیہ سے متصف اور موصوف ہو جائے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ ''اللہ کے اخلاق (صفات) سے متصف ہو جاؤ''۔ صفاتِ الٰہیہ بعض جلالیہ ہیں اور بعض جمالیہ ہیں۔ عارفِ کامل دونوں کا مظہر ہے مگر در حقیقت یہ کمال اس ذات کو حاصل ہے جس کا نام اللہ

ہے۔ یہ ذات کا وہ اسم ہے جو جمیع اسماء وصفات کا جامع ہے۔ مخلوقات میں اسم اَللّٰہُ کا اطلاق صرف اور صرف جناب سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر صادق آتا ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ تعالیٰ کے لیے مرآتِ تامہ (مکمل آئینہ) اور مجلیٰ اعظم ہیں'' (فصوص الحکم والایقان)

سیّد عبدالکریم الجیلی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''جب حق اپنے کسی بندہ پر بہ حیثیت اپنے اسم اَللّٰہُ کے متجلی ہوتا ہے تو بندہ اپنے نفس سے فانی ہو جاتا ہے اور اللہ اس میں اس کے لیے اس کا نفس ہو جاتا ہے اور اس کی صورت وہیکل محدثات کی غلامی سے آزاد ہو جاتی ہے اور قیدِ اکوان سے وہ آزاد ہو جاتا ہے۔ پھر وہ احدی الذات، واحدی الصفات ہے۔ نہ باپوں کو جانتا ہے نہ ماؤں کو۔ جس نے اللہ کا ذکر کیا اس نے اُس کا ذکر کیا جس نے اللہ کو دیکھا اس نے اُس کو دیکھا''۔ (انسانِ کامل)

✿ پھر اس کو کہا جاتا ہے تو میرا حبیب ہے تو میرا محبوب ہے تو میری مراد ہے۔ بندوں میں میرا منہ (چہرہ اور زبان) ہے۔ تو مقصدِ اسنیٰ اور مطلبِ اعلیٰ ہے۔ اسرار میں تو میرا سِرّ ہے۔ انوار میں تو میرا نور ہے۔ تو میرا عین تو میری زینت، تو میرا جمال تو میرا کمال ہے، تو میرا اسم تو میری ذات تو میری نعت تو میری صفات ہے۔ میں تیرے اسم میں تیری رسم میں تیری علامت میں تیری نشانی ہوں''۔ (انسانِ کامل۔ ناشر نفیس اکیڈمی)

یہ تمام جہان، خواہ ظاہری ہو یا باطنی اللہ کے اسماء وصفات کا اظہار ہے۔ ہر شے اللہ کے کسی نہ کسی اسم اور صفت کی مظہر ہے اور انسانِ کامل اللہ کی ہر صفت اور ہر اسم کا مظہر ہے چنانچہ اسم اللہ کا اطلاق اس پر واجب وجائز ہے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم 'بسم' یعنی اسمائے الٰہیہ، 'الرحمن الرحیم' یعنی صفاتِ الٰہیہ اور دونوں کے درمیان 'اللّٰہ' یعنی ذات کا احاطہ کرتی ہے پس ذات، صفات، حیات مراتب وعوالم کا احاطہ کرتی ہے پس اُم الام ہے۔ یہی ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' مخلوقات کی بھی تین حصوں میں تقسیم کو ظاہر کرتی ہے جیسا کہ سورۃ فاتحہ کی تین حصوں میں تقسیم بھی مخلوقات کی تقسیم کو ظاہر کرتی ہے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے مندرجہ بالا دائرہ میں پہلی قوس یعنی 'بسم' کی قوس مخلوق کے اس حصے کو ظاہر کرتی ہے جو اللہ کو صرف اس کے اسم سے

جانتے ہیں یعنی ان کا علم اللہ کے متعلق صرف اس حد تک ہے کہ کوئی ذات ہے، جس کا اسم اللہ ہے جو اس کائنات کو پیدا کرنے والی اور چلانے والی ہے۔ دوسری قوس ان لوگوں کی ہے جو اللہ کو اسکی صفات سے پہچانتے ہیں اور کائنات کی ہر شے میں اس کی صفات کو جاری وساری دیکھتے ہیں۔ ان قوسوں کو جس مقام پر جوڑا جا رہا ہے یعنی مقامِ برزخ جسے 'اللہ' سے ظاہر کیا گیا ہے، بندوں میں سے ان خاص الخاص لوگوں کو ظاہر کرتی ہے جو ذاتِ حق تعالیٰ کو جانتے پہچانتے ہیں اور جو اس ہستی کی معرفت حاصل کر چکے ہیں جس پر اسم اللہ کا اطلاق ہوتا ہے۔ بندوں کی اسی طریق پر تقسیم بہترین ہے کیونکہ اسی کی بنا پر آخرت میں ان کے مقامات طے ہوں گے ورنہ دنیا میں دولت یا رنگ ونسل وغیرہ کی بنیاد پر کی گئی تقسیم تو عارضی ہے۔

☆☆☆☆☆☆

وَاعْلَمْ اَنَّ الْبِسْمِلَةَ مُشْتَمِلَةٌ عَلٰی ثَلَاثَةِ اَسْمَآءٍ وَهِیَ اللّٰهُ وَالرَّحْمٰنُ وَالرَّحِیْمُ وَبَرْزَخٌ جَامِعٌ فَاَمَّا اللّٰهُ فَهُوَ مُشْتَمِلٌ عَلٰی جَمِیْعِ الْاَسْمَآءِ وَالصِّفَاتِ الْفَاعِلَةِ وَالْقَابِلَةِ وَالْحَقِیْقَةِ الْمُسْتَعِدَّةِ لِلْفَاعِلَةِ وَالْقَابِلَةِ فَارْسِمْ فِیْهَا دَائِرَةً اُخْرٰی كَمَا قُلْتُ وَاثْبِتْ الْفَاعِلَةَ فِی الْاَیْمَنِ وَالْقَابِلَةِ فِی الْاَیْسَرِ وَالْحَقِیْقَةِ الْمُسْتَعِدَّةَ لَهُمَا فِی الْبَرْزَخِ كَمَا تَرٰی فَاشْهَدْ هٰكَذَا دَائِرَةُ اللّٰهِ۔

ترجمہ: اور جاننا چاہیے کہ بسم اللہ تین اسمائے الٰہیہ اللہ، رحمن اور رحیم پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ ایک برزخ جامع 'اللہ' ہے جس میں شامل ہیں تمام اسماء اور صفاتِ فاعلہ اور قابلہ، اور شامل ہے وہ حقیقت جو قوت رکھنے والی ہے صفاتِ فاعلہ اور قابلہ کے لیے۔ پس کھینچ ایک دائرہ جس طرح میں نے کہا یعنی دو قوس بنا اور ثابت کر (لکھ) فاعلہ کو دائیں طرف اور قابلہ کو بائیں طرف اور حقیقت کو ان دونوں کے بیچ برزخ بنا جو قوت دینے والی ہے (ان دونوں کو)۔ پس بنا اس

دائرہ کو اس طرح:

شرح: جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ کائنات کی ہر شے اللہ کے کسی نہ کسی خاص اسم اور صفت کی مظہر ہے۔ اللہ کی ذات اپنے تمام اسماء و صفات سمیت ہر شے کے باطن میں موجود ہے اور اس کی حیات اور قوت کا باعث ہے۔ ظاہری اجسام کو قائم رکھنے والی ذات وہی ذات ہے جو حیٌّ قیوم ہے۔ اگرچہ یہ ذات مکمل طور پر مع اسماء و صفات ہر شے کے باطن میں موجود ہے لیکن ہر شے سے صرف ایک اسم ظاہر ہوتا ہے اور وہی اسم اس کا ربّ ہے۔ صرف انسانِ کامل وہ ہستی ہے جس کا ظاہر و باطن ایک ہی ہے یعنی اس کے باطن میں موجود ذاتِ حق تعالیٰ کامل طور پر اس میں ظاہر بھی ہے اسی لیے بارگاہِ الٰہی سے اسے ربّ الارباب کا لقب حاصل ہے۔

حق تعالیٰ کی وہ صفات جو ہر شے کو حیات، سماعت، بصارت، کلام، علم، ارادہ اور قدرت عطا کرتی ہیں اور جن کی بدولت وہ ہر عمل اور فعل سر انجام دیتا ہے صفاتِ فاعلہ کہلاتی ہیں۔ یہ صفات ہر مخلوقِ الٰہی کے لیے عام ہیں۔ جبکہ وہ خاص صفاتِ الٰہیہ جو کسی مخلوق کو کسی خاص قابلیت کے لحاظ سے دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہیں صفاتِ قابلہ کہلاتی ہیں مثلاً کسی شخص میں رحم کی صفات دوسری تمام صفات پر حاوی ہیں کسی میں قہر کی صفات غالب ہیں۔ ہر شخص اپنی باطنی استعداد اور

قابلیت کے مطابق ان صفات کو اپنی ذات سے ظاہر کرتا ہے۔ جبکہ حکمِ الٰہی ہے کہ تخلقو با اخلاق اللّٰہ ترجمہ: اللہ کی (تمام) صفات سے متصف ہو جاؤ۔ اللہ کی تمام صفات سے اپنی قابلیت و استعداد اور فضلِ الٰہی کی بدولت متصف ہو جانے والا انسانِ کامل ہے جس کا باطنی مقام ربوبیت ہے اور اس کا ظاہر عبودیت ہے۔ صرف اسی کی ذات میں ربوبیت اور عبودیت جمع ہے اور اسی کی ذات میں تمام صفاتِ فاعلہ و قابلہ مجتمع ہیں۔ اس کے سوا کسی کی ذات میں ربوبیت و عبودیت جمع نہیں۔ عبد صرف عبد ہے اور ربّ صرف ربّ ہے اور اسی لحاظ سے مندرجہ بالا دائرہ کھینچا گیا ہے جس میں ربوبیت کی قوس علیحدہ ہے اور عبودیت کی قوس علیحدہ ہے اور درمیان میں برزخ انسانِ کامل ہے جو عبودیت اور ربوبیت کا جامع ہے۔ صفاتِ فاعلہ کو ربوبیت کی قوس میں اس لیے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ صفات ہر شے میں ذاتِ حق تعالیٰ کی موجودگی کی وجہ سے اس میں ظاہر ہوتی ہیں اور یہ اپنی تخلیق کردہ ہر شے کو عطا کرنا اللہ تعالیٰ نے خود پر واجب کر لیا ہے اسی لیے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ نے انہیں "صفاتِ فاعلہ وجوبیہ مظاہر اللہ" لکھا یعنی اللہ تعالیٰ کی وہ صفاتِ فاعلہ جو تمام مظاہرِ الٰہیہ (مخلوقات) کے لیے واجب ہیں۔ صفاتِ قابلہ کو عبودیت کی قوس میں اس لیے رکھا کیونکہ ان صفات سے بندے اپنی عبودیت کی بنا پر متصف ہوتے ہیں اور یہ ہر مخلوق اور ہر بندے کو عطا کرنا اللہ پر واجب نہیں ہے بلکہ صرف ان بندوں کے لیے ممکن ہے جو اللہ کی عطا کردہ استعداد اور قابلیت کو اسی کی صفات سے متصف ہونے کے لیے استعمال کرتے ہیں اسی لیے ان کے لیے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ نے "صفاتِ قابلہ امکانیہ مظاہر اللہ" کی اصطلاح استعمال کی۔ حضرت ابراہیم الجیلی رحمتہ اللہ علیہ عبودیت کی تعریف اور عبادت اور عبودیت کے فرق کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "عبودیت اللہ تعالیٰ کے ساتھ مرتبہ الٰہیہ سے حضرتِ خلقیہ کی طرف بندہ کا رجوع کرنا ہے اور یہ مقام اس (بندہ) کے لیے جمیع مقامات کو نگاہ رکھنے والا ہے۔ اور عبادت اور عبودیت میں فرق یہ ہے کہ عبادت اس چیز کا نام ہے کہ بندہ طلبِ جزا کے لیے اعمالِ خیر کو بجا لائے اور عبودیت یہ ہے کہ اعمالِ خیر محض اللہ کے لیے بجا لائے جائیں۔ ان میں جزا

حاصل کرنے کی کوئی خواہش نہ ہو بلکہ عمل خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور عبودیت اللہ تعالیٰ کے ساتھ عمل کرنے سے مراد ہے اسی لیے مقامِ عبودیت جمیع مقامات کا محافظ ہے''۔ (انسانِ کامل)

چونکہ انسانِ کامل عبودیت و ربوبیت میں کامل ہونے کے ساتھ ساتھ صفاتِ فاعلہ اور صفاتِ قابلہ میں بھی کامل ہے لہٰذا وہ قوت وقدرت میں بھی کامل واکمل ہے اور اپنی اسی کاملیت کی بنا پر وہ ہر شے کو صفاتِ فاعلہ وقابلہ کی قوت فراہم کرنے والا ہے، وہی ہر شے کی حیات، سماعت، بصارت، قدرت، ارادہ، علم اور کلام کی حقیقی قوت ہے۔ ہر شے میں وہی حقیقتِ مستعد[1] ہے یعنی اس کی قوت ہر شے کی قوت کا باعث ہے، اس کی حیات سے ہر شے کی حیات ہے، اس کی قوتِ کلام ہر شے میں متکلم ہے۔ غرضیکہ وہی ہر شے اور تمام کائنات کی روحِ رواں ہے جیسا کہ شبِ معراج جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کائنات اور عالمِ ناسوت سے نکل کر لاہوت لامکان کی طرف عازمِ سفر ہوئے تو تمام کائنات یک دم بے حس وحرکت ہو گئی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہی قوتِ حیات وسمع وبصر وغیرہ کی بدولت ہر شے کی حیات وسمع وبصر وغیرہ تھی۔ انسانِ کامل ربّ تعالیٰ سے صفاتِ فاعلہ وقابلہ کی قوت حاصل کر کے اسے مخلوقات تک پہنچانے والا وسیلہ اور ذریعہ ہے لہٰذا اسے برزخ قرار دے کر قوسِ عبودیت وقوسِ ربوبیت کے درمیان رکھا گیا۔

☆☆☆☆☆☆

وَاَمَّا الرَّحْمٰنُ فَهُوَ اسْمٌ لِلْحَقِّ بِاِعْتِبَارِ اِنْبِسَاطِ الْوُجُوْدِ عَلَى الْاَعْيَانِ وَالرَّحِيْمُ اِسْمٌ لَّهٗ بِاعْتِبَارِ اخْتِصَاصِهٖ مِنْ كُلِّ عَيْنٍ بِحِصَّةٍ مِّنْ حِصَصِ الْوُجُوْدِ فَالْحَقُّ بِنَفْسِهٖ الرَّحْمَةُ الْاِمْتِنَانِيَّةُ الْعَامَّةُ الْمَخْصُوْصَةُ بِالرَّحْمٰنِ وَالْوُجُوْدِيَّةُ الْخَاصَّةُ الْمُتَّصِلَةُ بِالرَّحِيْمِ يُرِيْدُ ظُهُوْرَ الْمَرْحُوْمِ لِيَظْهَرَ بِهٖ سِرُّ رَحْمَةِ الرَّحْمَانِيَّةِ وَ بِاَعْمَالِ الْمَرْحُوْمِيْنَ

---

[1] ہوشیار۔ فاعل۔ Active

عِنْدَ اِعْطَآءِ جَزَآئِهِمْ رَحِيمِيَّةٍ فَوَقَعَتْ نِسْبَةُ الرَّحْمَةِ بَيْنَ الْمُنْتَسِبِيْنَ وَهُوَ الرَّحْمٰنُ وَالرَّحِيْمُ وَالْمَرْحُوْمُ فَافْهَمْ فَاِذَا فَهِمْتَ فَارْسِمْ دَآئِرَةً لِاسْمِ الرَّحْمٰنِ فَافْعَلْ فِيْهَا مَا فَعَلْتَ فِيْ غَيْرِهَا وَاَثْبِتِ الْاِسْمَ فِي الْقَوْسِ الْاَيْمَنِ وَكُلِّيَاتِ الْمَرَاتِبِ فِي الْاَيْسَرِ لِاَنَّ رَحْمَةَ الرَّحْمٰنِ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ وَكُلُّ مَنْ وَّسِعَتْهُ الرَّحْمَةُ فَهُوَ مَرْحُوْمٌ وَاَثْبِتِ الرَّحْمَةَ فِي الْبَرْزَخِ كَمَا تَرَاهُ دَآئِرَةُ الرَّحْمٰنِ۔

ترجمہ: اور لیکن رحمٰن اللہ تعالیٰ کا وہ اسم ہے جو اپنی فراخی اور وسعت کے اعتبار سے تمام مخلوقات کے لیے ہے اور رحیم اس کا اسم ہے جو مختص ہے ہر ایک شخص کے لیے اس اعتبار سے کہ وہ وجود کے حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔ پس اللہ کی ذات رحمتِ عامہ ہے جو (ہر خاص و عام پر) احسان کرنے والی ہے۔ (یہ رحمتِ عامہ مخصوص ہے) اسم رحمٰن کے ساتھ اور (وہ رحمت جو) وجود یہ خاصہ کے لیے مخصوص ہے، جڑی ہوئی ہے اسم رحیم کے ساتھ۔ (اللہ تعالیٰ) ارادہ کرتا ہے مرحوم[1] کو ظاہر کرنے کا تا کہ اس کے سبب سے اللہ کی رحمانیت کا راز ظاہر ہو اور ان مرحومین کے اعمال کی جزا دیتے وقت اللہ کی رحیمیت ظاہر ہو۔ پس اللہ کی رحمت تین نسبتوں میں واقع ہے اور وہ رحمٰن، رحیم اور مرحوم ہے پس اس کو سمجھو۔ سو جب سمجھا تو نے اس کو تو ایک دائرہ اسم رحمٰن کا کھینچ اور اسی طرح کر جس طرح تو نے دوسرے دائروں میں کیا ہے یعنی دو قوس بنا اور اسم رحمٰن کو لکھ دائیں قوس میں اور مراتبِ کلیہ کو لکھ بائیں قوس میں اس لیے کہ رحمتِ رحمٰن ہر شے کو محیط ہے اور جس پر رحمت محیط ہے وہ مرحوم ہے اور رحمت کو برزخ میں لکھ جیسا کہ تو دیکھتا ہے دائرہ رحمٰن کو:۔

---

[1] جس پر رحمت کی جائے یعنی مخلوق
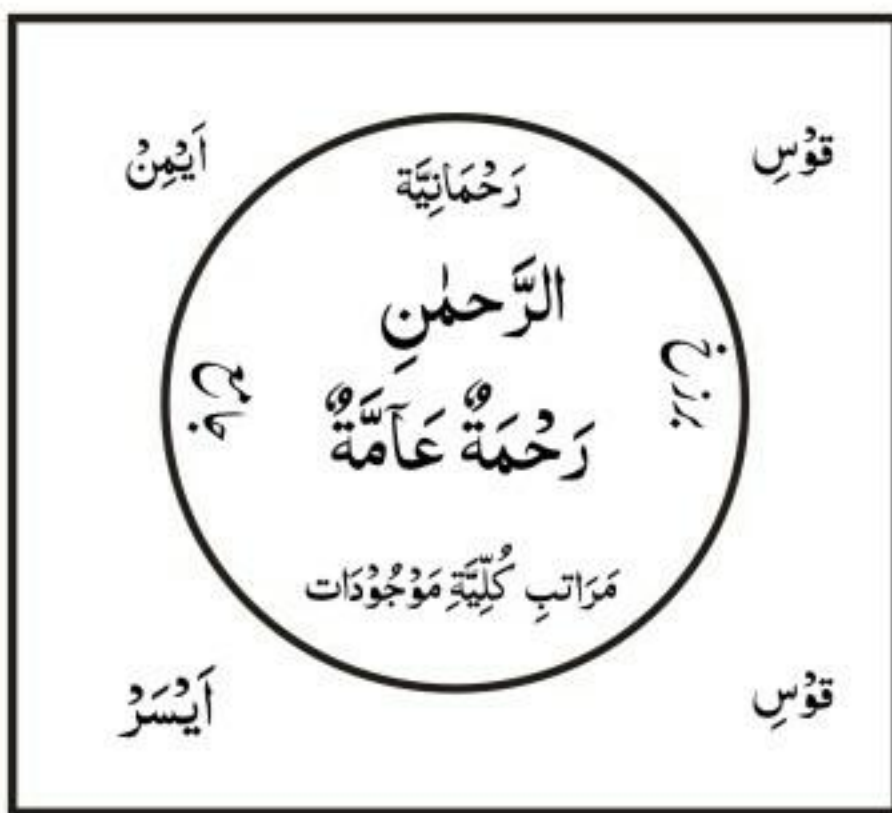
شرح: اللہ کا اسم رحمٰن اللہ کے تمام اسماء وصفات پر محیط ہے حتیٰ کہ اللہ کی صفتِ جبار وقہار بھی اس کی رحمانیت کی ہی ایک صورت ہے کیونکہ وہ اپنے جبر وقہر کو بھی اپنے بندے کی بھلائی اور بہتری اور اسے سیدھے راستے کے لیے استعمال کرتا ہے لہٰذا اس پر رحمت ہی کرتا ہے۔ اَللّٰہُ تو ذاتِ حق تعالیٰ کا ذاتی اسم ہے لیکن صفاتی اسماء میں سے اللہ کی ذات کو مکمل بیان کرنے والا اللہ کا اسم وصفتِ رحمٰن ہی ہے۔ چنانچہ اپنی فراخی اور وسعت کے اعتبار سے اسم رحمٰن ہر صفاتی اسم پر محیط ہے اور اس اعتبار سے بھی اسمِ رحمٰن ہر شے کو محیط ہے کیونکہ اللہ اسی اسم کی تجلی سے ہر شے کو اپنی رحمت وکرم سے نوازتا ہے اور کائنات کی کوئی بھی شے کسی بھی وقت اسم رحمٰن کی تجلی سے باہر نہیں ہے جبکہ دیگر اسماء وصفات کی تجلیات مخصوص اشیاء اور مخصوص اوقات کے لیے ہیں۔ سیدّ ابراہیم الجیلی رحمتہ اللہ علیہ اسمِ رحمٰن کی دیگر اسماء پر عظمت ووسعت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اور صفاتِ الٰہیہ میں اصل وصف اس کا اسم رحمٰن ہے اس لیے کہ وہ شمولیت واحاطہ میں اسم اَللّٰہُ کے مقابل ہے اور فرق ان دونوں کے درمیان یہ ہے کہ ''رحمٰن'' اپنی جامعیت اور عمومیت کے اعتبار سے ذاتِ حق تعالیٰ کی وصفیت کا مظہر ہے اور ''اَللّٰہُ'' مظہر ہے اِسمیت کا۔ جان کہ رحمٰن وجود کی بلند رتبہ ذات کے لیے اسمِ علم ہے'' (انسانِ کامل)

نظریہ وحدت الوجود جو مرآۃ العارفین کی بنیاد ہے، کے مطابق ہر شے، ہر موجود میں ذاتِ حق تعالیٰ

ہی اصل وجود ہے اوراس کی ظاہری صورت فانی اور بے حقیقت ہے۔ چنانچہ ہر شے میں ذاتِ حق تعالیٰ اپنے اسم رحمٰن کی صفت کے تحت موجود ہے اوراسی صفت کے تحت وہ اس شے کووجود عطا کرتا ہے، کائنات میں مقام عطا کرتا ہے اوراس کی ہرضرورت پوری کرتا ہے، اس طرح ہر موجود کا تعلق اللہ تعالیٰ سے اس کے اسم رحمٰن کے تحت ہی جڑتا ہے۔ پس یہ اسم ہراسم پر غالب ہے۔ اس کے تحت جاری رحمتِ عامہ برزخ ہے یعنی تعلق واسطہ اور وسیلہ ہے اللہ اور کُل موجودات میں تعلق جوڑنے کا جیسا کہ مندرجہ بالا دائرہ میں اللہ کی رحمانیت کی صفت کواوپر والی قوس میں دکھایا گیا۔ کُل موجودات کو نیچے والی قوس میں اور اسم رحمٰن کی تجلّی سے ظاہر ہونے والی رحمتِ عامہ کو دونوں کے درمیان برزخ کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ رحمتِ عامہ سے مراد بھی انسانِ کامل یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں جنہیں اللہ نے خود رحمت العالمین کا نام دیا اور آپ ہی برزخ ہیں اللہ اور مخلوق کے درمیان اسی لیے رحمتِ عامہ کواس دائرے میں درمیان میں رکھا گیا۔ اللہ نے کُل موجودات کوظاہر ہی اس لیے کیا تا کہ ان کے وجود کے ذریعے اللہ کی رحمانیت کی صفت ظاہر ہو۔ یہ تمام موجودات ''مرحوم'' ہیں یعنی وہ اشیاء جن پر رحم کیا جائے۔ اس کائنات میں ذاتِ حق تعالیٰ کا اظہار تین نسبتوں یا تین صورتوں میں ہے۔ اس کی رحمانیت جوتمام مخلوق کے لیے رحمتِ عامہ ہے، اس کی رحیمیت جو مومنین کے لیے خاص ہے جس کے ذریعے وہ نیک بندوں کے اعمال کی جزا دیتا ہے اور مرحومین یعنی وہ تمام موجودات جن پر رحمانیت اور رحیمیت کی تجلّی کی جاتی ہے۔ ان مرحومین میں بھی حق تعالیٰ ہی بصورتِ رحمٰن اور رحیم ظاہر ہوتا ہے۔ رحمانیت رحیمیت سے زیادہ فراخ اور وسیع ہے کیونکہ کُل موجودات کے لیے ہے۔

☆☆☆☆☆☆

وَفُعِلَ فِی الرَّحِیْمِ مَا فُعِلَتْ فِی الرَّحْمٰنِ اِلَّا اَنَّ رَحْمَۃَ الرَّحِیْمِ رَحْمَۃٌ وُجُوْدِیَّۃٌ مُتَعَلِّقَۃٌ بِالْعَمَلِ فَمَرْحُوْمُھَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ

الصّٰلِحٰتِ فَاَثْبِتِ اسْمَ الرَّحِیْمِ فِی الْاَیْمَنِ وَاسْمِ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الْاَیْسَرِ وَالرَّحْمَۃِ فِی الْبَرْزَخِ کَمَا تَرَاہُ۔

ترجمہ: اور اسم رحیم کے لیے بھی اسی طرح کر جس طرح تو نے دائرہ رحمٰن میں کیا ہے مگر فرق یہ ہے کہ اسمِ رحیم سے جاری رحمت رحمتِ وجودیہ ہے جو اعمالِ صالحہ کے متعلق ہے پس رحمتِ رحیمیہ کے لیے مرحوم صرف مومن ہیں جو اعمالِ صالحہ پر مداومت کرتے ہیں۔ پس اسمِ رحیم کو دائیں قوس میں لکھ اور مومنین کا اسم بائیں قوس میں لکھ اور رحمت کو بیچ برزخ لکھ جیسا کہ تو دیکھتا ہے دائرہ (رحیمیہ) کو۔

قوسِ   اَیمن

رَحِیمِیَّہ

برزخ   اَلرَّحِیْمِ   برزخ

رحمت وَجُوْدِیَّہ

کلیات مَراتب طبقہ مومنین

قوسِ   اَیسَر
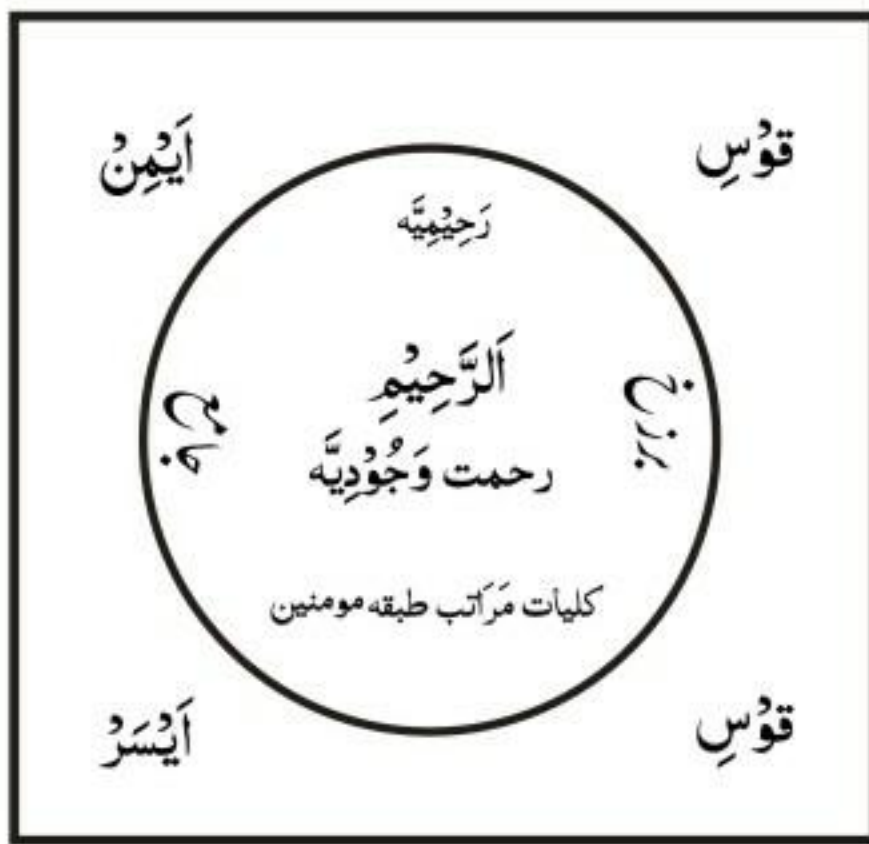
شرح: سیّد ابراہیم الجیلی رحمتہ اللہ علیہ اسمِ رحمٰن اور اسمِ رحیم سے جاری رحمتِ الٰہیہ کے فرق کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں "جان کہ رحیم اور رحمٰن دو اسم ہیں جو رحمت سے مشتق ہیں لیکن رحمٰن اَعَم (عام) اور رحیم اخص واُتم ہے۔ رحمٰن کا عموم اس جہت سے ہے کہ خدا تعالیٰ کا نام رحمٰن اس رحمت کے لحاظ سے ہے جو جمیع موجودات کو شامل ہے اور رحیم کا خصوص اس جہت سے کہ اس کا نام رحیم اس رحمت کے لحاظ سے ہے جو صرف اہلِ سعادت کے لیے مخصوص ہے۔ رحمتِ رحمٰن قسمت یعنی

عذاب میں بھی پائی جاتی ہے مثلاً ناگوار مزہ اور بو کی دوا کا پینا۔ اگرچہ وہ مریض کے حق میں رحمت ہے لیکن طبع کو ناگوار گزرتی ہے اور رحمتِ رحیم محض نعمت ہے اس میں اور کوئی ملاوٹ نہیں اور اہلِ سعادت کاملہ کے سوا اور کسی میں نہیں پائی جاتی۔ اسمِ رحیم کے تحت میں جو رحمت ہے ان میں سے ایک رحمت اللہ کی اپنے اسماء وصفات پر رحمت ہے جس کے ذریعے اللہ نے ان اسماء وصفات کے آثار اور اثرات کو ظاہر فرمایا۔ پس رحیم رحمٰن میں یوں موجود ہے جس طرح وجودِ انسانی میں آنکھ موجود ہے کہ آنکھ (اسمِ رحیم کی طرح) بہت عزیز اور خاص تر ہے اور وجودِ انسان (اسم رحمٰن کی طرح) سب کو شامل ہے۔ اسی جہت سے کہا گیا ہے کہ رحمتِ رحیم عالمِ آخرت میں پورے طور پر ظاہر ہوگی۔ اس لیے کہ وہ دنیا سے زیادہ وسیع ہے (جس طرح آنکھ کی پہنچ جسم کی پہنچ سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جس حد تک اور جس تیزی سے آنکھ کسی مقام پر پہنچ سکتی ہے اس سرعت سے جسم نہیں پہنچ سکتا) اور نیز اس جہت سے بھی کہ دنیاوی نعمتیں شائبہ کدورت سے خالی نہیں ہیں جن کا منبع وسرچشمہ رحمانیت ہوسکتی ہے نہ کہ رحیمیت''۔ (انسانِ کامل)

اللہ کے اسمِ رحیم سے جاری رحمت صرف مومنین کے لیے مخصوص ہے۔ اللہ کا ایک اسم ''مومن'' بھی ہے اسی لحاظ سے اللہ کے اسم رحیم کی رحمت اللہ کی ذات پر بھی جاری وساری ہے اور اسی اسم کی تجلی سے اللہ کے دیگر اسماء وصفات کے آثار واثرات ظاہر ہوتے ہیں اور اسی اسم کے تحت اللہ اپنے خاص بندوں سے اپنا خاص تعلق جوڑتا ہے اور انہیں ان کے اعمال کی جزا اس اسم کی خصوصی تجلیات کے ذریعے دیتا ہے۔ اس لحاظ سے اسمِ رحیم برزخ ہے یا تعلق اور وسیلہ ہے اللہ اور اس کے خاص بندوں یعنی مومنین کے درمیان۔

☆☆☆☆☆☆

وَ بِهٰذَا الْاِعْتِبَارِ حُكْمُ الْاُصُوْلِ يَسْرِيْ فِي الْفُرُوْعِ. فَلِكُلِّ حَرْفٍ مِّنْ حُرُوْفِ الْبَسْمَلَةِ وَالْفَاتِحَةِ وَلِكُلِّ سُوْرَةٍ اِجْمَالًا وَّلِاٰيَاتِهَا وَكَلِمَاتِهَا وَحُرُوْفِهَا تَفْصِيْلًا دَآئِرَةٌ مُّقَوَّسَةٌ بِقُوْسَيْنِ وَبَرْزَخٌ

جَامِعٌ بَيْنَهُمَا وَذٰلِكَ لَا يَسَعُ فِيْ هٰذَا الْمُخْتَصَرِ وَلَا فِيْ جَمِيْعِ الْعَوَالِمِ (كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى) قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝ فَاكْتَفَيْنَا عَلٰى مَا رَقَمْنَا وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ وَهُوَ حَسْبُنَا وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ اَوَّلِ كُلِّ شَيْءٍ وَاَوْسَطِ كُلِّ شَيْءٍ وَّاٰخِرِ كُلِّ شَيْءٍ كَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى وَعَلٰى اٰلِهٖ وَعِتْرَتِهٖ وَاَحْفَادِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَعَشِيْرَتِهٖ مِنَ الْاَنْبِيَآءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ وَالْاَوْلِيَآءِ الصَّالِحِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

ترجمہ: اور یہی حکمِ اصول جاری ہوتا ہے فروع (دیگر اسمائے صفات) کے لیے۔ پس واسطے ہر ایک حرف کے حروف بسملہ اور فاتحہ (کی طرح اصول) ہیں اور واسطے ہر سورۃ کے اجمال کی رو سے اور واسطے تمام سورتوں کے کلمات اور آیات اور حروف کے لیے تفصیل کی رو سے ایک دائرہ بنایا گیا ہے دو قوسوں کی مدد سے اور ان دو قوسوں کے درمیان ایک برزخ جامع ہے۔ اور (اسمائے الٰہیہ کی تفصیل) نہیں سما سکتی اس مختصر (رسالے) میں بلکہ تمام عوالم میں (بھی) نہیں سما سکتی جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''کہہ دیجیے اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر تمام دریا سیاہی بن جائیں اللہ کے کلمات کے لیے تو ان تمام دریاؤں کی سیاہی ختم ہو جائے گی لیکن میرے ربّ کے کلمات ختم نہ ہوں گے گو ہم اس کی مثل اور مدد کو لے آئیں''۔ ہم اس پر اکتفا کرتے ہیں جو ہم لکھ چکے ہیں اور اللہ فرماتا ہے ''اور وہی ہدایت دیتا ہے سیدھے راستے کی اور وہی کافی ہے ہم کو خوب کارساز''۔

اے اللہ درود بھیج ہمارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کہ وہ اوّل ہر چیز کا ہیں اور اوسط ہر چیز کا ہیں اور آخر ہر

چیز کا ہیں جیسا کہ پسند ہو تجھ کو اور تو راضی ہو جا ان پر اور ان کی آل اور اولاد پر اور ان کے اصحاب پر اور انبیاء ومرسلین واولیاء صالحین پر ساتھ اپنی رحمت کے اور تو سب پر رحم اور رحمت کرنے والا ہے۔

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

شرح: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ نے اللہ کے اسماء ربّ، رحمٰن اور رحیم کے مخلوقاتِ عامہ اور مومنین خاصہ کے ساتھ تعلق کو دائروں کی مدد سے واضح فرما دیا اور دیگر تمام اسماء وصفات کے لیے بھی یہی اصول طے کر دیا کہ اوپر والی قوس میں اسمِ الٰہی اور نیچے والی قوس میں اس اسم سے فیض حاصل کرنے والے اور اس اسم کی صفت کو اپنا لینے والے گروہِ مخلوق کا نام اور درمیان میں برزخ یا تعلق واسطہ اور وسیلہ بنایا اس اسم وصفت کے آثار وتجلیات کو جو انسانِ کامل کے توسط سے مخلوق تک پہنچتی ہیں کیونکہ اللہ کے اسماء وصفات کی تجلیات کو بلا کسی واسطہ اور وسیلہ کے برداشت کرنا مخلوق کے لیے ممکن نہیں ہے۔ انہی دائروں کی مدد سے اللہ کے ہر اسم کا مخلوق سے تعلق سمجھا جا سکتا ہے۔ واضح ہو کہ ہر موجود کے لیے اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے اور وہ شے اسی اسم کی مظہر ہے اور اسی اسم کی صفات اس سے ظاہر ہوتی ہیں اور وہی اسم اس کا ربّ ہے۔ اسمائے الٰہیہ لامحدود ہیں چنانچہ ان اسماء کے لیے لامحدود دائرے کھینچے جا سکتے ہیں جن کو ان مختصر الفاظ، اوراق اور وقت میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور سورۃ فاتحہ کی طرح قرآن کے تمام حروف و کلمات اور سورتوں کے لیے بھی دائرے بنائے جا سکتے ہیں جن کی مدد سے ان حروف وکلمات و سورتوں میں پوشیدہ حقائقِ الٰہیہ، حقائقِ کونیہ اور حقائقِ برزخ کو بیان کیا جا سکتا ہے کہ کن الفاظ کا تعلق حقائقِ کونیہ یعنی مخلوقات کے حقائق سے ہے اور کن کا حقائقِ الٰہیہ سے ہے اور کن کا انسانِ کامل کی ذات یعنی برزخ سے ہے اور یہ تینوں کس طرح آپس میں مربوط ومنسلک ہیں اور کس طرح اپنی اپنی ذاتی حیثیت میں جداگانہ اہمیت بھی رکھتے ہیں لیکن یہ تمام تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تمام دریا سیاہی بن جائیں اور تمام درختوں کی قلمیں بنالی جائیں تو بھی اللہ کی بات ختم نہ ہو اگرچہ ان جیسے اور مدد کو لے آئیں۔ پس تمام حقائقِ الٰہیہ وکونیہ کا بیان ممکن نہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''تمہیں نہیں دیا گیا علم مگر تھوڑا'' یعنی بندے کا علم اگرچہ اس کی اپنی ذات کی حقیقت کی رو سے بہت ہے لیکن اللہ کے علم کے مقابلے میں اس کے علم کی وہی حیثیت ہے جو قطرے کی سمندر کے مقابلے میں ہے۔ اللہ نے اپنے علم کی لامحدود صورتیں بنائیں اور اس کو مخلوق میں اپنے اسماء کی تجلیات کے ذریعے تقسیم کر دیا۔ پس اللہ کا علم تمام مخلوق کے علم کو محیط بھی ہے اور اس تمام علم سے کئی گنا زیادہ بھی ہے اور اس علم کا سب سے بڑا حصہ انسانِ کامل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس ہے جنہیں شدید قوت والے ربّ نے خود علم سکھایا اور ان کی محبوبیت کے صدقے اپنا کوئی علم ان سے پوشیدہ نہ رکھا۔ مخلوق کو جو بھی علم ملا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے علم سے ہی ملا۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام، آپ کے اہلِ بیتؓ، اولادؓ، اصحابؓ، تمام انبیاء مرسلین اور اولیاء مقربین پر درود وسلام بھیجتے ہوئے اس عاجزی کے اظہار کے ساتھ مرآۃ العارفین کا اختتام کرتے ہیں کہ اللہ اور اس کی ذات کے علم کو مکمل بیان کرنا ناممکن ہے۔

☆☆☆☆☆☆

مرشد محترم خادم سلطان الفقر سلطان محمد نجیب الرحمٰن مدظلہ الاقدس کی خصوصی توجہ اور باطنی مہربانی سے یہ شرح مرآۃ العارفین لکھی گئی جو عرصہ ایک سال (دسمبر 2010ء سے دسمبر 2011ء) میں مکمل ہوئی۔ ماہنامہ سلطان الفقر لاہور سے یہ شرح مسلسل ہر ماہ شائع ہوتی رہی (سوائے فروری 2011ء، ماہ ربیع الاول کے جو کہ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا خصوصی ایڈیشن تھا)۔

نسخہ جات

اس شرح کے لیے مرآۃ العارفین کے تین نسخوں سے استفادہ کیا گیا جن کے متن اور عبارت میں کہیں کوئی تضاد یا فرق نہیں پایا گیا۔ اِن نسخوں کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

1) مِرآۃ العارفین۔ از تصنیفِ لطیف سیّد العارفین سبط رسول سیّد الشہدا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ۔ جس کو اللہ والوں کی قومی دُکان (رجسٹرڈ) ملک چنن الدین خلف الرّشید ملک فضل الدین

تاجر قومی کتب نے تعلیمی پریس لاہور میں باہتمام ملک نور الٰہی طبع کرا کے شائع کیا۔ (فقط متن اور ترجمہ)۔ سالِ اشاعت درج نہیں ہے۔ قیمت آٹھ آنہ درج ہے۔

2) مِرقاۃُ السالکین شرحِ مرآۃ العارفین از شیخ الحدیث محمد فیض احمد اویسی بہاولپوری۔ زاویہ پبلیشرز۔ دربار مارکیٹ لاہور (متن، ترجمہ اور شرح)۔ سالِ اشاعت 2007ء

3) کنزالعارفین مِن مرآت العارفین از میاں خادم حسین صوفی۔ ناشر سنّی پبلیشرز اردو بازار لاہور۔ (متن، ترجمہ اور شرح)۔ سالِ اشاعت درج نہیں لیکن کتاب کے آخر میں مترجم نے اختتامِ ترجمہ کی تاریخ 8 جمادی الثانی 1393ھ مطابق 9 جولائی 1973ء تحریر فرمائی ہے۔

کروڑوں درود وسلام اللہ کے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ان کے اہلِ بیت رضی اللہ عنہم، آل اولاد اور اصحاب کرام رضی اللہ عنہم پر اور بے حد وحساب شکرانہ ان تمام مقربینِ الٰہی کے لیے جن کی خصوصی مہربانیاں اس عاجزہ کے ہمیشہ شاملِ حال رہیں، جن کے بغیر یہ عاجزہ ایک بھی لفظ لکھنے کے قابل نہ تھی۔ اللہ ان سب کے مراتب بے حساب بلند کرے خصوصاً حضرت امام حسین رضی اللہ عنہٗ کے جنہوں نے اپنے علمِ الٰہی کے بے پایاں سمندر سے مرآۃ العارفین کا یہ بیش بہا خزانہ اُمتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صراطِ مستقیم پر رہنمائی کے لیے عطا کیا۔

یہ خادمہ اپنی اس عاجزانہ کاوش کو اپنے مہربان مرشد سلطان محمد نجیب الرحمٰن مدظلہ الاقدس کے نام کرتی ہے جنہوں نے مجھے اس اہم کام کی ادائیگی کے لیے منتخب فرمایا اور ہر قدم پر خصوصی ظاہری و باطنی رہنمائی فرمائی۔ اللہ ان کے مراتب بے حد وحساب بلند کرے اور انہیں ان کے مشن میں سرخرو کرے (آمین)۔

استفادہ کتب

شرح مرآۃ العارفین کے لیے قرآنِ حکیم فرقانِ مجید اور مستند کتبِ احادیث کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا:

1) نہج البلاغہ۔ خطباتِ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم۔ ترجمہ: مفتی محمد وسیم اکرم القادری۔ آر۔ آر پرنٹرز لاہور

2) شرح فصوص الحکم والایقان۔ شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربی رحمتہ اللہ علیہ۔ ترجمہ وشرح محمد ریاض قادری، علم و عرفان پبلشرز۔ 34 اردو بازار لاہور

3) شجرۃ الکون۔ شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربی رحمتہ اللہ علیہ۔ مترجم: علامہ صوفی محمد صدیق بیگ۔ ناشر علی برادران تاجران کتب فیصل آباد

4) انسانِ کامل۔ سیّد عبدالکریم بن ابراہیم الجیلی رحمتہ اللہ علیہ۔ نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی

5) کیمیائے سعادت۔ حجتہ الاسلام امام ابوحامد محمد الغزالی رحمتہ اللہ علیہ۔ ناشر مشتاق بک کارنر الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور

6) کشف المحجوب۔ حضرت داتا گنج بخش سیّد علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ۔ اسلامی کتب خانہ اردو بازار لاہور

7) رسالۃ الغوثیہ۔ مترجم غلام دستگیر القادری۔ ناشاد پبلیشرز رائل پارک لاہور

8) سرّ الاسرار۔ غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ۔ ترجمہ: محمد عبدالاحد قادری۔ قادری رضوی کتب خانہ لاہور

9) فتوح الغیب۔ ایضاً 10) الفتح الربانی۔ ایضاً

11) نور الہدیٰ۔ تصنیف لطیف سلطان العارفین حضرت سخی سلطان باھو رحمتہ اللہ علیہ۔ ترجمہ سید امیر خان نیازی مرحوم۔ العارفین پبلیکیشنز لاہور

12) عین الفقر۔ ایضاً 13) کلید التوحید۔ ایضاً 14) محک الفقر۔ ایضاً

15) شمس العارفین۔ ایضاً

16) رسالہ روحی شریف۔ تصنیفِ لطیف حضرت سخی سلطان باھو رحمتہ اللہ علیہ۔ مترجم سلطان محمد نجیب الرحمٰن مدظلہ الاقدس۔ سلطان الفقر پبلیکیشنز لاہور

17) سلطان الوھم۔ تصنیفِ لطیف حضرت سخی سلطان باھو رحمتہ اللہ علیہ۔ مترجم حماد الرحمٰن سروری قادری۔ سلطان الفقر پبلیکیشنز لاہور۔

18) اسرارِ حقیقی۔ حضرت معین الدین چشتی اجمیری رحمتہ اللہ علیہ۔ اکبر بک سیلرز۔ زبیدہ سینٹر لاہور

19) شمس الفقرا۔ تصنیفِ لطیف حضرت سلطان محمد نجیب الرحمٰن مدظلہ الاقدس۔ سلطان الفقر پبلیکیشنز لاہور

20) فتاویٰ رضویہ۔ امام احمد رضا بریلوی رحمتہ اللہ علیہ

21) سرِّ دلبراں از حضرت شاہ سیّد محمد ذوقی رحمتہ اللہ علیہ۔ ناشر پرائم پرنٹرز کراچی

تعارف

حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ (حضرت امام زین العابدینؓ) نے اپنے والد محترم امام عالی مقام حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے اُم الکتاب سورۃ فاتحہ کی شرح دریافت فرمائی تو آپ رضی اللہ عنہ نے "مرآۃ العارفین" کے نام سے زیرِ نظر تصنیف تحریر فرمائی جو کہ وحدت الوجود پر اولین تصنیفِ مبارکہ ہے جس میں امام عالی مقام حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے پہلی بار وحدت الوجود اور اُم الکتاب انسانِ کامل کی اصطلاح بیان فرمائی اور انسانِ کامل کی شان واضح فرمائی۔

خادم سلطان الفقر حضرت سخی سلطان محمد نجیب الرحمٰن مدظلہ الاقدس کے حکم و اجازت پر عنبرین مغیث سروری قادری نے اصل عربی متن مع اردو ترجمہ اور جامع و آسان شرح تحریر فرمائی ہے جو "علمِ حسینؓ شرح مرآۃ العارفین" کے نام سے ماہنامہ سلطان الفقر کے صفحات کی زینت بنتی رہی۔ اب کتابی صورت میں قارئین کے لیے علمِ معرفت کا لافانی تحفہ۔

سُلطانُ الفقر پبلیکیشنز (رجسٹرڈ) لاہور

سُلطانُ الفقر ہاؤس

4/A- ایکسٹینشن ایجوکیشن ٹاؤن وحدت روڈ ڈاکخانہ منصورہ لاہور۔ پوسٹل کوڈ 54790

Tel: 042-35436600, 0322-4722766

ISBN: 978-969-9795-01-5

E-mail:sultanulfaqr@tehreekdawatefaqr.com